حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جلد — ۱۰

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ [۱۲۰] ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو پاکیزگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ

بانی و مدیر: دارالعلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب — فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب — متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب — متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

قرآن وسنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

- جملہ حقوق .... بحق ناشر محفوظ ہیں
- طبع جدید .... اکتوبر 2011ء
- تعداد 1100
- ناشر .... بیت السلام

نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی۔فون 021-32711878
موبائل 0321-3817119 ای میل baitussalam_pk@yahoo.com

نبی اُمّی علیہ السلام

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَـرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَـدُ اَنَّ سَیِّـدَنَـا وَسَنَـدَنَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُـوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ ﴿ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ ①

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

تمہید...... بزرگانِ محترم! آپ اس مقدس مجلس میں سیرت سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور سیرت کس کی؟ میری یا آپ کی نہیں یا مطلقاً انسان کی نہیں..... بلکہ عالم بشریت کے سردار اور آقائے دو جہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "سیرت پاک" سننے کے لئے تشریف لائے ہیں۔

حضور علیہ السلام کی سیرت ظاہر ہے کہ آپ نبوت کی حیثیت سے سننا چاہتے ہیں یعنی حضور علیہ السلام میں ایک حیثیت بشر اور انسان ہونے کی ہے اور ایک حیثیت پیغمبر اور رسول ہونے کی ہے، آپ محض انسانی سیرت سننے کے لئے نہیں آئے بلکہ "پیغمبرانہ سیرت" سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ گویا نبوت کی سیرت آپ کا مقصد ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نبوت کی سیرت اس کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی کہ کچھ تھوڑا بہت نبوت کا مفہوم آپ کے سامنے آجائے۔ جب آپ نبوت کو کسی حد تک سمجھ لیں گے تو پھر نبوت کی سیرت خود بخود سامنے آجائے گی۔ اسی بناء پر میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔

موضوع تقریر...... اس میں حق تعالیٰ شانہ، نے پہلے حضور علیہ السلام کی نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کے بعد "نبوت کی دلیل" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد "اجزائے نبوت" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد "مقاصد نبوت" بیان کئے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے کچھ اجزاء ہوں گے۔ ایک دعویٰ نبوت، ایک نبوت کی دلیل، ایک نبوت کا تجزیہ کہ اس کے اجزا کیا کیا ہیں اور کن کن چیزوں پر نبوت مشتمل ہے۔ نبوت کی حقیقت

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

کیا ہے؟۔ اور پھر نبوت کے دنیا میں آنے کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟۔ یہی چند اجزا ہیں جو اس وقت تقریر کا موضوع ہیں۔ اور یہی موضوع اس آیت کا بھی ہے۔ تو تقریر درحقیقت اس آیت کی توضیح اور اس کی تشریح ہوگی، آیت بہت سے علوم پر مشتمل ہے اور ہم جیسوں کا کام نہیں کہ ان علوم اور ان معارف کو بیان کر دیں یا بیان کا حق ادا کر دیں۔ لیکن بالاجمال تھوڑا تھوڑا ان تمام موضوعات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

دعوئ نبوت اور دلیلِ نبوت...... پہلی بات دعوئ نبوت ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے خود دعویٰ کیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا﴾ ① اللہ ''وہ ذات ہے جس نے اُمّیوں میں رسول بھیجا۔ ان پڑھوں میں رسول بھیجا۔'' تو بعثت کا دعویٰ یہی درحقیقت دعوئ نبوت ہے۔ اللہ جس کو بھیجتا ہے وہ نبی ہوتا ہے رسول ہوتا ہے۔ یہ تو گویا ایک دعویٰ ہوا کہ ہم نے ایک رسول بھیجا لیکن رسالت کی دلیل کیا ہے؟ جو ذاتِ مقدس آئی اور جس کے لئے اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اپنا رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول ہوں: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ ② اے انسانو! خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں، کسی قوم کے فرد ہوں آج کے ہوں یا آئندہ قیامت تک کے ہوں۔ میں ان سب کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تو اللہ نے بھی دعویٰ کیا کہ میں رسول بھیج رہا ہوں اور رسول نے بھی دعویٰ کیا کہ میں اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں۔

اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت تسلیم کی جائے؟ وہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ: اُمّیوں میں اُمّی رسول آیا یعنی ان پڑھوں میں ایسا رسول بھیجا جو پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ یہ ان پڑھ ہونا درحقیقت نبوت کی دلیل ہے۔ آپ سوال کریں گے کہ ان پڑھ ہونا تو بظاہر عیب کی بات ہے۔ اگر ہم کسی پڑھے لکھے کو یوں کہہ دیں کہ تم ان پڑھ ہو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تو وہ اپنی توہین محسوس کرے گا ان پڑھ ہونا یا بے پڑھا لکھا ہونا بظاہر تو کوئی کمال کی چیز نہیں ہے، عرفِ عام میں اسے حقیر سمجھا جاتا ہے، عیب سمجھا جاتا ہے اور یہاں اتنے بڑے منصب کے لئے یہ دلیل بیان کی جا رہی ہے کہ جس منصب سے بڑھ کر دنیا میں کوئی منصب نہیں ہے۔ آخر اس دعویٰ میں اور دلیل میں ربط کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پڑھ ہیں اور عالم میں سب سے زیادہ بڑے ہیں؟ تو میں کہتا ہوں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے پڑھا لکھا ہونا ہی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ عالم بشریت میں اونچے اور سارے انسانوں میں مقدس ترین انسان ہیں۔ اس لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم سیکھنے کے لئے نہیں آتے سکھلانے کے لئے آتے ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی استاد نہیں ہوتا۔ وہ براہِ راست اللہ سے علم حاصل کرتے ہیں اور مخلوق کو دیتے ہیں۔

تو پیغمبر کسی کے شاگرد نہیں ہوتے۔ صرف حق تعالیٰ ان کے استاذ ہوتے ہیں۔ پھر وہ دنیا کو اپنا شاگرد بناتے ہیں اور تلمیذ بناتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے کے لئے آتے ہیں، علم لینے کے لئے نہیں آتے۔

---

① پارہ: ۲۸ سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ② پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۸۔

نبوّت انسانیت کے لئے ذریعۂ علم...... اسی واسطے کوئی بھی علم ایسا نہیں ہے جس کی بنیادیں پیغمبروں نے قائم نہ کی ہوں۔ یعنی آخرت کا علم ہو معاد کا علم ہو، مبدا کا علم ہو، معاشیات کا ہو، اقتصادیات کا ہو، عمرانیات کا ہو، غرض کوئی بھی علم ہو سب کی بنیادیں انبیاء علیہم السلام نے قائم کی ہیں۔ پہلے تو میں اپنے ذہن میں ایک دلیل سمجھا کرتا تھا کہ شاید میرا مفہوم ہو اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں سب انسانوں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا﴾ ① "اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حال میں کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے۔" تو انسان دنیا میں بے علم آتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی علم لے کر نہیں آتا۔ جاہل پیدا ہوتا ہے۔ ﴿لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا﴾ عربیت کے قاعدے کے مطابق یہاں نکرہ نفی کے نیچے آ رہا ہے، جس کے معنی عموم کے ہوتے ہیں کہ ذرہ برابر بھی انسان علم نہیں رکھتا، جب آتا ہے تو ایک مضغہ گوشت ہوتا ہے نہ اس میں شعور ہے نہ عقل نہ علم ہے صرف حس ہے۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں: ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا﴾ ② پھر ہم تمہیں ایک ایسی عمر کی طرف لوٹاتے ہیں جو ارذل ترین عمر ہے کہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود پھر تم بے پڑھے لکھے ہو جاتے ہو، علم کے باوجود پھر بے علم بن جاتے ہو"۔

جب انسان انتہائی بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے تو آج قوت حافظہ رخصت ہو گئی تو پہلا علم ختم ہو گیا۔ حواس میں خلل آ گیا تو جدید علم آنے کی صورت نہ رہی کہ نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے تو پچھلا سرمایہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور آئندہ کے آنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ تو جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ گویا اعلان کرتے ہیں کہ جب تم آئے تھے تو اس وقت بھی عالم نہیں تھے اور جب جا رہے ہو تو جب بھی نہیں۔ تو علم تمہارا ذاتی نہیں، اگر تمہارا ہوتا تو ماں کے پیٹ سے آتا اور قبر کے پیٹ تک ساتھ جاتا۔ علم ہمارا ہے، جتنے زمانے تک ہم چاہتے ہیں تمہارے اندر ڈال دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں نکال لیتے ہیں۔ تو کسی انسان کی ذات میں علم نہیں ہے۔ تو جب سارے انسان ایسے ہی فرض کر لئے جائیں تو عالم انسانیت میں علم نہ رہا تو سرچشمہ علم کا اللہ کی ذات نکلتی ہے۔

علوم دنیوی کا ذریعہ بھی نبوت ہے...... اس واسطے کہ انسان جانوروں سے تو علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ کم رتبہ ہیں نباتات، جمادات سے حاصل نہیں کرتا، وہ جانوروں سے بھی کم حیثیت ہیں۔ تو ماتحت اور ارذل سے علم حاصل نہیں کیا جاتا۔ افضل سے حاصل کیا جاتا ہے تو انسان کے اوپر جو افضل ذات ہے وہ تو اللہ ہی کی ذات ہے تو سوائے اس کے کہ خدا سے انسان میں علم آئے اور کوئی شکل نہیں اور خدا سے علم آنے کی صورت یہی ہے کہ کچھ مخصوص بندے ایسے ہوں جن کو براہ راست اللہ میاں اپنا علم سکھائیں۔ وہی حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ تو ہر علم لوگوں کو پیغمبروں ہی کے ذریعہ سے آ سکتا ہے۔ تو پہلے تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارا ہی مفہوم ہوگا مگر بعد میں دیکھا کہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے جلیل القدر عالم ہیں نے "ملل ونحل"

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۰۔

میں دعویٰ کیا ہے کہ ”تمام علوم معاش کے ہوں یا معاد کے۔ سب انبیاء لے کر آئے ہیں“۔

چناں چہ حضرت آدم علیہ السلام پر لغت کا علم اترا۔ فرمایا گیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① حضرت ادریس علیہ السلام پر ھندسہ اور ریاضی کا علم اترا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے صناع کا علم سکھلایا۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ: كَانَ بَعْضُ الْاَنْبِيَآءِ يَخُطُّ خَطًّا بعض انبیاء خط کشی سے خطوط سکھاتے تھے۔ یا تو لکھنا مراد ہے کہ لکھنا ان سے چلا یا خط کشی کا علم مراد ہے کہ خطوط کھینچ کر آئندہ کے بارے میں باتیں بتلانا اور قواعد سے ان کا استخراج کرنا جس کو رمل اور جفر کا علم کہتے ہیں۔ بہر حال مختلف قسم کے علوم احادیث میں آتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں اور سب کے استاذ حق تعالیٰ شانہ ہیں۔

مُعَلّمِ الانبیاء...... اس لئے قرآن میں جہاں بھی پیغمبروں کے علم کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہاں انہوں نے معلم اپنے آپ کو ظاہر کیا: حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ② ”اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ناموں کا علم سکھلا دیا“۔

حضور علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ ③ ”اے پیغمبر! اللہ ہی نے تمہیں علم دیا، تم پہلے سے نہیں جانتے تھے؟“ فرمایا گیا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ ④ ”اے پیغمبر! تمہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں۔ ایمان کیا چیز ہوتی ہے لیکن ہم نے تمہارے قلب میں نور ڈالا، جس سے تم پر یہ تمام چیزیں روشن ہو گئیں۔ تو ہم ہیں ہدایت کرنے والے“۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔ تو کہتے ہیں: ﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ ⑤ ”اے میرے پروردگار! آپ ہی نے مجھے مصر کی سلطنت عطا کی اور آپ نے ہی مجھے خواب کی تعبیر کا علم بخشا“۔ حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ ⑥ ”ہم نے خضر علیہ السلام کو علم فراست سکھلا دیا تھا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کہتے ہیں: ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ ⑦ ہمیں پرندوں کی بولیوں کا علم سکھلا دیا۔ اور یہ اللہ نے ہم کو سکھلایا۔

تو یہ تمام علوم جو انبیاء علیہم السلام میں آئے۔ ظاہر ہے کہ نہ انہوں نے کسی کالج میں تعلیم پائی نہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری ان کے ہاتھ میں تھی۔ براہ راست اللہ کی تعلیم تھی اور پیغمبر شاگرد تھے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں علم دینے اور سکھلانے کے لئے آتے ہیں۔ سیکھنے کے لئے نہیں آتے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱۔ ③ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۱۳۔

④ پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۲۔ ⑤ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۱۔

⑥ پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۶۵۔ ⑦ پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔

نبوت اور طبیعت...... انبیاء علیہم السلام کی فطرت پیدائشی طور پر منور ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت ادھر ہی چلتی ہے جدھر علم اور کمال ہو۔ نقص اور عیب کی طرف پیغمبر کی طبیعت فطرۃً نہیں چلتی۔

سیر کی روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب پانچ سال کی عمر کے ہوئے تو ان کی والدہ ماجدہ نے انہیں پڑھنے کے لئے مکتب میں بھیج دیا۔ مکتب میں جا کے شاگردوں کی لائن میں بیٹھ گئے۔ تو استاذ نے کہا کہ: کہو ''الف''۔ فرمایا: الف کے معنی کیا ہیں۔؟ استاذ نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں۔؟ فرمایا: کیا تو مہملات کی تعلیم دینے بیٹھا ہے۔ استاذ نے کہا کہ: کیا الف کے کچھ معنی ہوتے ہیں۔؟ فرمایا: معنی نہ ہوتے تو اسے شی کیوں کہتے؟ بے معنی چیز کا وجود نہیں ہوتا، جو چیزیں علم کا سرچشمہ ہیں اگر وہی علم سے تعلق نہ رکھیں تو پھر علم کہاں سے آئے گا؟ انہی حروف سے تو علم پیدا ہوتا ہے۔

استاذ بے چارہ حیران ہوا کہ یہ بچہ کہاں سے آ گیا ہے، اس نے مجھے ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ: کیا تو جانتا ہے کہ الف اور ب کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا، ہاں میں جانتا ہوں۔ پوچھا کیا معنی ہیں، فرمایا ایسے تھوڑا ہی بتلاؤں گا۔ استاذی کی جگہ چھوڑ اور شاگردی کی لائن میں آ، اور میں تیری جگہ بیٹھوں۔ اس کو اٹھایا اور اٹھا کر شاگردوں کی جگہ بٹھایا اور خود جا کر مسند پر بیٹھ گئے۔ پھر الف سے جو توحید کے مضامین اور حقائق بیان کرنے شروع کئے ہیں تو استاذ بھی حیران تھا اور مکتب والے بھی حیران تھے کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔

غرض انبیاء علیہم السلام طبعی طور پر اور فطری طور پر علم کی طرف چلتے ہیں۔ یہ ان کی طبیعت ہے۔ باوجود یہ کہ فلاسفہ یہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے۔ طبیعت میں جذبات ہوتے ہیں، شعور نہیں ہوتا، مثلاً آپ کو بھوک لگتی ہے، یہ ایک طبعی جذبہ ہے لیکن آپ دلیل سے بھوک نہیں لگاتے۔ طبیعت خود بخود ابھر آتی ہے، پیاس لگتی ہے تو دلائل سے نہیں لگتی۔ آپ یوں نہیں کہتے کہ چونکہ یہ وجہ ہے۔ لہٰذا مجھے پیاس لگنی چاہئے، بلکہ بلا دلیل پیاس لگتی ہے، اس لئے کہ طبعی جذبہ ہے۔ بلکہ اگر پیاس اور بھوک لگی ہوئی ہو اور دلائل سے ثابت کیا جائے کہ ہرگز پیاس نہیں لگ سکتی۔ تب بھی نہیں رکے گی۔ آپ جتنی چاہیں دلیلیں بیان کریں۔ وہ تو طبیعت سے ابھر رہی ہے۔ تو طبیعت جذبات کا سرچشمہ ہے۔ طبیعت سے شعور اور علم نہیں پیدا ہوتا۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بھی شعور کی طرف چلتی ہے۔ عقل تو بڑی چیز ہے، ان کی طبائع میں شعور ہوتا ہے۔ طبعی جذبات خود عاقلانہ ہوتے ہیں۔

نبوت اور بچپن کا دور...... آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کے واقعات قرآن کریم میں سیارات کے بارے میں بیان فرمائے گئے ہیں تو ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام گہوارے کے اندر لیٹے ہوئے تھے۔ اچانک ستارے طلوع ہونے شروع ہوئے۔ اب گہوارے میں لیٹا ہوا بچہ، عقل تو بڑی چیز ہے، اس کی تو طبیعت بھی پختہ نہیں ہوتی۔ مگر گہوارے میں لیٹے ہوئے جب دیکھتے ہیں کہ کچھ روشن چیزیں سامنے آئیں۔ تو طبعاً انسان روشنی کی طرف بڑھتا ہے ظلمت کی طرف نہیں جاتا۔ اسے چاندنا اور روشنی محبوب ہوتی ہے، تاریکی محبوب

نہیں ہوتی، اور طبعی طور پر یہ بھی تمام انسان جانتے ہیں کہ روشنی ظلمت سے برتر ہے۔ اس لئے اس کی طرف کشش ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے دیکھ کر فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ ① یہ پروردگار معلوم ہوتا ہے جو اتنی چمک دمک کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں رفعت و بلندی اور اونچائی بھی ہے اور روشنی بھی ہے۔ تو جس میں رفعت وعظمت اور نورانیت ہو۔ بس وہ رب ہوگا۔ تو فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ لیکن جب ستارے طلوع ہو کر بالآخر غروب ہونا شروع ہوئے تو فرمایا: ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ﴾ ڈوبنے والی چیز رب اور خدا نہیں ہوسکتی۔ جو چیز وجود پائے اور پھر وہ زائل ہو جائے، یہ شان رب کی نہیں ہے۔ اس کے بعد چاند نکلا فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ یہ رب ہوگا اس لئے کہ یہ تمام ستاروں سے بڑھ گیا ہے۔ اس ایک نے وہ روشنی کی کہ سارے ستارے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ تو فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ "یہ میرا رب ہوگا"۔ ﴿فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ﴾ ② جب وہ اپنی چمک دمک دکھا کر گم ہوگیا اور نیچا پڑ گیا اور آنکھوں سے چھپ گیا۔ تو فرمایا کہ یہ بھی میرا رب نہیں ہوسکتا۔ بس اب تو اگر میرا رب ہی مجھے ہدایت نہ دے تو معلوم نہیں میں کس کس چیز کو رب سمجھتا رہوں گا۔

اس کے بعد آفتاب نکلا جس نے پوری دنیا کو جگمگا دیا، جس رات کو لاکھوں کروڑوں ستارے مل کر زائل نہیں کر سکتے تھے کتنا ہی چاند تا کیا مگر رات ہی رہی۔ سورج کی ایک کرن نکلی اور رات غائب ہوگئی۔ اور کرن بھی ابھی نہیں نکلی، وہ تو صبح صادق ہوئی تبھی رات بھاگنی شروع ہو جاتی ہے بہرحال جب سورج نکلا تو اس کی چمک دمک دیکھ کر فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ﴾ "یہ بڑا رب معلوم ہوتا ہے"۔ ﴿فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾ ③ جب وہ بھی اپنی چمک دکھلا کر اور پورا عروج پا کے گرنے لگا اور زوال کے طرف چلا، عصر کے وقت اس کا چہرہ فق ہونے لگا۔ روشنی ماند پڑ گئی اور بالآخر منہ چھپا کے رخصت ہوا تو فرمایا: "ان تمام چیزوں کو رب ماننا درحقیقت شرک میں مبتلا ہونا ہے۔ میں ان چیزوں سے بری ہوں جن میں تم شرک کرتے ہو اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو میں اس شرک کا ساتھی نہیں"۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام گہوارے میں لیٹے ہوئے بچپن کی حالت ہے اور آسمان کے حقائق میں غور فرما رہے ہیں اور خدا کی بڑائی اور اس کے وجود پر استدلال کر رہے ہیں، اگر مفسرین کا یہ قول مان لیا جائے کہ آپ گہوارے میں ہیں اور مہد کی حالت میں ہیں تو اس سے یہ مدعا ثابت ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی طبیعت بالطبع علم کی طرف چلتی ہے وہ پالنے میں ہوتے ہیں جب بھی علم ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ مکتب میں پہنچا دیئے جائیں جب بھی علم ہی کی باتیں کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدا ہوئے ہیں تو بعض روایات میں پیدائش کی کیفیت آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس شان سے پیدا ہوئے، نگاہیں آسمان کی طرف تھیں اور شہادت کی انگلی

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷٦. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۷. ③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۸.

اٹھی ہوئی تھی۔گویا توحید کا اعلان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔گویا طبعی چیز ہے۔ لیکن طبیعت ادھر ہی چلتی ہے جو حقیقت ہے،گویا انبیاء علیہم السلام کی طبیعت حقائق کی طرف جاتی ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا۔﴿وَاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا﴾ ①
''حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بچپن تھا کہ ہم نے حکم دیا''۔یعنی علم اور معروف لدنی اور کمالات ربانی عطا کر دیے گئے حالانکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بھی بچپن تھا اس لئے بعض علماء نے تو دعویٰ کیا ہے کہ سنت اللہ سے مستثنیٰ کر کے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت بھی دے دی گئی۔بہر حال انبیاء علیہم السلام کی طبیعت پیدائشی طور پر پاک ہوتی ہے۔وہ نیکی ہی کی طرف چلتی ہے۔کبھی بدی کی طرف نہیں جاتی۔ہمیشہ خیر کی طرف اور علم و شعور کی طرف بالطبع چلتی ہے۔بہر حال پیغمبر دنیا میں آ کر کسی سے سیکھتے نہیں،کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کرتے نہ کسی مدرسہ میں جا کر پڑھتے ہیں،ان کے معلم براہ راست حق تعالیٰ شانہ ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی اوران پڑھ تھے یعنی کسی مدرسہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم نہیں پائی۔کسی استاذ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سیکھا ہی نہیں۔

خاندانی ذرائع علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ.....پھر ساتھ میں یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمّی اور بے پڑھے لکھے تھے۔لیکن پڑھنے کا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ اولاد کو تعلیم دیا کرتے ہیں۔اس واسطے کہ خود بچہ اپنے طور پر تعلیم کی طرف نہیں جاتا:

طفل بمکتب نمی رود ولے ورندش

بچہ مکتب کی طرف خود نہیں جاتا اسے زبردستی بھیجا جاتا ہے،بعض اوقات ماں باپ مار پیٹ کے بھیجتے ہیں۔ بہر حال باپ کا فرض ہوتا ہے کہ بچے کو تعلیم دلائے۔جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے باپ کو اٹھا لیا گیا کہ ہمارے پیغمبر پر یہ تہمت ہی نہ آنے پائے کہ باپ نے تعلیم دلادی ہوگی۔اس سے امیت اور زیادہ مضبوط ہوگئی کہ خود بھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتے اور جو پڑھنے لکھنے کا ذریعہ تھا،باپ۔وہ پہلے ہی اٹھالئے گئے۔

اب یہ ہوسکتا تھا کہ ماں تعلیم دلائے اور ایسا ہوسکتا ہے،جو دانش مند مائیں ہوتی ہیں،اگر باپ دنیا سے رخصت ہوجائے اور وہ باپ کے قائم مقام ہو کے تعلیم دلاتی ہیں اور بعض دفعہ بچے کی تعلیم و تربیت میں باپ سے بھی آگے بڑھ جاتی ہیں۔علماء اسلام میں ایک بڑے جلیل القدر عالم اور امام ہیں۔جن کا نام نامی امام ربیعہ ہے، سلف صالحین میں مشہور ہیں۔ربیعۃ الرائے ان کا لقب ہے۔یہ ماں کے پیٹ میں تھے کہ باپ کو اتفاق سے سفر پیش آ گیا،اس زمانے کا تجارتی سفر تھا۔آج کے وسائل سفر تو تھا نہ تھے کہ موٹر لاریوں میں بیٹھے اور پہنچ گئے۔ریلوں میں بیٹھ گئے اور ہزاروں میلوں کے سفر کی مسافت طے کرلی۔ہوائی جہاز میں بیٹھے اور ہزاروں میل گھوم لئے پڑتا تھا

① پارہ:۱۶،سورۃ مریم،الآیۃ:۱۲۔

ہی نہیں وہی اونٹوں کا سفر تھا۔ بہت زیادہ ہوئے گدھے پر سوار ہو گئے اور تیز چلے گھوڑا مل گیا۔

اس طرح سے سفر کرتے تھے۔ غرض امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو سفر پیش آیا، تجارتی سفر تھا اور سفر بھی لمبا چوڑا۔ دس برس لگ جائیں، بیس برس لگ جائیں تو خود ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد نے ربیعہ کی والدہ سے کہا کہ: مجھے سفر درپیش ہے۔ تجارت کا سفر ہے اور کئی ملکوں میں جانا ہے۔ بہت ممکن ہے مجھے دس بارہ برس لگ جائیں تو بیس ہزار روپیہ اپنی بیوی کو دیا۔ دس پندرہ برس مجھے آنے میں لگ جائیں تو اس سے اپنا خرچ چلاتی رہنا اور اس کا حساب رکھنا۔ چناں چہ یہ دے کر رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے چار پانچ ماہ بعد امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ جب ان کی چار پانچ برس کی عمر ہوئی تو ماں نے انہیں مکتب میں بٹھلا دیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے مستقل استاذ مقرر کئے اور ان کی تنخواہ مقرر کی اور رقم خرچ کرنا شروع کر دی۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت جید عالم بنے۔ حافظ بنے، محدث بنے، مفسر بنے اور فقیہ و مفتی بنے حتی کہ بارہ برس کی عمر میں فتویٰ انہیں سپرد کر دیا گیا۔ مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّكَرَامَةً) کی مسجد نبوی (عَلٰى صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفِ تَحِيَّةٍ وَّسَلَامٍ) میں ان کا درس شروع ہوا۔ بڑے بڑے جلیل القدر علماء ان کے درس میں آ کر بیٹھتے تھے۔ خود یہ لڑکے۔ ابھی ڈاڑھی بھی نہیں نکلی۔ مگر بڑے بڑے علماء ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے لگے۔ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کا شہرہ اور چرچا ہوا۔ تقریباً پندرہ برس کے بعد ان کے باپ لوٹے۔

جب گھر پہنچے تو امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ گھر میں تھے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے جوان ہو گئے تھے، قد و قامت تھا۔ باپ نے دیکھا کہ ایک اجنبی مرد میرے گھر میں گھسا ہوا ہے۔ باپ کو آیا غصہ۔ اس نے کہا کہ: تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا ہے؟ بیٹا، باپ کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے کہا: کم بخت! تو کون ہے جو میرے گھر میں گھسا ہوا چلا آ رہا ہے؟ باپ بیٹے میں سر پھٹول شروع ہوئی۔ وہ اسے کہتا کہ تو اجنبی مرد میرے گھر میں کیوں آیا ہے؟ اور بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے۔

آوازیں جو بلند ہوئیں تو ماں نے اندر سے سنا۔ جھانک کر دیکھا تو پہچان گئی کہ میرا خاوند آ گیا ہے۔ جلدی سے آ کر بیچ بچاؤ کیا اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کو اشارہ کیا کہ تم باہر چلے جاؤ اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کے باپ کے غصہ کا یہ عالم کہ بیوی پر بے اطمینانی کا اظہار کیا کہ یہ کون مرد تھا جو گھر میں گھسا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ: تم اطمینان سے بیٹھو۔ میں سب کچھ سمجھا دوں گی۔ خیر بمشکل تمام ٹھنڈا کیا مگر وہ بار بار پوچھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کون تھا؟ اور آتے ہی یہ سوال کیا کہ جو روپیہ میں دے گیا تھا۔ اس کا حساب دے۔ اس نے کہا کہ میں روپیہ لے کر بھاگ نہیں جاؤں گی۔ حساب بھی آپ سن لیں اور اس شخص کے بارے میں بھی آپ سن لیں۔ مگر آپ جلدی نہ کریں۔ کچھ دم لیں، بمشکل تمام خاوند کو ٹھنڈا کر کے کھانا وانا کھلایا۔ اور کہا کہ: آپ لباس تبدیل کریں غسل کیا، لباس تبدیل کیا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت آ گیا۔ کہا مسجد نبوی (عَلٰى صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفِ تَحِيَّةٍ وَّسَلَامٍ) میں آپ نماز پڑھ آئیں۔ اس کے بعد

آپ کو سارا حساب سمجھا دوں گی۔

یہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گئے۔ تو نماز کے بعد وہاں ربیعۃ الرائے رحمۃ اللہ علیہ کا درس شروع ہوا تو بڑے بڑے اجلہ علماء ان کے سامنے بیٹھے اور اتنا بڑا درس مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی عالم کا نہیں ہوتا تھا جتنا ربیعۃ الرائے کا ہوتا تھا۔ تو باپ بیٹھ گیا۔ انہیں کیا خبر کہ یہ میرا بیٹا ہے سنتے رہے، سنتے رہے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب درس سے اٹھے تو گھر آئے اور آ کر یہ کہا کہ: "آج میں نے ایک ایسے جلیل القدر عالم کا درس سنا ہے کہ میں نے اپنی عمر میں ایسا بڑا عالم نہیں دیکھا اور میری روح تازہ ہو گئی۔ میری تمام کدورتیں دھل گئیں میں نے تو ایسا کوئی امام نہیں دیکھا۔ بہت تعریفیں کیں"۔

بیوی نے کہا کہ آپ کے نزدیک ایک اتنا بڑا عالم کتنے روپے میں تیار ہو سکتا ہے؟ کہا کتنے روپے میں؟ اگر خزانے بھی ختم ہو جائیں تو وہ خزانہ ہلکا پڑ جائے گا اور وہ عالم بھاری ہوگا۔ پوری دنیا خرچ کر کے بھی اگر ایسا عالم بنا دیا جائے تو سستا سودا ہے۔ کہا کہ: "یہی ہے وہ آپ کا بیٹا اور تیس ہزار روپے میں نے اس کے عالم بنانے پر خرچ کئے ہیں"۔ تو بیوی کے ہاتھ چوم لئے۔ اور جب بیٹا آیا تو اس سے معافی مانگی اور بیٹا باپ سے معافی مانگ رہا ہے کہ میری گستاخی معاف کیجئے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ آپ باپ ہیں۔ باپ کہہ رہے ہیں تو عالم کا استاذ ہے تو میرا بھی استاذ ہے، اتنا بڑا عالم ہے۔

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر باپ نہ ہو مگر ماں سلیقہ مند ہو تو وہ بیٹے کو پڑھا سکتی ہے۔ ربیعۃ الرائے جیسا بیٹا پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، ماں پڑھاتی۔ لیکن ابھی چند ہی سال کے ہونے پائے تھے۔ کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ وہ سہارا بھی ختم ہو گیا جو علم کا ذریعہ بنتا۔ باپ بھی نہیں رہے، ماں بھی نہیں رہی۔ اب دادا نے اپنی کفالت میں لیا۔ مگر ظاہر ہے کہ دادا پھر ایک واسطہ ہوتا ہے جو لو اپنے باپ کو یا ماں کو لگتی ہے واسطہ کے ساتھ اتنی لو نہیں ہوتی۔ لیکن جتنی بھی لگتی ہے مگر آٹھ ہی برس کی عمر تھی کہ دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ابو طالب کے سپرد کر دیا گیا کہ آپ نگرانی اور تربیت کریں۔ ابو طالب نے عمر بھر نگرانی اور دیکھ بھال کی۔ بہر حال گھرانے میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو تعلیم دے سکتا۔

قومی ذرائع علم کے انقطاع سے امیت کا تحفظ ...... اب اگر گھر میں ماں باپ اور دادا بھی نہ ہو کوئی تعلیم دلانے والا نہ رہے لیکن ملک وقوم میں علم کا چرچا ہو، تب بھی آدمی کچھ نہ کچھ پڑھ لکھ سکتا ہے۔ وہاں ملک بھی جاہلوں کا ملک تھا، دنیا کی قوموں میں ان کا لقب ہی جہلائے عرب تھا۔ یہ بھی کوئی نہیں کہتا تھا کہ عرب کے دانش مند ہیں۔ عالم نہ کہتے تو دانش مند تو کہتے جہلائے عرب ان کا خطاب تھا اور اس زمانے کا نام زمانہ جاہلیت تھا۔ گویا اوپر سے لے کر نیچے تک قوم پر جاہلیت چھائی ہوئی تھی اگر حضور علیہ السلام کے لئے گھرانے میں کوئی مربی نہیں تھا تو ممکن تھا کہ قوم کے اندر کوئی مربی بن جاتا۔ کوئی معلم بن جاتا، تو تہمت آ جاتی کہ یہ جتنا علم ہے یہ تو قوم کا سکھلایا ہوا

کے ساتھ شخصیت لازم اور ضروری ہوتی ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول رکھا۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جب قرآن کریم خیر الکتب ہے تو اس کے ساتھ مبعوث ہونے والی شخصیت بھی لازماً خیر البشر ہوگی۔ اور اس خیر البشر شخصیت کے شاگرد بھی خیر الناس ہوں گے۔ اور وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق خیر البشر کا قرن ''خیر القرون'' ہوگا۔ ایسی خیر در خیر کے اندر قرآن مجید کا نزول ایسا خیر مطلق تھا کہ اس کے ساتھ کئی طرح کی خیریں وابستہ تھیں۔ زمانہ کی خیر، مکان کی خیر، ذاتِ اقدس کی خیر، شاگردوں کی خیر اور جب گوناگوں خیریں یکجا اور مجتمع ہوگئیں تو خیر الکتب کا نزول ہوا اور اس کے متعلق فرمایا گیا:

''خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ'' ① تم میں سے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ بہترین لوگ ہیں۔ جس کتاب کے اندر باہر، اردگرد، اوپر نیچے اور ہر سمت خیر ہی خیر ہو تو اس کے پڑھنے پڑھانے والے اس خیر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں، وہ بھی خیر بن جائیں گے۔

کلام اللہ کے ذریعے باطنِ خداوندی سے وابستگی...... اسی لئے ایک حدیث اس مضمون کی مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن سے برکت حاصل کرو، یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔ (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)۔ ② کلام آدمی کے اندر سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کلام کو تخلیق کرتا ہے، بلکہ کلام آدمی سے سرزد ہوتا ہے۔ آدمی اس کی تخلیق نہیں کرتا۔ جب کسی بولنے والے کو آپ بولتا سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: کلام اس سے صادر ہو رہا ہے، سرزد ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص کلام پیدا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام آسمان وزمین اور پوری کائنات تخلیق فرمائی۔ تمام خیرات وبرکات مخلوقِ خداوندی ہیں، مگر قرآن مجید مخلوق نہیں ہے۔ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے صادر ہوا ہے۔ اسی لئے اس کلام پاک کو پڑھ کر بندہ کا تعلق باطنِ خداوندی سے قائم ہوتا ہے۔ دیگر نعمتوں کے ذریعہ ظاہر سے وابستگی اور تعلق قائم ہوتا ہے اور کلام خداوندی کے ذریعہ باطن سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيْعًا﴾ ③ اور حدیث شریف میں حبل اللہ کی تفسیر ''اَلْقُرْآنُ حَبْلُ اللهِ'' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن اللہ کی رسی ہے، جو زمین پر اتاری گئی ہے۔ ④ اسے مجموعی طور پر مضبوطی سے تھامے رہو۔ کیونکہ یہ رسی قیامت کے دن کھینچی جائے گی، تو اس کو تھامنے والے بھی اسی کے ساتھ کھنچے آئیں گے اور جہاں قرآن پہنچے گا وہیں اس سے چمٹے رہنے والے، باطنِ حق

---

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم...... ص ۴۳۸۔

② الجامع الکبیر للسیوطی حدیث رقم: ۳۳۸۶، کنز العمال، ج: ۱ ص: ۳۲۱۔

③ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳۔

④ الصحیح لمسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل علی بن ابی طالبؓ ج: ۱۲ ص: ۱۳۴۔

سے وابستہ ہو جائیں گے۔

الفاظ وحروفِ قرآن کی جنت میں گل وگلزار سے تبدیلی...... بعض احادیث کے مضمون میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں جنت میں اتنے ہی درجے ہیں۔ قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: "وَرَتِّلْ وَارْتَقِ" ④ پڑھتا جا اور درجے چڑھتا جا۔ اب جس کو جتنا قرآن یاد ہوگا وہ اسی کے مطابق درجات تک پہنچ جائے گا۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں۔ یہاں آپ کو جو آیات، الفاظ کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ جنت میں یہی آیات باغ و بہار کی شکل میں ڈھل جائیں گی۔ چیز ایک ہی ہے۔ یہاں شکل اور ہے، جنت میں یہ شکل بدل جائے گی۔

ہمارے زمانے میں یورپ کا ایک کھلونا آتا تھا۔ پیکٹ میں غالباً ۱۲ گولیاں ہوتی تھیں۔ چار آنے میں ملتا تھا۔ بچے لاتے تھے۔ پانی کا پیالہ بھر کر گولی اس میں ڈالتے تھے تو پانی لگنے سے گولی چٹختی تھی اور وہ گولی پھیل کر کوئی انجن بن جاتی تھی، تو کوئی گھوڑا، کسی کا پھول بن گیا تو کسی کا بنگلا۔ کاریگر نے صناعی یہ کی تھی کہ کاغذ پر اس انداز میں مسالے لپیٹے تھے کہ جب وہ گولی چٹختی تھی تو مختلف شکلوں کا ظہور ہوتا تھا، شرط پانی کا لگنا تھا۔ اسی طرح شادی بیاہ میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایک چکر اسا ہوتا ہے۔ اس میں مسالہ اس انداز اور کاریگری سے لپیٹا جاتا ہے کہ جب آگ لگا کر اسے چھوڑا جاتا ہے تو اس کے شراروں سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ دیکھنے والوں کو گھوڑا اور اس پر سوار نظر آتا ہے، یا باغ کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں اور خوب داد دیتے ہیں کہ کیا صناعی اور کاریگری ہے، اور مسالہ کو کس انداز سے لپیٹا ہے کہ کبھی گھوڑا نظر آتا ہے۔ کبھی بنگلا اور کبھی کوئی پھول۔ یہ ایک عجیب صناعی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی آیات میں یہ صناعی رکھی ہے کہ وہ جب تک عالمِ آب وگل میں موجود ہیں، خزانۂ علم وعرفان ہے، پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے اور جب ان کو آخرت کا پانی لگے گا تو یہی حروف والفاظ گل وگلزار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دنیا میں جو الفاظ اپنے تلاوت کرنے والوں کے لئے سرمایۂ سکون وراحت تھے اور انہیں علم وعرفان کی دنیا کی سیر کراتے تھے، وہی الفاظ اب ان کے لئے جنت نگاہ باغ وبہار اور لعل وجواہر کی صورت میں ظاہر ہو کر آخرت کی زندگی پُر بہار اور گہوارۂ شادمانی ومسرت بنا دیں گے۔ انہیں میں سے نہریں پھوٹیں گی۔ یہی حروف حور وقصور کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ان حروف کے نقطے ہی وہاں لعل وجواہر، موتی وغیرہ کی شکل اختیار کرلیں۔ یہاں ان کی شکل آیات کی ہے، وہاں باغ وبہار میں تبدیل ہو جائیں اور نعمتوں کے روپ میں ڈھل جائیں گی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری قومیں جو اپنی کتابوں اور رسالوں پر ایمان لا کر قیامت کے بعد جس جنت میں داخلہ کی امید رکھتی ہیں، وہ جنت تو مسلمان اپنے دلوں میں یہیں دنیا میں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار کرنے

④ السنن لابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ ج: ۴ ص: ۲۴۳۔

عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ. ① ”اگلوں اور پچھلوں کے علوم بھی مجھے عطا کر دیے گئے“۔ اتنے بڑے علم کے لئے اتنی بڑی عقل کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی کارنامے ظاہر کرنے کے لئے مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یعنی ایک تو وحی الٰہی کے ذریعے پیغمبرانہ کارنامے ہیں لیکن جو خالص عقل سے فیصلے فرمائے ہیں۔ ان کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور اس سلسلے میں واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی کارنامے..... چناں چہ اس ذیل میں ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا۔ جب غزوۂ بدر ہوا۔ ادھر سے مسلمان تو تین سو تیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تھے اور ادھر ایک ہزار کا لشکر تھا تو تین سو تیرہ کا ایک ہزار سے مقابلہ تھا۔ دونوں کے کیمپ الگ الگ تھے۔ پہاڑ کے اس دامن میں مشرکین مکہ کا کیمپ تھا اور ادھر صحابہ کرامؓ تھے۔ اتفاق سے دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی صحابہؓ کے کیمپ میں نکل آیا مشرکین کا کوئی نوجوان ادھر آ گیا راستہ بھولا یا قصداً آیا۔ بہر حال ادھر آیا تو صحابہؓ نے اس کو تھام لیا۔ یہ تو بڑی اہم بات ہوتی ہے کہ دشمن کے کیمپ کا کوئی فوجی آدمی آ جائے تو فوراً اس کو پکڑ لیا۔ پکڑ کر اس سے پوچھنا شروع کیا کہ تمہارے کیمپ میں کتنے آدمی ہیں؟ مقصد یہ تھا کہ دشمن کی قوت کا اندازہ کیا جائے۔ تو یہ ایک طبعی بات ہے کہ جب بھی دو جماعتیں لڑتی ہیں تو ہر ایک چاہتا ہے کہ میں اندازہ کروں کہ دشمن کی طاقت کتنی ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے یہ چاہا کہ طاقت کا اندازہ ہو جائے۔ تو پوچھا کہ تمہارے لشکر میں کتنے آدمی ہیں؟ اس نے مرعوب کرنے کے لئے کہا کہ وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ بہت بڑا مجمع ہے، بڑی جمعیت ہے۔ پھر پوچھا۔ دباؤ ڈال کر پوچھا۔ سختی سے پوچھا۔ مگر اس نے بتلا کے نہیں دیا۔ بس یہ کہتا رہا۔ وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ خدا کی قسم بہت بڑا مجمع ہے۔

غرض پوچھنے میں ناکام ہو گئے۔ اس میں جو کچھ آوازیں بلند ہوئیں تو حضور علیہ السلام اپنے خیمہ مبارک سے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: یہ شور کیسا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مشرکین میں سے ایک شخص ادھر آ گیا ہے۔ ہم اس سے پوچھ رہے ہیں کہ تمہاری طاقت کتنی ہے یہ بتا کے نہیں دیتا۔

فرمایا: اسے چھوڑ دو! کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کرتے ہو؟ اس کو چھڑوا دیا۔ اس نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ تو دو منٹ کے بعد پوچھا کہ: تمہارے لشکر میں اونٹ کتنے ذبح ہوتے ہیں؟ اس نے کہا دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے ہیں۔ فرمایا: ایک ہزار آدمی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ایک اونٹ کو سو آدمی کھا سکتے ہیں اور دس اونٹ روز ذبح کرنا بتلا رہا ہے کہ یہ اس کی دلیل ہے کہ ایک ہزار آدمی ہیں۔

غرض وہ بات جو سب مل کر حل نہ کر سکتے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹ بھر میں حل کر دی۔ یہ وحی سے نہیں بتلایا، عقل سے بتلایا۔ محض تدبر اور دانش سے بتلایا۔ یہ ایک تجربہ اور اندازہ سے بتلایا۔ بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مصفیٰ بھی بہت اونچی تھی اور علم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اونچا تھا ہی۔ حدیث میں ہے کہ

---

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ: میرا پڑوسی مجھے بہت زیادہ ستاتا ہے۔ میں عاجز آ گیا ہوں میں نے منتیں کیں خوشامدیں کیں، ہاتھ جوڑے، مگر وہ باز نہیں آتا اور ہر طور پر مجھے ستاتا ہے۔ اب میں کیا کروں عاجز ہو گیا ہوں، حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تدبیر میں بتلاتا ہوں اور وہ یہ کہ اپنے گھر کا سارا سامان نکال کر سڑک کے بیچ میں رکھ دے اور اس کے اوپر بیٹھ جا اور جو آنے والا پوچھے کہ بھئی تم نے گھر کے ہوتے ہوئے سامان کیوں باہر ڈالا؟ اسے کہنا کہ پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: گھر چھوڑ دے۔ سڑک کے بیچ میں بیٹھ جا۔

چناں چہ اس نے جا کر سامان نکالا اور سڑک کے بیچ میں رکھ کر خود سامان کے اوپر بیٹھ گیا۔ اب جو آ رہا ہے پوچھتا ہے کہ بھئی! گھر تمہارا موجود ہے کیوں سڑک کے بیچ میں بیٹھے ہو۔ اس نے کہا صاحب! پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا، گھر چھوڑ دو، سڑک پر بیٹھ جاؤ، لوگوں نے کہا لعنت ہے اس شخص پر جو اپنے پڑوسی کو ستائے۔ اب جو آ رہا ہے وہ اس پر لعنت کر رہا ہے، صبح و شام ہزاروں لعنتیں اس پر برسیں شام کو اس نے ہاتھ جوڑے، اللہ کے واسطے تو اپنے گھر چل اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا۔ خود جا کے اس کا سامان رکھا اور وعدہ کیا کہ عمر بھر خدمت کروں گا اور اللہ کے واسطے دے کر اس کا سامان رکھا۔ یہ بات وحی سے نہیں ارشاد سے فرمائی تھی بلکہ یہ دانش کا اثر تھا۔ غرض انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کی طرف سے علم لے کر آتے ہیں۔ ویسے ہی کمالِ دانش لے کر آتے ہیں۔ تو جتنا بڑا علم اتنی ہی بڑی دانش۔ چونکہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم سب سے بڑا تھا تو دانش بھی سب سے بڑی تھی۔ اس لیے حضور علیہ السلام کی دانش مندیوں پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

وصفِ امیت کو مفاخر کے مواقع پر ذکر کیا گیا...... بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور امیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا وصف ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کو مفاخر کے مواقع اور مدح کے موقع پر ذکر فرمایا ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ﴾ ① توراۃ و انجیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک رسول آئیں گے وہ نبی ہوں گے اور امی ہوں گے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو کہا جا رہا ہے اور پوری انسانیت کو خطاب ہے کہ جن کا تم توراۃ اور انجیل میں ذکر پاتے ہو۔ وہ نبی امی بے پڑھے لکھے ہیں۔ تو یہاں پڑھا ہونا اور بے پڑھا ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا علم پیش فرمایا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوچا سمجھا نہیں تھا بلکہ من اللہ تھا۔ حق تعالیٰ کی جانب سے آیا ہوا تھا۔

جیسی بعثت ویسا علم...... اور پھر وہ علم کیسا تھا؟ اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ اگلے اور پچھلوں کے تمام علوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جمع کر دیے گئے تھے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: كَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهٖ

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۷.

صورت میں مجسم ہوگا تو وہی جنت کہلائے گی۔ یہ وہی جنت ہوگی جسے قاریٔ قرآن نے اپنے دل میں سمیٹ کر محفوظ کیا ہوا ہے۔ یہی جنت بلاآخر اس کا مسکن وماویٰ بنے گی۔ جب وہ اپنی جنت کو دیکھے گا اور پہچانے گا تو خود کہہ اٹھے گا کہ یہ جنت تو وہی جنت ہے جو میرے نہاں خانۂ قلب میں پوشیدہ تھی۔ البتہ دنیا میں وہ اس کے حقیقی ذائقوں اور لذتوں سے ناآشنا رہا تھا اب اس کے ذائقے بھی اس کی دسترس میں آگئے ہیں۔ اس کے انوار بھی اس پر ضَو فشاں ہیں اور اس کی خوشبوئیں بھی اس کو سرشار بنائے ہوئے ہیں۔ غرض قرآن اور اس کے متعلقات ہر حال و ہر آن خیرِ مطلق ہیں۔ دنیا میں بھی خیرِ مطلق، آخرت میں بھی خیرِ مطلق، اس کا پڑھنا بھی خیرِ مطلق اور اس کا پڑھانا بھی خیرِ مطلق۔ یہی بات اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ارشاد فرمائی گئی ہے: "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" ''قرآن حکیم کا سیکھنا سکھانا جس کا وظیفہ ہو وہ تم میں بہترین آدمی ہے''۔

پیدائشی ولی شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ...... اب چند بزرگوں کے حالات سناتا ہوں، جن کو ہم نے دیکھا تو نہیں، البتہ اپنے بزرگوں سے ان کے متعلق سنا ہے۔ ہمارے استاذِ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاندان ''اویسیہ خاندان'' کہلاتا تھا۔ آپ کے خاندان میں کوئی نہ کوئی مادرزاد ولی ضرور پیدا ہوتا تھا۔ بلا مجاہدے اور ریاضت، مِن جانب اللہ وہبی طور پر ولایت عنایت ہوتی تھی۔ (خاندان اویسیہ میں ولایت عموماً وہبی طور پر مرحمت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان اویسیہ کہلاتا تھا ورنہ نسباً یہ خاندان سادات کا تھا)۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نانا شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت پارسا اور نیک صفت انسان تھے۔ انکے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے ''یہ وہ شخصیت ہیں کہ ان کے ذہن میں گناہِ صغیرہ کا خیال تک کبھی نہیں آیا یہ جانتے ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔'' تو انہی شاہ صاحب موصوف نے تعلیم قرآن کا مشغلہ اختیار کرلیا تھا۔ دن رات بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہتے تھے۔ آپ پر استغراقی کیفیت کا غلبہ تھا۔ اولاد کے نام بھی بھول جاتے تھے۔ انکے ایک داماد تھے، جن کا نام ''اللہ بندہ'' تھا، وہ آتے تو فوراً نام پوچھتے، وہ کہتے: ''اللہ بندہ'' فرماتے صحیح نام بتاؤ، وہ پھر کہتے: حضرت! میں اللہ بندہ ہوں۔ فرماتے بھئی! اللہ بندے تو ہم بھی ہیں۔ صحیح نام بتاؤ آخر میں وہ کہتے: حضرت! میں آپ کا داماد ہوں۔ تب پہچانتے۔ فرماتے: اچھا بیٹھ جاؤ! بات چیت کر کے چلے جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آتے تو وہی سوال وجواب ہوتے۔ اللہ سے ایسی لو لگی ہوئی تھی۔ اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ ''دنیا ومافیہا'' سے بے خبر رہتے تھے۔ اولاد تک کے نام یاد نہ رہتے تھے اور یہ کیفیات پیدائشی عطیہ تھیں۔ (کسی مجاہدہ وریاضت کے نتیجے میں نہ تھیں)۔

اس زمانہ میں گھڑی گھنٹے تو موجود نہیں تھے، نشانیوں سے وقت پہچانا جاتا تھا اور پہروں (ایک پہر دو پہر تین پہر وغیرہ) میں وقت تقسیم ہوتا تھا، ایک جگہ کوئی نشان لگا کر یا کوئی چیز رکھ کر کہہ دیتے کہ دھوپ یہاں تک پہنچ جائے تو چھٹی کا وقت ہو جائے گا بس دھوپ وہاں پہنچی اور چھٹی ہوگئی۔ بچے ہمیشہ کے شرارتی۔ کبھی شرارت کر کے نشان

آگے کاڑ دیتے تاکہ دھوپ وہاں جلدی پہنچ جائے۔ وہاں دھوپ پہنچی اور شور مچا: چھٹی کا وقت ہو گیا۔ آپ فرماتے: اچھا بھئی! چھٹی کرلو۔ لوگوں نے آپ کو بتایا: میاں جی! لڑکے شرارت کرتے ہیں اور جھوٹ بول کر وقت سے پہلے چھٹی کرالیتے ہیں۔ فرماتے: بھائی! مسلمان بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ چھٹی کا وقت ہو گیا ہوگا، جاؤ بچو! چھٹی کرو۔ یہ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کا پختہ عقیدہ وخیال تھا کہ مسلمان جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ عربی کا مقولہ ہے "اَلْمَرْءُ يَقِيْسُ عَلٰى نَفْسِهٖ" ہر آدمی دوسرے کو اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ ان کے دل میں جھوٹ کا کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے دوسروں کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے جو لوگ ان سے واقف تھے، وہ خاموش رہتے تھے۔

اَوروں کے جھوٹ، حافظ محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی..... ہمارے زمانے میں حافظ محمد احسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک بزرگ تھے۔ کسی نے کسی کی زمین کے متعلق جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ یہ میری زمین ہے۔ مدعی دعویٰ کر کے میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت جی! میں نے زمین کی بازیابی کا دعویٰ کیا ہے، دعا کیجیے! زمین مجھے مل جائے۔ فرمایا: اچھا بھائی! دعا کرتا ہوں، زمین تمہیں مل جائے۔ ادھر حافظ محمد احسن صاحب کو اطلاع ہوئی کہ مدعی نے زمین پر جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ کیونکہ دراصل زمین فلاں کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی میاں صاحب کی خدمت میں آئے اور کہا: حضرت! میں بھی مسلمان ہوں، زمین میری ہے۔ فرمایا: اچھا تم اپیل کر دینا، زمین تمہیں واپس مل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، پہلے مرحلہ میں اس شخص کے حق میں دعویٰ فیصل ہوا۔ دوسرے نے اپیل کی اور اپیل میں وہ جیت گئے۔ حضرت کا دل یہ قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میاں جی رحمہ اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دکھنے لگیں، دوا دارو کچھ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ کسی نے کہہ دیا: میاں جی! اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ میاں جی کو یقین آ گیا اور وہ مکان بند کر کے بیٹھ رہے۔ جو آیا، کہہ دیا: میں نابینا ہو گیا ہوں۔ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے کہ اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں، جو آ رہا ہے اس سے کہہ دیتے کہ: فلاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہتی ہے، بس میں نابینا ہو گیا ہوں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مضطرب وپریشان ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا پختہ خیال ہے کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نابینا کہہ رہے ہیں۔ مولانا مزاج پرسی کو پہنچے، احوال دریافت کیا۔ میاں جی نے فرمایا: جی! میری تو بینائی جاتی رہی۔ فلاں صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے: اس مرض میں بینائی جاتی رہتی ہے، اب وہ جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے تھے۔ مولانا بہت زیرک وذہین تھے۔ بات سمجھ گئے، کہنے لگے: حضرت جی! مجھے ایسا پانی پڑھ کر دینا آتا ہے، جس کا چھینٹا آنکھ پر پڑتے ہی بینائی واپس آ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے پانی پڑھ کر دم کیا اور چھینٹا مار کر کہا: حضرت جی! آنکھیں کھولیے بینائی واپس آ گئی ہے۔ بینائی

وہ گیارہ بھائی محتاج ہوکر پہنچے انہوں نے ہی سرپرستی کی اور بالآخر حضرت یعقوب علیہ السلام بھی پہنچے۔ آپ نے جا کر تعظیم وتکریم کی۔ تو ابتداء خواب سے ہوئی تھی تو خواب کا علم ایک مستقل علم کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا گیا جو وحی کے ذریعہ ان پر اترتا تھا۔ غرض انبیاء علیہم السلام کو جتنے علوم عطا کئے گئے وہ سارے کے سارے حضور علیہ السلام کو عطا کئے گئے، تو تمام علوم کا جامع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنادیا گیا، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخر میں تشریف لائے اور ظاہر بات ہے کہ جب تمام ماتحت عدالتوں سے فیصلہ چلتا ہے اور اپیل چلتی ہے تو آخری عدالت میں آکر آخری حکم ہوتا ہے پھر اس کے بعد کسی اور جگہ مقدمہ نہیں جاتا۔ وہاں بالکل انتہاء ہی جاتی ہے۔

خاتم النبیین علیہ السلام کے لئے کمالِ جامعیت ضروری ہے..... کسی اسکول یا کالج میں جب اساتذہ جمع ہوں تو کچھ اساتذہ درجہ ابتدائی کے ہوتے ہیں، وہ ابتدائی علوم کچھ سکھلاتے ہیں، کچھ لغات بتلادیتے ہیں۔ اس کے بعد درجہ وسطانی کے استاذ ہوتے ہیں جو اوپر کی باتیں بتلاتے ہیں۔ جو آخری مدرس ہوتا ہے۔ جس کو پرنسپل کہنا چاہیے وہ سب سے اخیر کا مدرس ہے جو سب سے اونچی چیزیں بتلاتا ہے۔ تو تو عدہ کی بات ہے کہ پرنسپل کو ان تمام چیزوں کا علم ہونا چاہیے جو ماتحت مدرس بتلارہے ہیں۔ لیکن، تحت مدرس کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ اتنا بڑا علم رکھتا ہو جتنا صدر مدرس رکھتا ہے۔ اسکی جماعتیں چھوٹی ہیں وہ ابتدائی چیزیں سکھلائے۔

تو حضرت آدم علیہ السلام آئے بچے کو جب آپ کچھ سکھلاتے ہیں تو پہلی چیز سکھلانے کی یہ ہے کہ آپ نام سکھلادیتے ہیں کہ یہ روٹی ہے، یہ لوٹا ہے، یہ زمین ہے۔ یہ آسمان ہے، تو سب سے پہلا علم ناموں کا ہے۔ اس کے بغیر اشیاء میں تمیز نہیں ہوسکتا۔ اس ئے سب سے پہلے نبی علیہ السلام نے آکر اسماء سکھلائے: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ''آدم علیہ السلام کو ناموں کی تعلیم دی گئی''۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام آئے۔ وہ اسماء جان چکے تھے۔ اب انہیں آگے کا علم دینا چاہئے انہوں نے اسماء کی مسمیات اور اشیاء مدلولہ کو سامنے کرا کر معرفت خداوندی کرائی جن کے نام پہلے سے سیکھے ہوئے تھے۔

﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ ① ''اے لوگو! کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کیسے آسمان کو تہہ بہ تہہ پیدا کیا اور چاند اور سورج کے انڈے اس میں جلائے''۔ ﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴾ زمین سے تمہیں اس طرح سے اگا یا جیسے کہ درخت اگائے جاتے ہیں زمینی اجزاء جمع کر کے تمہیں انسان مجسم بنادیا۔ تو اللہ نے تمہیں زمین سے پرورش کیا اور پروان چڑھایا۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام نے آسمان اور زمین کے نام نہیں سکھلائے بلکہ نام والی چیزیں سامنے کررہے ہیں کہ انہیں دیکھ کر اس بنانے والی ذات کا پتہ چلاؤ۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے فقط نام سکھلائے تھے۔ حضرت

① پارہ: ۲۹ سورۃ نوح الآیۃ: ۱۵، ۱۶۔

نوح علیہ السلام نے اسماء والی چیز دکھلانا شروع کردیں۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا تو انہوں نے فقط زمین و آسمان کی صورتیں نہیں دکھلائیں۔ فرمایا گیا: ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ ① آسمان وزمین کا نہیں بلکہ ان کے ''ملکوت'' کا علم دیا۔ ''ملکوت'' حقائق کو کہتے ہیں، یعنی زمینوں کی حقیقتیں نمایاں کیں، آسمانوں کے نفوس نمایاں کئے اور حقائق منکشف کئے۔ تو پہلے پیغمبر نے اسماء سکھلائے۔ دوسروں نے صورت دکھلائی۔ تیسرے نے حقیقت کا پتہ دیا کہ صورت کے اندر کیا حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ سیارات کے نفوس کا پتہ دیا۔ زمین کے نفوس اور حقائق کا پتہ دیا۔

اب جبکہ شی کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ صورت بھی معلوم ہوگئی۔ اس کی حقیقت اور ماہیت بھی معلوم ہوگئی۔ اب یہ معلوم ہونے کی ضرورت تھی کہ ان کے احکام کیا ہیں؟ ان کی خاصیتیں کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے احکام کی تفصیل بیان کی جس کو فرمایا گیا کہ ہم نے ان کو تورات دی۔ ﴿تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ جس میں ہر چیز کی تفاصیل بتلادی گئیں۔ ہر چیز کا حکم ان کے سامنے کردیا گیا۔ تو جب ایک شئے کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ صورت کا بھی پتہ چل گیا، حقیقت کا بھی پتہ چل گیا، خاصیت اور حکم بھی معلوم ہوگیا۔ اب حکم کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ اس کے علل واسرار اس کے دلائل اور حقائق شرعیہ کا پتہ چلے۔

نبی اُمّی کے دین کا امتیاز...... تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقائق شرعیہ کا علم دیا گیا۔ یعنی اسماء بھی معلوم، صورتیں بھی معلوم، حقیقتیں بھی معلوم، احکام بھی معلوم، مگر احکام کے حقائق کا پتہ نہیں تھا۔ تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔ قرآن کریم کا نام ہے۔ ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ② تبیان دعویٰ مع الدلیل کو کہتے ہیں۔ جو دعویٰ کیا اس میں علت چھپی ہوئی ہے۔ جو حکم پیش کیا اس میں حکمت پوشیدہ ہے، اس سے مجتہدین نے کام لیا اور اس سے علل واسرار نکال کر اس سے فقہ نکالنا شروع کیا اور احکام کا استنباط کیا۔ تو انبیاء علیہم السلام پر شرائع اصلیہ اُتاری گئیں اور اس اُمت کے ربانی علماء اور آئمہ پر شرائع وضعیہ اتاری گئیں کہ اصلی شریعتوں سے استنباط کر کے وضعی شریعتیں پیدا کریں۔ استنباط واجتہاد احکام کریں۔

تو اجتہاد فقط حکم میں نہیں ہوتا۔ حکم کی علت میں ہوتا ہے کہ جب یہ علت یہاں ہے اور اس پر حکم دائر ہے تو یہ علت اگر کسی اور جگہ پہنچ گئی تو یہ حکم وہاں بھی پہنچ جائے گا اسی کو قیاس کہتے ہیں کہ کسی علت جامعہ کی وجہ سے حکم مشترک کیا جائے کہ جو حکم یہاں ہے وہی وہاں ہے، اسی وجہ سے ائمہ اجتہاد پیدا ہوئے۔ غرض پچھلی شرائع میں صرف احکام تھے، وہ احکام جزوی طور پر اقوام کو معلوم تھے۔ وہ رسوم کے طور پر ان پر عمل کرلیتی تھیں۔ لیکن اس شریعت میں احکام کیساتھ علل واسرار بھی دیئے گئے تاکہ ایک حکم پر قیاس کر کے ہزاروں احکام پیدا کئے جاسکیں۔

نبی اُمّی کے علم کی شانِ جامعیت...... اب ظاہر بات ہے کہ جو احکام کی علتیں بیان کرے گا۔ احکام اسے

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۵۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۹۔

میں پھل آتا ہے تو بھی خوشی مناتا ہے۔

خوشی کا دوسرا موقع ...... تو خوشی کے دو ہی موقعے ہیں ابتداء وانتہا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بڑے جشن منائے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، جلسے کئے جاتے ہیں اور جب وہ مرتا ہے تو میرے نزدیک وہ بھی خوشی کا دن ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی زندگی، اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر گزاردی اور وہ اس امتحان میں کامیاب گزرا۔

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ مردِ مؤمن کی خوشی ہے کہ وہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکا۔ تو مرنا غم کی بات نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ۔ لوگ تو مغموم ہوتے ہیں، روتے ہیں، خوش تو نہیں ہوتے، میں کہتا ہوں کہ لوگ اس کے مرنے پر نہیں روتے بلکہ اس کی جدائی پر یا اپنے مفادات سے محرومی پر روتے ہیں۔ موت پر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ تب ہی تو یہ کہتے ہیں کہ: ''اے اللہ! فلاں جیسی موت تو ہمیں بھی نصیب کر۔'' موت پر رنجیدہ ہوتے تو اس پر روتے اور اس کی تمنا نہ کرتے۔ معبود ومحبوب سے ملنے پر بھی کوئی روتا ہے موت تو ہمیں اللہ سے واصل کرتی ہے، یہ تلخی کی چیز کب ہوسکتی ہے غرض بچہ کی پیدائش بھی خوشی کا موقع ہے اور اس کا دنیا چھوڑ جانے کا مرحلہ بھی خوشی کا وقت ہے۔

حدیث شریف میں موت کو تحفۂ مؤمن فرمایا گیا ہے: اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ ① اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے سب سے بڑا تحفہ موت ہے۔ تو کوئی تحفہ ملنے پر بھی روتا ہے! تحفہ پر تو اظہارِ مسرت وخوشی کیا جاتا ہے۔ موت تحفہ کس طرح ہے؟ اس کے بارے میں دوسری حدیث شریف میں یوں ارشاد ہے: اِنَّ الْمَوْتَ جِسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ (اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) ② موت درمیانی پل ہے جو محب کو حبیب سے ملاتا ہے، جو وصلِ حبیب کا ذریعہ ہو، وہ باعثِ کرب وملال کیسے ہوسکتا ہے؟ اپنے محبوب سے ملاقات بھی ماتم یا غمی کی بات ہے محبوب سے ملانے والا یہ ذریعہ تو محبت کرنے کی چیز ہے، تحفہ کی چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس پر خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بڑی اچھی زندگی گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہوگیا۔ اشکباری اور غم تو اس کی جدائی کا کرتے ہیں کہ عزیز ہم سے چھن گیا، اس سے ہم جو فائدہ اٹھا رہے تھے، جو آرام پا رہے تھے وہ منقطع ہوگیا، اس سے محروم ہوگئے۔ اپنے نفع کے لئے رونا تو خود غرضی کا رونا ہے، موت پر رونا نہیں ہے۔

بہرحال ولادت بھی خوشی کا موقع ہے اور موت بھی خوشی کا مقام۔ اسی لئے قرآن کریم کا آغاز بھی خوشی کی چیز ہے اور جب اس سے فارغ ہوجائے، اس کا حافظ وعالم ہوجائے وہ بھی خوشی منانے کا موقع ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ آغاز پر جو خوشی ملتی ہے وہ توقعات پر ملتی ہے، کیونکہ آغاز کے وقت یہ توقع باندھتے ہیں کہ بچہ پڑھے گا، لکھے

---

① کنز العمال، حرف المیم، ص: ۴۰۷۔ علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الدیلمی عن جابر بزیادۃ: والدرھم والدینار مع المنافق وھما زادہ الی النار... دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۰۔

② لباب الحدیث للامام السیوطی، ج: ۱ ص: ۳۳۔ یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے۔

گا، حافظ و عالم بنے گا۔ تو آغاز کی خوشی، توقع کی خوشی ہے اور فراغت و انتہا کی خوشی، کمال پر ہوتی ہے کہ ابتداء میں جو امید باندھی گئی تھی وہ پوری ہوگئی، مراد حاصل ہوگئی۔ بچے کی پیدائش کی خوشی بھی توقعات کی خوشی ہے کہ پلے گا، بڑھے گا، جوان ہوگا، عالم فاضل بنے گا، صناع و کاریگر بنے گا۔ یہ سب توقعات ہی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی زندگی حسبِ توقعات کامیاب گزار کر سلامتیٔ ایمان کے ساتھ موت کی سرحد پار کر جاتا ہے، تو بھی خوشی ہوتی ہے۔ گو زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ جانے اور بچھڑ جانے کے غم سے آدمی اشکبار بھی ہوتا ہے اور یہ اشکباری اور رونا دھونا موت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ موت تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے یہ تو خوشی کی چیز ہوئی۔

علامتِ ولایت تمنائے موت...... بلکہ خوشی کی چیز سے بھی بڑھ کر ولایت کی علامت ہے، کیونکہ دل میں موت کی محبت ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔ اسی لئے جب یہود نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے (اولیاء اللہ) ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو اور دیگر لوگوں کی نسبت اللہ کے زیادہ چہیتے ہو تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ: ﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ ① معلوم ہوا موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے اور ظاہر بات ہے کہ ولایت موجود ہوگی تو موت کی تمنا میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ حدیث شریف میں تو ایک دعا کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی منقول ملتا ہے کہ: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَّعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ② "اے اللہ! جو شخص میری رسالت کو مانتا ہو اور اس کا اقرار کرتا ہو اس کے لئے موت کو محبوب بنا دے"۔ (اٰمِیْن ثُمَّ اٰمِیْن بِجَاهِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِیْمُ)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں موت کی محبت اور تمنا کا ارشاد ہے۔ اس سے دل میں طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں تو موت کی تمنا کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "لَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ" ③ "تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے"۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے: "اِنَّا نَكْرَهُ الْمَوْتَ" کہ ہم موت کو ناپسند کرتے تھے۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ تمنا بھی فرما رہے ہیں، دعا بھی کر رہے ہیں اور تمنا سے منع بھی فرما رہے ہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ دنیوی شدائد و مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے اور جس کے دل میں اللہ کی محبت اور اس سے ملاقات کا ولولہ اور اشتیاق ہے، اس کے لئے تمنائے موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان الگ الگ چیزوں کی وجہ

---

① پارہ ۲۸: سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶۔ ② المعجم الکبیر للطبرانی، باب النعاء، شریح بن عبید الحضرمی عن ابی مالک، ج: ۳ ص: ۲۸۷۔ علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی و فیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج: ۱۰ ص: ۳۰۹۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب المرضیٰ، باب تمنی المریض الموت ج: ۱۷ ص: ۳۲۳، رقم: ۵۲۳۱۔

اس طرح کرو جیسے تم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ صورت نہیں تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ اللہ ہم کو دیکھ رہا ہے'' ۔یہ جو دیکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے کہ اپنے معبود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں ۔ یہ تمنا ہر شخص کے دل میں ہے۔ نماز کے ذریعہ دیکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ظاہر میں اس کی نظر ہوتی ہے پیشانی کے اوپر اور حقیقت میں نظر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے چہرے کے اوپر لیکن آج نمازی کو محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ میں اللہ کا چہرہ دیکھ رہا ہوں مگر جب قلب میں جمتے جمتے اخیر وقت آئے گا اور عمر اس تصور میں گزر جائے گی تو اچانک وہ جلوہ نگاہ کے سامنے آجائے گا جس کی تمنا میں آدمی عبادت کیا کرتا تھا تو عبادت کی ہی جاتی ہے دیکھنے کے لئے۔ مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو جائے۔ تو اس حدیث میں اس کی تدبیر بتلائی گئی کہ دل میں تصور یہ باندھے کہ میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ ہے میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت ہوتی ہے نماز میں اس سے حق تعالیٰ شانہ کے اوصاف و کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞﴾

ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں جو پالنے والا ہے جہانوں کا جو رحمان و رحیم ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ جس میں سارے اولین و آخرین جمع ہوں گے۔ آج بھی اس کی حکومت ہے مگر اس روز اس کی حکومت نمایاں ہو جائے گی سارے بنی آدم کے اوپر۔ تو حق تعالیٰ شانہ کو دیکھنے کی مشق کرتے رہنے سے جب عمر بھر یہ تصور بنے گا تو ایک نہ ایک دن وہ چیز سامنے آجائے گی جسے دل میں جما رکھا تھا۔ یہ ایک انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کا وہ تصور دل میں جمالیتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

تلاوت اعلیٰ ترین جمال کے حصول کا ذریعہ ہے...... اسی طرح سے جب قرآن مجید پڑھتے ہوئے حق تعالیٰ کا دھیان دل میں جمائیں گے، وہ جم جائے گا۔ ایک وقت آئے گا کہ جس چیز کو دل میں جمایا تھا وہ آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ یہ فطرت کے مطابق ہے۔ دنیا کی چیزیں چالیس دن بعد آجائیں گی سو دن بعد آجائیں گی۔ لیکن چونکہ یہ اعلیٰ ترین جمال ہے۔ اس لئے اس میں پوری عمر چاہیے اگر پوری عمر تصور جمائے تو پھر وہ شے سامنے آجائے گی اور جمال خداوندی نمایاں ہو جائے گا۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ: جس کو یہ شوق ہو کہ میں حق تعالیٰ کی زیارت کروں اس کا طریق یہی ہے کہ قرآن کریم پڑھتے ہوئے ہر ہر حرف پر اس کا دھیان جمائے اور جما کر اس کو دل میں راسخ کرلے تو دنیا میں بھی جلوے نمایاں ہوں گے اور آخرت میں بھی دیدار ہو جائے گا۔ تو آپ نے بہت بڑا اقدام کیا ہے اور بڑی سعادت کا اقدام ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ شروع کیا ہے۔

دستورِ حیات...... اگر ترجمہ سرسری طور پر سنا جائے تو ثواب تو ملے گا ہی لیکن اس دھیان سے ترجمہ ہو کہ میرے اللہ نے کیا کہا ہے۔ یہ کیا دستور العمل ہے۔ جس پر میں چلوں تو ایک تو ہے محض معنی سمجھ لینا ایک ہے اس معنی کو دستور

العمل بنانا کہ اس پر مجھے چلنا ہے چونکہ قرآن کریم قانون کی کتاب ہے اور قانون محض اس لئے نہیں پڑھایا جاتا کہ آدمی اس کورٹ لے اس لئے پڑھایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کے احکام اور اس کی پالیسیاں معلوم ہوں تاکہ جرائم سے بچے اور صحیح طور پر چلے قانون کے اوپر۔ تو اللہ نے اپنا کلام نازل فرمایا مگر محض تلاوت کے لئے نہیں کہ اس کورٹ لیا جائے۔ یہ تو ابتدائی درجہ ہے اصل یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں کیا کہا جارہا ہے۔؟ یہ کلام کیوں ہے؟ اس میں خطاب کیا ہے؟ مجھے کس طرح سے زندگی گزارنی ہے یہ میرا دستور العمل ہے اس نیت اور قصد سے اور اس عزم سے جب آپ پڑھیں گے تو کیفیات کچھ اور ہوں گی تو اس لئے۔ میں نے عرض کیا کہ: ایک بہت بڑی سعادت کی بات آپ نے کی ہے کہ ترجمہ شروع کیا ہے۔

الفاظ قرآن کمالات خداوندی کے مظہر ہیں..... قرآن کریم کے بارے میں حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ ① "برکت حاصل کرو اس کلام خداوندی سے اس لئے کہ یہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔ کلام جو ہوتا ہے وہ متکلم کے اندر سے نکل کر سامنے آتا ہے وہ اس کے جذبات ہوتے ہیں ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔ میں کوئی ہنسی کی بات کہوں تو آپ ہنس پڑیں گے۔ یہ لفظوں کا اثر نہیں ہے بلکہ یہ اس جذبے کا اثر ہے جو میرے قلب میں موجود ہے کہ میں آپ کو ہنساؤں۔ لفظوں کو تو آڑ بنایا ہے۔ اگر جی چاہا کہ آپ کو رلایا جائے تو ایسا کلام کیا جائے کہ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں تو وہ لفظوں کا بھی اثر نہیں وہ ان جذبات کا اثر ہوتا ہے جن کا بولنے والے نے قصد کیا ہے آپ نے لفظوں کو آڑ بنایا۔ اور جذبات اپنے پیوست کردیئے قلب کے اندر کہ رو پڑا آدمی۔ پھر آپ کے دل میں جذبہ آیا کہ فلاں کو خوش کردوں اور ہنسادوں تو کچھ ایسے بول بولے کہ خواہ مخواہ ہنس پڑا اور خوش ہو گیا۔ وہ محض لفظ نہیں ہیں بلکہ وہ اندر کے جذبات ہیں، جنہوں نے الفاظ کا جامہ پہن کر اس کے دل میں اثر ڈالا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم کے الفاظ نازل فرمائے ان الفاظ میں وہ کمالات چھپے ہوئے ہیں جو بولنے والے کے اندر تھے، وہ کمالات ظاہر ہوتے ہیں ان الفاظ کے ذریعہ دنیا میں کوئی بھی جذبہ بغیر لفظوں کے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے لفظوں کو بیچ میں لانا لازمی ہے اور ان ہی الفاظ کے اندر اللہ تعالیٰ نے چھپایا ہے اپنے کمالات کو اور ان ہی الفاظ کے ذریعہ ان کمالات کو بندوں تک پہنچایا ہے اور ان کے دل میں اتارا ہے ان کمالات کو اپنے دل میں حاصل کرنے کی نیت سے اگر آپ تلاوت کریں گے اور دھیان اس پر دیں گے کہ کیا کہا جارہا ہے اور میرے دل میں کمالات کس طرح اتر رہے ہیں تو پھر اور ہی شان ہوگی۔ اسی کو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے۔ تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ ② "برکت حاصل کرو اس قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ بولنے والا جو بولتا ہے وہ اندر سے بولتا ہے لفظ آڑ ہوتے ہیں۔

① ② حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

کر کے انسان نئی نئی غذائیں نکال لیتا ہے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ لباس مستقل نعمت ہے۔ گھر دیا گیا یہ مستقل نعمت ہے۔ غرض کھیتی باڑی، باغ، زمین، کھانا پینا وغیرہ یہ سب نعمتیں ہیں اور ان میں بھی اتنی قسمیں ہیں کہ انسان گننے لگے تو ان کا گننا ناممکن ہے۔ ہر وقت آدمی ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، پھل فروٹ ہے یہ ایک نعمت کا دائرہ ہے، ہزاروں پھلوں کی قسمیں ہیں۔ غلے ہیں تو ہزاروں قسم کے غلے ہیں، کہیں چنا، کہیں چاول اور گیہوں۔ غرض کھانے پینے، رہنے سہنے اور استعمال کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ اور یہ وہ نعمتیں ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھوں اور بدن کو لگتی (چھوتی) ہیں انکا ہم احساس کرتے ہیں۔ ان کو ظاہری نعمتیں کہا جائے گا۔

باطنی نعمت ...... ایک باطنی نعمتوں کی قسم ہے، جن کو دل محسوس کرتا ہے آنکھوں سے نظر نہیں آتی، جیسے علم اور معرفتِ خداوندی ہے۔ علم دل کے اندر بھر جاتا، یہ ایسی چیز تو نہیں کہ آدمی اسے پکڑ کر جیب میں رکھ لے علم ظاہری چیز نہیں ہے، وہ بدن سے نہیں ٹکراتی، وہ دل سے دل میں آتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ نعمت ہے لیکن آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ محبت خداوندی ہے، یہ عظیم نعمت ہے۔ اپنے پروردگار سے محبت نہ ہو تو ایمان ہی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن محبت کوئی آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اسلام تو آنکھوں سے نظر آسکتا ہے، اس لئے کہ اسلام کے معنی ظاہری عمل کے ہیں۔ نماز پڑھی، روزہ رکھا، حج کیا، زکوٰۃ دی۔ نماز پڑھنے والے کو دیکھ کر ہر ایک کہے گا کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے، حج کرنے والے کو دیکھ کر کہے گا کہ حج کر رہا ہے، لیکن ایمان دل میں چھپا رہتا ہے، اسے آدمی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا مگر ہر دل جانتا ہے کہ اس میں ایمان ہے۔ تو ایمان بھی ایک نعمت، محبتِ خداوندی بھی ایک نعمت، جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، یہ عظیم نعمت ہے، ایمان کی بنیاد ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت نہ ہو، ایمان ہی نصیب نہیں ہو سکتا۔

امتحانِ محبت، نعمت میں نہیں مصیبت میں ہوتا ہے ..... اسی واسطے حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ" (1)

"تم اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتے جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی محبت اپنی اولاد اور ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کے کسی سامان سے ہو"۔

جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوگی آدمی مؤمن نہیں بنے گا۔ اس محبت کا ظہور کب ہوتا ہے، جب خدا اور رسول کی محبت کا دوسری محبتوں سے مقابلہ پڑے۔ آدمی سو رہا ہے، اسے محبت اس سے ہے کہ میٹھی نیند آ رہی ہے، نہ اٹھوں۔ مسجد میں اذان ہوتی ہے کہ آؤ مسجد میں اس وقت امتحان ہوگا کہ نفس سے زیادہ محبت ہے یا خدا سے زیادہ محبت ہے۔ اگر لحاف کو اتار پھینکا، گرم ٹھنڈے کی پرواہ نہ کی، وضو کیا اور مسجد میں حاضر ہو گیا تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا، اپنے خدا کو اختیار کر لیا۔ گویا یہ امتحان کا موقع ہوتا ہے۔ اللہ کے راستہ میں جانا ہے، اولاد کی محبت چاہتی ہے کہ

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم من الایمان، ج: 1 ص: ۲۳۔

نہ جاؤں ان کو چھوڑ کے، خدا اور رسول کی محبت چاہتی ہے کہ چلا جاؤں۔ اگر چلا گیا تو محبت میں کامیاب ہے، اللہ و رسول کی محبت اولاد کی محبت پر غالب آ گئی۔

جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) کی طرف ہجرت فرمائی ہے تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بار اور بال بچے مکہ ہی میں تھے، جائیدادیں مکہ ہی میں تھیں، عزیز و اقرباء مکہ میں تھے لیکن سب کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیئے۔ نہ جائیداد کی پرواہ کی نہ اولاد کی اور نہ بنیاد کی۔ تو یہ کہا جائے گا کہ یہ محبت میں کامیاب ہو گئے، امتحان میں پاس ہو گئے۔ جب خدا اور رسول کی محبت کا اولاد و بنیاد کی محبت سے مقابلہ پڑا، انہوں نے اولاد و بنیاد کو چھوڑ دیا اور اللہ و رسول کا راستہ اختیار کیا۔ یہ مطلب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ میرے ساتھ اتنی محبت ہو کہ نہ اتنی اولاد سے ہو، نہ ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کی کسی چیز سے ہو ورنہ مؤمن نہیں بن سکتا۔ تو وہ محبت ہے جو مقابلہ کے وقت غالب آ جائے۔ یوں تو ہر شخص کہتا ہے کہ: مجھے اللہ سے محبت ہے مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے لیکن جب دنیا کی محبت کا مقابلہ اللہ کی محبت سے پڑ جائے اس وقت کہے کہ ہاں مجھے محبت ہے اس وقت کہا جائے گا کہ ہاں واقعی محبت والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: سوچ کر کہو کیا کہتے ہو، عرض کیا: یارسول اللہ! آپ سے مجھے محبت ہے۔ فرمایا: دیکھو بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہو سمجھ کے کہو، کیا بات ہے؟ عرض کیا: آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: اگر محبت ہے تو تیار ہو جاؤ فقر و فاقہ کے لئے بھنگیاں اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کیلئے۔ یعنی ان تمام مواقع میں بھی محبت باقی رہی تب یہ دعویٰ سچا ہو گا کہ واقعی اللہ و رسول سے محبت ہے۔ عیش و آرام کے اندر ہر شخص کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے، آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! لیکن سب کچھ چھن جائے پھر بھی کہے: آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! تب کہا جائے گا سچا بندہ بھی ہے۔ نعمتوں میں رہ کر بندگی کا اعلان کرنا، یہ آسان ہے۔ مصیبت میں رہ کر محبت اور بندگی کا اعلان کرنا، یہ مشکل ہے اور یہی آزمائش کا وقت بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ

ولا! اندر جہاں یاراں سہ قسم اند زبانیاند و نانیاند و جانی

اے دل زمانے میں دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ یعنی آدمی جب دوستی کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے پرکھا بھی جاتا ہے کہ دوستی میں سچا بھی ہے یا نہیں۔ تو شاعر نے کہا دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک زبانی، جو زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، کہ ہم آپ کے دوست ہیں، ہم آپ کے خیر خواہ و بہی خواہ ہیں۔ ایک نانی ہیں، روٹی کے دوست ہیں۔ یعنی جب تک دستر خوان پر چکنا کھانا مل رہا ہے، ہم آپ کے دوست ہیں۔ اور ایک دوست وہ ہیں جو جگری دوست ہیں کہ دوست راحت میں ہو تب بھی ساتھ، مصیبت میں ہو تو کہیں گے: پہلے ہم مصیبت جھیلیں گے، بعد میں تمہارے اوپر آئے گی۔ یہ جانی دوست کہلاتا ہے۔ تو ایک زبانی جمع خرچ، ایک روٹی کی دوستی اور ایک جگر کی

اب تم میرے چہرے اور جمال کو دیکھتے رہو اور ابدالاباد تک تمہاری بینائی آج کھول دی گئی اور فرمایا جائے گا کہ ”یمین عرش (عرش کی دائیں جانب) میں آ کر قیام کرو۔ تم ہمارے مہمان ہو“۔

ان کے سامنے نعمتیں رکھی جائیں گی خدا کا کتنا بڑا احسان ہوگا کہ میدان محشر بپا ہے۔ مخلوق کا حساب کتاب ہو رہا ہے اور یہ نابینا لوگ کھلی ہوئی آنکھیں ہیں اور اللہ کے یہاں مہمان ہوں گے اور نعمتیں استعمال کر رہے ہوں گے۔ تو جب ان نابینا حضرات کی جماعت اس شان سے آئے گی اور حق تعالیٰ ان سے کلام فرما کر مہمان بنائیں گے ٹھیک اسی وقت میں علماء کی جماعت آگے بڑھے گی اور علماء کہیں گے کہ ہماری ہی تلقین سے اور ہمارے ہی جتلانے سے انہوں نے صبر کیا، ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں اور ان اندھوں کو یمین عرش میں جگہ دے دی گئی حق تعالیٰ ان نابینا حضرات سے فرمائیں گے کہ انہیں کہنے دو تم آؤ یمین عرش میں وہ عرش کی دائیں جانب نعمتوں میں ہوں گے علماء وہیں کھڑے رہیں گے۔

اس کے بعد بلایا جائے گا ان کو جو جذام کے مرض میں مبتلا تھے کہ دنیا والوں نے ان کو اچھوت بنا دیا تھا۔ محشر کے دن ان کے بدن چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے اور ان کا امام بنایا جائے گا حضرت ایوب علیہ السلام کو اور ان کو سبز جھنڈا دیا جائے گا۔ کیونکہ انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں اور بہت بیماریاں کاٹیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ: تم بھی یمین عرش میں آ جاؤ۔ پھر علماء ابھریں گے کہ ہمارے ہی کہنے سے تو انہوں نے صبر کیا اور دل میں تسکین پیدا ہوئی اور ہمیں ہی کوئی پوچھتا نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے، کہنے دو تم ان علماء کو، تم آگے چلو۔ اسی طرح سے معاملہ ہوگا۔

اہل علم کا اخروی مقام...... اور اہل مصیبت جب سب نمٹ جائیں گے۔ پھر حق تعالیٰ علماء کو خطاب فرمائیں گے کہ: تم صرف نعمتیں ہی حاصل کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم صرف اس لئے پیدا کئے گئے تھے کہ صرف اپنی ذات کا ہی نفع ڈھونڈو؟ بلکہ تم بھیجے گئے تھے دنیا کی ہدایت کے لئے یہاں لوگوں کی شفاعت کرو کھڑے ہو کر جب سب کو بخشوالو گے تب تم آگے بڑھنا۔ تم اپنے کام کے لئے نہیں پیدا کئے گئے بلکہ دنیا کے کاموں کے لئے پیدا کیے گئے تھے کہ دنیا کے انسانوں کو نفع پہنچاؤ۔ اس وقت ان کا رتبہ ظاہر ہوگا۔ وہ شفاعتیں کریں گے اور لاکھوں آدمی ان کی شفاعت کی بدولت بخشے جائیں گے۔ رب العالمین فرمائیں گے کہ: اب تم نے اپنا کام پورا کیا ہے۔ دنیا میں ہدایت کی، یہاں شفاعت کی۔ تم یہ چاہتے تھے کہ تمہیں کوئی عہدہ مل جائے، کوئی نعمت مل جائے۔ یہ تمہارا کام نہیں تھا۔ تمہارا کام یہ تھا کہ دنیا کو سب کچھ ملے اور تم الگ کھڑے رہو اس کے بعد تمہیں اجر ملے تو بہر حال یہ جو یمین عرش میں جائیں گے یہی ہیں وہ جسے میں نے عرض کیا تھا کہ: اللہ تعالیٰ کے پہلو میں جگہ مل جائے گی کہ دنیا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو عقیدہ کی آنکھ سے دیکھا تھا، قبر میں اس کے جلوے دیکھے، میدان محشر میں اس کی تجلی دیکھی اور آخر میں جا کر مل جائیں گے یمین عرش میں حق تعالیٰ کے پہلو میں بیٹھ جائیں گے۔

تجلیات قرآن کریم کے ظہور کی ترتیب...... یہ قرآن کا اثر ہوگا کہ آپ پڑھیں گے، پڑھ کر اس کی چیزیں

جمائیں گے، دل میں اللہ تعالیٰ کے کمالات آئیں گے، عظمت بیٹھے گی، ایمان مضبوط ہوگا۔ اس کے انوار و برکات قلب کے اندر آئیں گے اور پھر وہ انوار محسوس طریق پر نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر قبر میں نمایاں ہوں گے اور پھر اس سے زیادہ محسوس طریق پر تجلیات کی صورت میں میدان محشر میں نمایاں ہوں گے اور اس کے بعد حق تعالیٰ کا پہلو ہے کہ بس ہمارے پاس آ جاؤ۔ تو وہ ساری چیزیں پوری ہو جائیں گی جو عبادت سے مطلوب تھیں کہ دیکھ بھی لیں، اپنے معبود کے قریب بھی ہو جائیں۔ اس سے مل بھی لیں۔ اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں۔ یہ صرف قرآن کریم ہی کے ذریعہ تمنا پوری ہو سکتی ہے۔ تو آپ نے ترجمہ شروع کرا کر قرآن کریم کا در حقیقت راستہ کھولا ہے مسلمانوں کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں اور مل بھی لیں اور اس کے پہلو میں بھی جا بیٹھیں اور اس سے ملاصق ہو جائیں۔ آپ نے یہ بہت بڑی سعادت کا کام کیا ہے۔

قرآن کریم کتاب انقلاب..... یہی قرآن کریم ایک انقلابی کتاب ہے۔ دلوں کو بدل دیتی ہے۔ روحوں کو بدل دیتی ہے۔ جنہوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا وہ تو نہیں جانتے کہ یہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ انہوں نے استعمال نہیں کیا اس کو اور جب تک کسی چیز کو استعمال نہ کیا جائے اس کے فوائد معلوم نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس کا کوئی اثر ظاہر ہو سکتا ہے جیسے قیمتی سے قیمتی دوا ہو لیکن اس کو استعمال نہ کیا جائے تو وہ کیا اثر کرے گی۔ مثلاً شہد کو کہا گیا ہے کہ اس میں شفا ہے لیکن کوئی شخص شہد سے گھبرائے اور خیال کرے کہ شہد میرے گھر میں بھی داخل نہ ہو تو کیا فائدہ ظاہر ہوگا۔ ایسے ہی اگر قرآن کریم سے بچتے رہیں کہ قرآن کریم کو سنے بھی نہ اور اس کے پاس پھٹکے بھی نہ تو کیا اس کا نور ظاہر ہوگا، اسی کے لئے نور ظاہر ہوگا جو اس کو آگے کرے اس کو پڑھے، اس کو دل میں جمائے۔ اسی سے اس کے انوار و برکات ظاہر ہوں گے تو اس لئے دیکھا جائے تو قرآن کریم ایک انقلاب کی کتاب ہے، دلوں کو بدل دیا، روحوں کو بدل دیا، کایا پلٹ دی۔ زمانہ جاہلیت جو اسلام سے قبل کا زمانہ ہے اس کے اندر دلوں میں روحوں میں ہر برائی جمی ہوئی تھی، شرک میں وہ مبتلا تھے۔ بدعات میں وہ مبتلا تھے، منکرات میں وہ مبتلا تھے۔ چوری، ڈکیتی، زنا کاری ساری حرکتیں ان کے اندر موجود تھیں۔ نہ عقیدہ صحیح نہ عمل صحیح نہ مال درست بس جیسے جانور گزارتے ہیں۔ اس طرح سے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا۔ رات دن ڈکیتی رات دن مار دھاڑ قبیلوں میں جنگ اور کشت و خون، ہر وقت کا یہی مشغلہ تھا، قرآن کریم آیا، جن دلوں نے اس کو قبول کیا اور اس سعادت کو حاصل کیا تو ایک دم کایا پلٹنا شروع ہوگئی۔ پہلے ان کا نام تھا جہلائے مکہ۔ جب اس کو قبول کر لیا اب ان کا نام ہو گیا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

تو جہلائے مکہ سے بن گئے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ وہ زمانہ جاہلیت تھا اب اس کا نام ہو گیا خیر القرون کہ دنیا کے سارے زمانوں میں بہترین زمانہ ہے یہ وہ لوگ جو جہالت میں مبتلا تھے۔ وہی حضرات علماء کے استاذ بنے، عرفاء کے شیخ بنے۔ پوری دنیا کو نور سے منور کر دیا۔ ایک دم کایا پلٹ ہوگئی۔ جو ایک ایک پیسے کے لئے ڈکیتیاں ڈالتے تھے گردنیں کاٹتے تھے اور مرتے تھے پیسے کے اوپر، آج یہ کیفیت ہے کہ گھر بھرے ہوئے ہیں

خزانوں سے اور وہ رخ کرکے بھی نہیں دیکھتے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، بیت المال میں لاکھوں روپیہ جمع تھا۔ سونے چاندی کو خطاب کر کے فرمایا۔ یَادُنْیَا غُرِّیْ غَیْرِیْ. ① ''اے دنیا! دھوکہ کسی اور کو دینا''۔ ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں اور خزانچی کو اسی وقت حکم دیا کہ غرباء میں دولت تقسیم کی جائے۔ رات بھر دولت تقسیم ہوئی۔ یہ لوگ تھے جو پیسے ایک ایک پائی کے لئے جان دیتے تھے۔ آج خزانے پڑے ہوئے ہیں اور اس کو خطاب کر رہے ہیں کہ ہم تجھ پر ریجھنے والے نہیں۔ ہم تجھ پر مرنے والے نہیں ہیں۔ یہ کایا پلٹ کہاں سے ہوئی؟ اس قرآن نے ہی تو دلوں کو بدل دیا تھا، روحوں کو پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ پہلے مال کی محبت تھی اب کمال کی محبت ہوئی، پہلے مخلوق کی محبت تھی اب خالق کی محبت شروع ہوئی اور محبت میں مستغرق ہو گئے، غرق ہو گئے۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ بچی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں۔ ایک دن گھر میں تشریف لائے تو اہلیہ محترمہ نے دیکھا کہ کچھ غمگین اور اداس ہیں۔ پوچھا کہ آج آپ اداس کیوں ہیں فرمایا کہ خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہوگیا ہے دل کے اوپر بوجھ پڑ رہا ہے کہ اتنی خرافات کہاں میرے سر پر لدگئی۔ اس کی وجہ سے غمگینی ہے۔ بیوی بھی صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر غم کی کیا بات ہے اللہ تعالیٰ کے نام پر غرباء کو تقسیم کر دو۔ بس تشریف لے گئے اور خزانچی کو بلا کر حکم دیا کہ غرباء میں روپیہ تقسیم کیا جائے یتیموں اور بیواؤں کی مدد کی جائے۔ تمام رات مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم ہوتا رہا۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو گھر پہنچے تو بہت ہشاش بشاش۔ بیوی کے ہاتھ چومے اور کہا کہ بہت عمدہ تدبیر بتلائی تھی میرا دل ہلکا ہوگیا۔ تو پہلے یہ کیفیت تھی کہ ان کا دل ہلکا ہوتا تھا جب دولت زیادہ ہوتی تھی یا آج ہلکا ہونے لگا جب دولت ختم ہو جائے۔ یہ کایا پلٹ نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ انقلاب نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ دل بدل گئے۔

عورتوں میں انقلاب..... دولت کی محبت سب سے زیادہ عورتوں کو ہوتی ہے اور ان ہی سے یہ رنگ مردوں کو بھی لگتا ہے اگر عورتیں نہ ہوں تو یہ بھی اس رنگ میں مبتلا نہ ہوں اور یہ محبت عورتوں میں اس لئے ہوتی ہے کہ پیدا ہوتے ہی زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہیں۔ آج اس کے کان میں سوراخ کر دیئے تو بالیاں پڑ گئیں۔ ناک پھوڑ دی تو اس میں لونگ گھس گئی۔ ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں ڈال دیں۔ وہ بندھ گئیں۔ تو پیدائش سے لے کر وہ مبتلا ہوتی ہیں سونے چاندی میں اس لئے ان کے دل میں محبت بیٹھ جاتی ہے سونے چاندی کی۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿أَوَمَن يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ ② ''کیا یہ عورت

---

① المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمه علی ج: ۹ ص: ۱۳۴۔ علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: فیہ جابر الجعفی وھو ضعیف دیکھئے مجمع الزوائد ج: ۹ ص: ۱۳۱۔ ② پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸۔

جو رات دن زیوروں کی جھنکار میں پرورش پارہی ہے یہ عقل کامل رکھتی ہے؟''

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر خاوند سے تو تو میں میں ہو جائے تو خاوند تو اپنے دلائل پیش کرے گا اور یہ وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جائے گی۔ نہ دلیل نہ حجت، یہ اسی پر جمی رہے گی۔ تو جو کلام کی ایک قوت ہوتی ہے وہ نہیں رہتی۔ کیوں کہ علم نہیں اور علم اس لئے نہیں کہ مال یعنی سونا چاندی اندر گھسا ہوا ہے۔ علم نورانی ہے اور دولت سیاہ چیز ہے اور سیاہی کے ساتھ نور جمع نہیں ہوتا ہے اور سیاہی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ آپ خود دیکھتے ہیں۔ اب تو خیر وہ روپیہ نہیں رہا سونے چاندی کا اب تو کاغذ رہ گئے ہیں مگر جب سونے چاندی کے سکے تھے تو اگر پچاس روپیہ گن لیں تو انگلیاں سیاہ ہو جاتی تھیں۔ تو سونے چاندی میں کالک بھری ہوئی ہے۔ گنتے گنتے ہاتھ پیر سیاہ ہو جاتے تھے۔

جو عورتیں رات دن پیروں میں زیور پہنتی ہیں تو ان کے ٹخنوں پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے سنا اسی کے بارے میں فرمایا کہ ''دست زرآلود ایں قدر بدبو میکند۔ قلب زرآلود چہ قدر بدبو خواہد کرد''۔ یعنی جو ہاتھ سونے چاندی کو لگتے ہیں ان میں اس قدر بدبو آجاتی ہے اگر کوئی اٹک جائے سونے چاندی میں تو دل میں کتنی بدبو پیدا ہوگی اور کتنا تعفن پیدا ہوگا۔ تو عورتوں کے بارے میں فرمایا ﴿أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ﴾ ''جب وہ عورتیں زیورات میں ہی نشو و نما پاتی ہیں تو ان کے اندر علم و کلام کی قوت کہاں سے ہوسکتی ہے۔ وہ تو مرغ کی ایک ٹانگ ہانکے جائیں گی نہ حجت نہ دلیل۔ دوسرا لاکھ دلیل بیان کرے وہ اپنی ہی ہٹ پر رہیں گی۔ چونکہ دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے عورتوں کے دل اتنے بدل دیئے تھے کہ بجائے محبت کے بیزاری پیدا ہوگئی تھی سونے چاندی سے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے حاکم ہوگئے تھے تو انہوں نے دو بورے بھر کر سکوں اور زیوروں کے اپنی خالہ کے ہاں ہدیہ کے طور پر بھیجے۔ تو اندازہ کیجئے کتنے ہزاروں اور کتنے لاکھوں روپے ہوں گے جبکہ دو بوریاں بھری ہوئی ہوں۔ ایک طرف سونا اور ایک طرف چاندی یہ تمام سامان لے کر خالہ کے گھر پہنچے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ: میں کیا کروں گی اتنی دولت کو، اس کو غریبوں میں تقسیم کر دو۔ وہ دولت غریبوں کو تقسیم ہونی شروع ہوگئی صبح سے تقسیم ہونی شروع ہوئی اور شام تک دو بوریاں خالی ہوگئیں۔ باندی نے عرض کیا کہ ام المومنین! آپ پر فاقہ ہے کچھ آپ نے بھی رکھ لیا ہوتا۔ فرمایا کہ: بیوقوف پہلے سے کیوں نہیں کہا۔ دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی۔ تو حالت یہ کہ ذہن میں یہ بھی نہیں کہ اتنے وقت سے فاقہ میں ہوں اور مجھے کچھ رکھ لینا چاہئے۔ اس قدر گویا کہ غنی ہوگئی تھیں زر سے اور دولت سے کہ یہ بھی یاد نہیں تھا کہ مجھے فاقہ ہے کہ کچھ مجھے بھی رکھنا چاہیے باندی کے یاد دلانے پر یاد آیا۔

تو عورتوں کے دل میں زیادہ محبت ہوتی ہے یہ انقلاب تھا قرآن کا پیدا کیا ہوا کہ عورتوں کے قلوب کو اتنا پاک بنا دیا کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں آتا تھا کہ پیسہ پاس نہیں ہم فاقہ سے ہیں۔ یہ قرآن کا ہی تو انقلاب تھا۔ تو قرآن کریم دنیا میں

بھی انقلاب پیدا کرتا ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تو یہ کہ دل کے اندر بجائے کفر و معصیت کے ایمان کی حلاوت پیدا کرتا ہے اور آخرت میں جہنم سے بچا کے جنت میں پہنچاتا ہے۔ فتنوں سے نکال کر ان میں پہنچاتا ہے، قرآن یہاں بھی انقلاب لاتا ہے اور آخرت میں بھی انقلاب لائے گا اور برزخ میں قبر کے اندر بھی انقلاب لائے گا۔

قرآن کریم کا برزخ میں انقلاب...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سورہ تَبَارَکَ الَّذِیْ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ عشاء کے بعد اس کی تلاوت کر کے سویا کرو۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا۔ هِيَ الرَّافِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ هِيَ الْمَانِعَةُ ① یہ رَافِعَةٌ بھی ہے کہ عذاب کو رفع کرتی ہے۔ یہ مَانِعَةٌ بھی ہے کہ روک لگاتی ہے معصیتوں پر، یہ مُنْجِيَه بھی ہے جو نجات دلاتی ہے عذاب سے۔ تو قبر کے اندر نجات دلا دینا، عذاب کو دفع کر دینا اور روک دینا یہ خاصیت ہے تَبَارَکَ الَّذِیْ کی۔ اسی واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: سوتے وقت سورہ تَبَارَکَ الَّذِیْ پڑھ کر سویا کرو۔ اس لئے کہ سونا اور مرنا برابر ہے۔ سونے والا گویا کہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ موت سہل ہونے کے لئے ہی فرمایا کہ سورہ تَبَارَکَ الَّذِیْ پڑھو۔ یہ ''برزخ'' میں بھی نجات دلائے گی۔ میدان محشر میں بھی بچائے گی، یہ امر ہے شریعت کا، اگر کوئی حافظ ہے تو حفظ پڑھ لیا کرے اور حافظ نہیں ہے تو دیکھ کر پڑھ لیا کرے۔ پانچ منٹ کی کیا بات ہے۔ عشاء کے وضو ہوتے ہی پڑھ کر سو جائے اس سے برکات حاصل ہوں گی۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹایا جائے گا اور عذاب کے فرشتے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اس وقت سورہ تَبَارَکَ الَّذِیْ کو ایک شکل دے دی جائے گی وہ اس شکل میں آ کر کہے گی کہ: خبردار جو تم آگے بڑھے اس عذاب کو فوراً روک لو تو ملائکہ عذاب کہیں گے کہ ہم کو تو اللہ کا حکم ہے آپ کے کہنے سے کیسے رک جائیں وہ کہے گی کہ میں اللہ کا کلام ہوں۔ فرشتے کہیں گے کہ یہ سب صحیح ہے کہ آپ اللہ کا کلام ہیں مگر وہاں سے ہمیں کلام والے کا آرڈر ہے تو عذاب سے ہم کیسے رک جائیں تو یہ سورت غضبناک ہو جائے گی۔ اس پر ملائکہ عذاب کہیں گے کہ آپ اللہ سے کہیں۔ ہمیں نہ روکیں۔ ہم آپ کے کہنے سے رک نہیں سکتے۔ ہم تو آرڈر کے پابند ہیں وہ سورت کہے گی کہ: ایک منٹ رک جاؤ۔ اس وقت عروج ہوگا اور پہنچے گی حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ میں اور جا کے کہے گی بہت غصے سے کہ یا تو اے اللہ: مجھے اپنے کلام سے نکال دے کہ میں آپ کے قرآن کی سورت نہ رہوں اور اگر میں سورت ہوں تو اس کے کیا معنی ہیں کہ ملائکہ میری تعمیل نہیں کرتے میں تو آپ کا کلام ہوں میں آرڈر دیتی ہوں کہ وہ روکیں عذاب کو مگر وہ رکتے نہیں یا تو مجھے قرآن سے نکال دیجئے اور رکھنا ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ میرا حکم نہ چلے۔ حق تعالیٰ شانہٗ فرمائیں گے۔

میں دیکھتا ہوں تو بہت غصہ میں بھری ہوئی ہے، تو کہے گی۔ وَحَقٌّ لِّيْ اَنْ اَغْضَبَ. ② ''مجھے حق ہے کہ

① السنن للترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء في فضل سورة الملك، ج: ١٠، ص: ١٢٦۔

② الدر المنثور، سورة الملك ج: ١٠ ص: ٦٣۔

میں غصہ کروں''۔ میں کوئی معمولی چیز نہیں ہوں میں آپ کا کلام ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میری تعمیل نہ کی جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے اس میت کو تیرے سپرد کر دیا جو مناسب سمجھے تو کر، اب آئے گی آرڈر لے کر کے اور ملائکہ عذاب سے کہے گی خبردار جو تم آگے بڑھے، یہ آرڈر ہے۔

تو حدیث میں آتا ہے کہ وہ ملائکہ منہ بسورتے ہوئے رخصت ہو نگے جیسے کوئی شرمندہ شکست کھا کر جاتا ہے کہ ہماری کچھ بات بھی نہ چلی۔ وہ منہ بسورتے ہوئے واپس ہوں گے اور قبر خالی ہو جائے گی ملائکہ عذاب سے۔ حدیث میں ہے کہ یہ سورت میت کے منہ پر اپنا منہ رکھے گی جیسے کوئی بوسہ لیتا ہے اور کہے گی کیسا مبارک منہ ہے کہ جس سے میری تلاوت کی گئی تھی۔ پھر سینے پر منہ رکھے گی کہ کیسا مبارک سینہ ہے کہ جس میں میں محفوظ تھی۔ پھر قدموں پر منہ رکھے گی کہ کیسے مبارک قدم ہیں کہ جن سے کھڑے ہو کر میری تلاوت کی گئی تھی اور اس وقت میت سے کہے گی کہ تو آرام سے اور اطمینان سے رہ کوئی تیرے اوپر ہاتھ نہیں میں موجود ہوں فکر کرنے کی بات نہیں۔ تو قرآن کریم دنیا میں کایا پلٹ کر کے قلوب کو نورانی بنا دیتا ہے۔ برزخ میں کایا پلٹ کر کے عذاب کو دفع کرتا ہے اور میدانِ محشر میں اللہ کے یمین میں پہنچا دیتا ہے۔ تو قرآن کریم میں ایک تبدیلی اور انقلاب کا مادہ ہے کہ دلوں کو بدل دے روحوں کو بدل دے، ناپاک کو پاک بنا دے۔ یہ انقلاب کا مادہ قرآن میں موجود ہے۔

انقلابِ عظیم...... دنیا میں کتنا بڑا انقلاب بپا ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن کریم کی تلاوت کی ہے تو لوگ بدل گئے جو جاہلین مکہ تھے وہ صحابہ کرام بن گئے۔ زمانہ بدل گیا جاہلیت کے بجائے خیر القرون اس کا نام ہو گیا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مقام پر پہنچے کہ امت کا عقیدہ ہے کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ ''سارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم متقی پارسا پاک دامن اور قلوب کے اندر کامل تقوی لئے ہوئے ہیں''۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل ہیں یا عمر بن العزیز افضل ہیں؟ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی ہیں اور عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ہاں حضرات صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔ مگر عدل اتنے بڑے تھے کہ لوگ ان کو عمر ثانی کہتے ہیں۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور لوٹ آیا تھا۔ ان کے زمانہ خلافت میں عدل و انصاف انتہائی درجہ پر تھا۔ اس عدل و انصاف کے باوجود تین سو نفلیں بھی ثابت ہیں جو روزانہ پڑھتے تھے۔ اور علمی مشغلہ الگ رہا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کا بہت ہی اونچا مقام ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے دور خلافت میں کچھ خطا اجتہادی اور خطائے فکری بھی ہوئی ہیں اس بناء پر لوگوں نے حضرت حسن بصری سے دریافت کیا کہ'' حضرت عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ؟ حضرت حسن بصری نے جواب دیا کہ اگر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑے کی ناک میں کچھ پانی آ جائے اور اس پانی پر کچھ گرد بیٹھ جائے وہ گرد ہزار درجہ افضل ہے عمر بن عبدالعزیز سے۔ اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں اور معاویہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ صحابی اور اور کوئی شخص کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے مگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا'' ۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے انقلاب کا نقشہ...... صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ قرآن اخذ کیا، دل بدل گئے، روح بدل گئی، جذبات بدل گئے، پھر جہاں یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب بپا کر دیا، قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ دیئے، خیر تخت الٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کر لیا، قیصر کا ملک فتح ہو گیا، رومی ماتحت بن گئے کسریٰ کا ملک فتح ہو گیا۔ ایران پر حکومت قائم ہو گئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پہنچے ملک بدل دیا، تہذیب بدل دی، مذہب بدل دیا زبان بدل دی، ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہو گی۔

آج آپ ممالک عربیہ کہتے ہیں مصر کو، شام وعراق کو حالانکہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور زبان بولی جاتی تھی، مصر قبطیوں کا ملک تھا اس میں قبطی زبان بولی جاتی تھی۔ شام عیسائیوں کا ملک تھا اس کے اندر رومی زبان بولی جاتی تھی، فلسطینی بولی جاتی تھی۔ یہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا، زبان بھی بدل دی۔ مصر میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا اور زبان عربی ہوئی۔ تمدن تک بدل دیا، تہذیب تک بدل دی۔ تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں کہاں سے آئی۔؟ اس قرآن کے ذریعہ سے آئی، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو لے کر کھڑے ہوئے۔ اسی کو دستور العمل بنایا۔ تو عالم کی کایا پلٹ دی۔

انقلاب شر...... آج جتنا قرآن سے دور ہوتے جارہے ہیں، اتنا ہی فساد برپا ہو رہا ہے اور شر کا انقلاب آتا جارہا ہے کہ لوگ خیر سے شر کی طرف آرہے ہیں۔ علم سے جہالت کی طرف آرہے ہیں۔ تہذیب سے بد تہذیبی کی طرف۔ تو انقلاب خیر اور انقلاب حسن کو قرآن پیدا کرتا ہے اور انقلاب شر ترک قرآن پیدا کرتا ہے۔ قرآن کو ترک کر دو گے تو دوسرا انقلاب آتا جائے گا، تہذیب سے بد تہذیبی ہوتی چلی جائے گی۔ شائستگی بدل جائے گی ناشائستگی سے۔ علم ختم ہو جائے گا جہالت سے۔ اخلاق حسنہ جاتے رہیں گے، بداخلاقیاں پیدا ہوتی جائیں گی اس لیے علم اخلاق اور کمالات یہ قرآن ہی سکھاتا ہے۔ جب آدمی اس جڑ سے وابستہ نہ رہے تو کمالات کی شاخیں سامنے کہاں سے آجائیں گی۔ بہر حال قرآن برکت بھی ہے، ہدایت بھی ہے، نور بھی ہے اور وہ انقلاب بھی ہے کہ جب آتا ہے تو کایا پلٹ دیتا ہے۔

جنات میں انقلاب...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جنات اور شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک پہنچ جاتے اور ملائکہ کی گفتگو سن لیتے۔ اس میں کچھ جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں میں اس کی تبلیغ کرتے۔ یہ ان کا مشغلہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہ سلسلہ ان کا منقطع کر دیا گیا اب کوئی آسمان پر اگر جاتا ہے تو اسے آگ کے بم مارے جاتے ہیں جس سے وہ بھسم ہو جاتا ہے، فرشتے ان کو آسمان کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ یہ جنات

اس جستجو اور ٹوہ میں تھے کہ کون سی ایسی وجہ ہے کہ جس کی وجہ سے ہم کو روک دیا گیا ہے۔ یہ تو سمجھتے تھے کہ کوئی حادثہ ضرور پیش آیا، مگر کون سا حادثہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا تھا۔ اس کی جستجو تلاش میں نکلے اور ان جنات کا وفد مکہ مکرمہ پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرمارہے تھے قرآن کریم کی۔ انہوں نے قرآن کریم کو سنا اور سمجھ گئے کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نازل ہونے کی وجہ سے ہمارے راستے بند ہوئے ہیں تاکہ ہم اس میں خلط ملط نہ کرسکیں۔

تو انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا: ﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا﴾ ① ”ہم آج ایک کلام سن کر آئے ہیں کہ جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے راہنمائی کرتا ہے کمالات کی طرف۔ ہم تو اس کلام پر ایمان لے آئے اور ہم شرک نہیں کریں گے“۔ ہمیں تو توحید کامل نصیب ہوگئی اس کلام کو سن کر یہی ہے وہ کلام جس کی وجہ سے ہمارے راستے روکے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں مشرکین بھی تھے۔ مشرکین آئے انہوں نے قرآن سن کر توبہ کی کہ: ﴿وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا﴾ ”اب ہم شرک نہیں کریں گے“ یہ کمال جو آج ہمیں معلوم ہوا کہ توحید اتنی کامل ہے جس کو قرآن لے کر آیا ہے۔ ﴿وَأَنَّهُ تَعَالَى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا﴾ ② ”اور ہم توبہ کرتے ہیں اس سے جو ہم نے عقیدہ جما رکھا تھا کہ اللہ کے یہاں کوئی بیوی ہے اللہ کے کوئی اولاد ہے“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر عیسائی بھی تھے جو عقیدہ ابنیت کے قائل تھے، اس سے توبہ کی جنات نے۔ تو قرآن کے وہ الفاظ کان پڑے تھے کہ ایک انقلاب پیدا کردیا کفر سے ایمان کی طرف آگئے شرک سے توحید کی طرف آگئے، ناشائستگی سے شائستگی کی طرف آگئے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں قرآن کریم کے انقلاب کی ایک جھلک ...... یہی قرآن کریم ہے جو لوگوں کے دلوں کو بدلتا ہے، اگر اس کو پکڑے ہوئے ہیں تو خیر کی طرف پھرتے رہیں گے اگر اسے ترک کردیا تو شر کی طرف بڑھیں گے، فتنوں کی طرف بڑھیں گے، ایک سے دوسرے کو چین نہیں ملے گا، تو قرآن نے پیدا کیا، ایثار ہمدردی، محبت، خدمت گزاری، جذبہ اطاعت، اپنے نفع پر اپنے بھائی کے نفع کو ترجیح دینا۔ یہ جذبات پیدا کردیئے تھے۔ خود غرضی مٹا کر لاغرضی پیدا کردی اور اس درجہ کہ موت گوارہ مگر اپنے بھائی کا نقصان گوارہ نہیں۔

غزوہ بدر کے اندر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم زخمی ہوکر گرے، لشکر میں کچھ آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو مجاہدین کی ضروریات پوری کرتے ہیں مثلاً مرہم پٹی وغیرہ۔ انہوں نے آکر مرہم پٹی کی، ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کو پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو فرمایا: پانی، اس وقت ایک آدمی کٹورہ بھر کر پانی کالایا منہ کے قریب لے گئے کہ قریب سے ایک اور آواز آئی کہ پانی، انہوں نے کہا کہ: پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں لے گئے ان کے منہ سے لگایا ایک تیسری آواز آئی کہ پانی، انہوں نے کہا کہ: پہلے اسے پلاؤ میں بعد میں پیوں گا وہاں پہنچے تو چوتھی آواز آئی۔ وہ نہیں پینے پائے کہ پانچویں آواز آئی۔ وہاں پہنچے تو چھٹی آواز آئی۔ غرض سات آوازیں آئیں،

① پارہ: ۲۹ سورۃ الجن، الآیۃ: ۱، ۲۔ ② پارہ: ۲۹ سورۃ الجن، الآیۃ: ۳۔

ساتویں تک پہنچے تو وہ شہید ہو چکے تھے۔ چھٹے کے پاس لوٹ کر آئے تو وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ پھر لوٹے کہ پانچویں کو پلا دوں وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔ اسی طرح لوٹ کر واپس آتے رہے اور دیکھتے رہے کہ شہید ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ ساتوں کے ساتوں پیاسے شہید ہوئے مگر یہ گوارہ نہ کیا کہ میں پانی پیوں اور میرا بھائی برابر میں پیاسا لیٹا رہے۔ موت گوارہ کی مگر دوسرے کا پیاسا رہنا گوارہ نہ کیا۔ وہی لوگ جو ایک ایک پائی کے لئے دوسروں کے گلے کاٹتے تھے آج ان میں اس درجہ ایثار پیدا ہو گیا کہ موت گوارہ کی مگر دوسرے کی پیاس گوارہ نہیں۔

قرآن انقلاب عظیم کا سرچشمہ..... یہی وہ عظیم انقلاب ہے جو قرآن کریم نے پیدا کیا ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اندر۔ ان ہی مشت خاک کو کیمیا بنا دیا، سونا چاندی بنا دیا اور ایسا بنا دیا کہ دنیا کی کایا پلٹ دی انہوں نے۔ قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ: ''تَبَرَّكْ بِالْقُرْاٰنِ'' برکت حاصل کرو قرآن سے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے، یہ پیدا کی ہوئی چیز نہیں کلام خداوندی اس کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس سے صادر ہو رہا ہے۔ اس نے سورج پیدا کیا، اس نے چاند پیدا کیا، زمین پیدا کی اور کلام خود بخود اندر سے نکل کر آیا ہے۔ اس لئے کلام مخلوق نہیں ہے۔ مخلوق میں تو روح بن کر کلام بھرا ہوا ہے جس کی وجہ سے اشیاء اپنی اصلیت پر قائم اور صحیح معلوم ہوتی ہیں اس لئے فرمایا کہ کلام اللہ سے برکت حاصل کرو۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پیدا کئے ہوئے ہم اور آپ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مخلوقات کو اپنے اندر کی چیز نکال کر دی ہے تاکہ ان کے اندر اس کلام کی برکت سے تہذیب پیدا ہو، شائستگی پیدا ہو۔ تو اس اعتبار سے دو عالم ہوئے ایک عالم خلق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور ایک عالم ارواح ہے کہ اپنے حکم سے اپنے کلام سے اس کے اندر روح ڈالی ہے، تو قرآن کریم درحقیقت روح الٰہی ہے، روح خداوندی ہے جس سے اقوام زندہ ہوئیں۔ جس نے اسے لیا وہی زندہ ہوا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس روح کو لیا اس لئے وہ ایسے زندہ ہوئے کہ لاکھوں کروڑوں مردوں کو زندہ کر دیا، انہوں نے، ہم نے آج اس روح کو نکال دیا ہے ایسے پڑے ہوئے ہیں بے جان، جس کا جی چاہے مارے جس کا جی چاہے کاٹ دے، جس کا جی چاہے کچھ کرنے، چونکہ ہمارے اندر جان ہی باقی نہیں ہے اور نہ ہی روح باقی ہے۔

قرآن بلند ہے اور اس پر کوئی چیز بلند نہیں ہو سکتی جیسا کہ: اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی (1) اسلام بلند ہے اسے کوئی پست نہیں کر سکتا، اس کی روح جس میں آجائے گی، وہ بھی بلند ہو جائے گا۔ جس میں سے نکل جائے گی وہ پست ہو جائے گا۔

صحیح انقلاب کی تمنا میں الٹی زقند..... تو آج ضرورت اس کی ہے کہ قرآن کریم کو سنبھالا جائے۔ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کچھ دولت ہو ہمارے پاس، کچھ بلڈنگیں ہوں، کچھ جائیدادیں ہوں۔ جب ہی ہم پنپ سکتے ہیں حالانکہ

(1) الصحيح للبخاري، كتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبي، ج:٥، ص:١٣٩۔

پنپنے کی یہ صورت نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں چھن بھی سکتی ہیں، انقلابات میں گھر تک چھن جاتے ہیں جائیدادیں تک چھن جاتی ہیں، دکانیں تک بک جاتی ہیں، بازار تک جلا دیے جاتے ہیں، اگر ان سے شوکت وابستہ ہو تو وہ سب ختم ہو جائیں گی۔ اگر اندر روح بھری ہوتی ہے تو لاکھ بازار جلیں تو وہ جلتے رہیں، پھر سینکڑوں قائم ہو جائیں گے۔ مگر مومن کو ذرہ برابر فکر نہ ہوگی۔ نہ جلنے کی نوبت آنے کی، اس واسطے جہاں اور تدابیر کرتے ہیں وہ ثانوی درجہ کی ہیں۔ پہلی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان، مسلمان تو بنے اور بننے کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآن کی روح کو اپنے اندر جذب کرلے۔

کتابِ انقلاب کا طرزِ تعلیم...... بہرحال یہ سلسلہ جو آپ حضرات نے قائم فرمایا ہے مبارک سلسلہ ہے مگر اس کورسمی نہ بنایا جائے بلکہ پڑھایا جائے اور پڑھانے کے ساتھ سنا بھی جائے یعنی پڑھانے والا اور ترجمہ کرنے والا کبھی کبھی امتحان بھی لیتا رہے کہ کل ہم نے کیا بتایا تھا۔ فلاں آیت کا کیا مطلب ہے۔ اس پر آپ نے کچھ عمل بھی کیا ہے یا نہیں۔ اس لئے محض پڑھا دینا ہی کافی نہیں بلکہ تربیت بھی ضروری ہے علم کے ساتھ ساتھ۔ پھر اس کو دستورِ زندگی بنانا بھی ضروری ہے، علم اس وقت تک نفع نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اس کو دستورِ زندگی نہ بنایا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے۔

آپ نے قرآن کا ترجمہ پڑھایا احکام سمجھائے اخلاق بتلائے۔ پھر چند دن کے بعد جانچ بھی کرتے رہیں پوچھ گچھ بھی کرتے رہیں کہ کتنا عمل ہوا کتنا نہیں ہوا تو اس کی ترکیب بتلائیں جیسے کہ احادیث میں دعائیں وارد ہوئی ہیں اور قرآن کریم میں بھی بہت سی دعائیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام لکھوا دی جائیں اور پھر سنی بھی جائیں ان سے معاشرت کی اصلاح ہوتی ہے اخلاق درست ہوتے ہیں ماحول بنتا ہے اس لئے محض ترجمہ پڑھا دینا ہی ذمہ داری نہیں ہے۔

کتابِ انقلاب کا طرزِ تربیت...... میں تو یہ کہتا ہوں کہ ترجمہ پڑھانے والا عمل بھی دیکھتا رہے اور تربیت بھی کرتا رہے، یہ نہ دیکھے کہ بس ان کو علم ہو گیا ہے۔ یہ تو اور مصیبت بن جائے گی، حکمت کے ساتھ ان کی تربیت کرتا رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض تعلیم ہی نہیں دی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو کہ صرف قرآن کے معنی بتلا دیئے ہوں یا سمجھا دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کی بھی مشق کرائی ہے اور عمل کی نگرانی بھی فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ تعلیم اور حکمتِ عملی...... حدیث میں ہے کہ ایک قبیلہ حاضر ہوا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ہم ایمان لانا چاہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بسم اللہ اہل قبیلہ نے کہا کہ ایک شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ نماز نہیں پڑھیں گے فجر اور عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے باقی تین وقتوں کی پڑھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا اور وہ اسلام قبول کر کے چلے گئے۔ انہوں نے نہ صبح کی نماز پڑھی اور نہ عشاء کی۔ ظہر، عصر، مغرب کی پڑھتے رہے۔

لوگوں کو تعجب ہوا کہ جیسے تین وقت کی نماز فرض ہے ویسے ہی دو وقت کی بھی فرض ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط کیسے مان لی۔ اس پر سب کو حیرت تھی مگر ایک مہینے کے بعد ان لوگوں کے دلوں میں خود یہ خیال

پیدا ہوا کہ بھائی فرض تو ساری نمازیں ہیں، ہم تین نمازیں ادا کر رہے ہیں، دو ادا نہیں کر رہے ہیں اس پر گناہ گار ہو رہے ہیں، تو فائدہ کیا ہوا اسلام لانے سے؟ یہ سوچ کر پڑھنی شروع کی اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد پانچوں نمازوں کے پابند ہوگئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپ نے انوارِ باطن سے پہچان لیا تھا کہ یہ اس شرط پر رہیں گے نہیں اور پڑھنی شروع کر دیں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط مان لی تھی۔ تو یہ حکمت تربیت کی تھی تعلیم میں تو سب برابر ہیں۔ تعلیم میں تو یہی کہا جاتا ہے کہ بھائی جیسے ظہر، عصر، مغرب فرض ہیں، ویسے ہی عشاء اور فجر بھی فرض ہیں مگر اس سے آگے عمل کی بات ہے اور عمل میں تربیت کی ضرورت پڑتی ہے اور تربیت میں حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، تعلیم تو ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے طب کی کتاب پڑھا دی ہو اور علاج ہوتا ہے مطب میں، تعلیم میں تو طبیب سب کے سامنے ایک ہی مسئلہ بیان کرے گا لیکن کرنے بیٹھے گا تو ہر ایک کا نسخہ الگ الگ لکھے گا۔ چونکہ ہر ایک کا مزاج الگ ہے، بیماری الگ ہے، تو تعلیم کے درجہ میں تو سب برابر ہوتے ہیں لیکن عمل کرانے کے درجے میں ہر ایک کا مزاج الگ ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج کی رعایت کرنی پڑے گی اور اسی مناسبت سے نسخہ تجویز کرنا پڑے گا۔ چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مربی بھی ہیں۔ اس لئے ان کا مزاج پہچان کر مزاج کی رعایت کرتے ہوئے ان کی شرط کو قبول کر لیا اور انوارِ باطن سے پہچان بھی لیا تھا کہ بعد میں اس کو یہ قبول کریں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ردنہ فرمائی اور ہوا بھی اور بالآخر وہ ساری نمازیں پڑھنے لگے۔ یہ کچھ حکمت تھی تربیت کی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ: ترجمہ کرانے والے تعلیم کے درجہ میں تو سب کو ایک ہی طرح سمجھائیں گے مگر اس میں تربیت کی شان بھی ہونی چاہئے اور وہ ہونی چاہئے جداگانہ۔ ہر ایک کے مزاج کی مناسبت سے ہفتہ میں دو ہفتہ میں جانچ پڑتال کرتے رہنا چاہئے کہ عمل کر رہے ہیں یا نہیں؟ نہیں کر رہے تو کیا رکاوٹ ہے اس کو دور کیا جائے۔ اس طرح سے تربیت ہو کر اچھے خاصے مسلم بن جائیں گے۔

اس وجہ سے محض علم کافی نہیں جب تک کہ استعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے اور عمل کرا کے اس کی مشق نہ کرائی جائے اس وقت ثابت ہوگا کہ قرآن کریم نے نفع پہنچایا اور کس طرح سے اس نے کایا پلٹ دی ہے۔

تبریک...... بہرحال یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کر دی ہیں کہ آپ حضرات قابلِ مبارکباد ہیں کہ آپ نے ترجمہ کلام اللہ کا آغاز کیا ہے یہ نہایت مبارک اقدام ہے حدیث میں فرمایا گیا ہے: خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهُ. ① ''پڑھنے والا بھی خیر ہے پڑھانے والا بھی خیر ہے'' ﴿لَايَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ ② قرآن کریم کے نہ دائیں طرف سے باطل آسکتا ہے نہ بائیں سے نہ سامنے سے نہ پیچھے سے

① الصحيح للبخاري، كتاب فضائل القرآن، باب خير كم من تعلم، ج: ۱۵، ص: ۲۳۹.

② پارہ ۲۴ سورة حم السجدة: الآية: ۴۲.

یہ چیز باطل سے بری ہے حق محض ہے اس لئے جس میں سرایت کر جائے گا اس کے پاس باطل نہ آسکے گا وہ بھی حق کے اوپر جمے گا، تو آپ نے خیر کا کارخانہ کھلوا ہے، پڑھانے والا بھی خیر ہوگا۔ سننے والے بھی خیر ہوں گے پھر اگر اس کے ساتھ عمل بھی مستقیم ہو جائے تو اس کے ثمرات اندر اتر جائیں گے اور پھر اس کے فوائد ظاہر ہوں گے۔

یہ چند باتیں ذہن میں آئیں جو میں نے عرض کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر استقامت عطا فرمائے اس کے فوائد و برکات دنیا و آخرت میں ظاہر ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔" آمین"

دُعا

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا صَالِحًا وَرِزْقًا وَّاسِعًا وَّشِفَآءً مِّنْ كُلِّ دَآءٍ وَارْزُقْنَا يَارَبِّ حُسْنَ الْخَاتِمَةِ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَاتُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ. اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ، وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

عظمتِ حفظ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ○ ﴿الٓمّٓ ○ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ، هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ.﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

ظلمت کدہ میں روشن چراغ ..... بزرگانِ محترم! آج ہم سب کے لئے بے انتہا خوشی اور مسرت کا دن ہے کیونکہ آج ہماری قوم کے چند بچے حافظ ہوئے اور ان کو پگڑی باندھی گئی اور سند عطا کی گئی اور ان کے سینے میں حق تعالیٰ نے اپنا کلام مبارک اتار دیا۔ حق تعالیٰ کا کلام کسی بندے کے سینے میں آجانا یہ خود ایک عظیم سعادت ہے حق تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات اور اس کی صفاتِ کمال نورِ مطلق ہیں اور بندہ ظلمتِ محض اس ظلمت کدہ میں یہ چراغ روشن ہو جانا اور نورِ مطلق کی کرنیں اس میں گھومنا اور انشراحِ قلب، یہ خود ایک عظیم کرامت ہے انسان کے لئے اور قرآن کریم ایک عظیم ترین برکت اور سعادت ہے۔

سرچشمۂ حیات ..... اگر غور کیا جائے تو یہ ایک حیات اور ایک زندگی ہے، اس نے دنیا کو بھی زندہ کیا، اقوام کو بھی زندہ کیا اور عربوں کو بھی زندہ کیا اور ان میں زندگی کی روح ڈالی، خود قرآن کریم میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ② "اے پیغمبر! آپ کی طرف ہم نے وحی کی اور وحی کے ذریعہ اپنی روح آپ کے اندر ڈالی، مراد ہے قرآن کریم۔ آگے فرمایا گیا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ "آپ اس سے پہلے یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی آپ واقف نہیں تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اس وحی اور اس روح کو نور بنا کر آپ کے اندر ڈالا۔ جس سے تمام علوم آپ پر منکشف ہوئے۔

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

تو قرآن کریم کے بارے میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ روحِ خداوندی ہے اور نوعیت اس کی علم اور کمال ہے۔ تو دوسرے لفظوں میں علم کو روح بتلایا گیا ہے۔

ہم اور آپ اپنے عرف میں جانتے ہیں کہ روح باطنی چیز ہے اور وہی زندگی ہے بدن کی، بدن کی کوئی زندگی نہیں اصل میں زندگی روح کی ہے اس کی وجہ سے بدن بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ جس دن روح نکل جاتی ہے، اسی دن یہ بدن بھی لاش ہو کر گندگی میں شمار ہوتا ہے۔ تو حقیقتہً یہ زندگی روح کی ہے اور بدن کی زندگی اس روح کے روپ میں اللہ کے کمال کی ہے۔ تو قرآن کریم میں جس کو روح کہا گیا ہے وہ روحِ خداوندی ہے اور حقیقت میں ایک معدنِ حیات اور سرچشمۂ زندگی ہے۔

یہ روحِ خداوندی جب عربوں میں پہنچی تو وہ قوم زندہ ہوئی جو پشت ہا پشت سے مُردہ چلی آرہی تھی، دنیا جس کو حقیر و ذلیل جانتی تھی۔ کوئی ان کو اونٹ کی مینگنیوں میں کھیلنے والا سمجھتا تھا۔ کوئی ان کو جُہلائے عرب کا خطاب دیتا تھا۔ کوئی جاہلینِ مکہ کہتا تھا اور مختلف تحقیر آمیز خطابات سے ان کو یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ روح ان کے اندر بھر گئی تو وہ عالموں سے بڑھ کر عالم اور عارفوں سے بڑھ کر عارف باللہ بن گئے اور جن کا نام جُہلائے عرب تھا ان کا نام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہو گیا۔

پہلے ان کو نفرت سے یاد کیا جاتا تھا، اب ان کو ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① کے اعزاز کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس روحِ خداوندی سے پہلے جس زمانہ کا نام تھا ''زمانہ جاہلیت'' اب اس کا نام ''خیرُ القرون'' ہے۔ تو زمان میں بھی زندگی آئی، مکان میں بھی زندگی آئی اور اعیان میں بھی اور افراد بھی ایسے زندہ ہوئے کہ دنیا کو زندہ کیا۔

سپر طاقتوں کی شکست کی بنیادی وجہ...... اور دنیا کی مُردنی کو دفع کر کے پوری دنیا میں زندگی پھیلا دی اور مُردہ قوم جو پہلے کروٹ نہیں لے سکتی تھی اب قوت پا کر بڑھی تو اتنی بڑھی کہ قیصر و کسریٰ کا رکھ دیا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ ان مقدس ہستیوں کو اپنی جواں مردی ثابت کرنی نہیں تھی بلکہ ان خرافات کو مٹانا تھا جو دنیا کے اندر پھیلی ہوئی تھیں۔ قیصریت و کسرویت کا حاصل خدائی کرنا تھا۔ وہاں جو آتا تھا اسے اپنے بادشاہ کو سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض نے زبان سے دعویٰ کیا کہ ہم معبود اور خدا ہیں اور بعض نے عملاً رعایا سے وہ کام کرائے جو خدا ہی کے لئے مخصوص تھے تاکہ سمجھا جائے کہ وہ خدا ہیں چنانچہ رعایا کا ہر فرد آکر سجدہ کرتا تھا اور فریاد کرتا کہ: میری ساری حاجتیں آپ سے متعلق ہیں۔ تو جو خدا کی شان میں کہا جاتا ہے، وہ قیصر و کسریٰ کی شان میں کہا جاتا تھا۔ رعایا سب کی سب غلام سمجھی جاتی تھی۔ اس غلامی کے معنی صرف یہ تھے کہ وہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے چند اُمراء اور بادشاہ کو عیش کرائے اور خود بیلوں کی طرح اپنے کھیتوں میں لگی رہے اور ان کی محنتوں سے چند

① پارہ: ۳۰، سورۃ: البینۃ، الآیۃ: ۸۔

افراد فائدہ اٹھائیں، مساوات تھی نہ عدل و علم تھا۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جنگیں ملک گیری کے لئے نہیں تھیں، وہ تخت شاہی کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ اس اقتدار کو خاک میں ملاتا تھا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور اللہ تعالیٰ کے بندوں میں عدل و مساوات کی راہ میں حائل تھا۔ اور اس وقت دنیا میں قیصر روم اور کسریٰ کی دو بڑی بڑی حکومتیں تھیں جو اللہ کے دین کی سربلندی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اس وقت دنیا میں وہی دو ہی حکومتیں تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جب تک یہ اقتدار ختم نہیں کیا جائے گا۔ یہ اوصافِ کمال، عالم میں نہیں پھیل سکتے۔ انسانوں میں خدائی اور بندگی کی تفریق رہے گی۔ یہ مساوات اور عدل اسلام لے کر آیا ہے اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی قیصریت وکسرویت ہے اس لئے ان حضرات نے ملک سے قیصریت وکسرویت کو مٹایا، بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کا تختہ جا کے اُلٹا۔ جب جا کے مساوات پیدا ہوئی۔ اسلام پھیلا دین پھیلا اور وہی لوگ جو انسانوں کے عبد بنے ہوئے تھے وہ عباد اللہ بنے، وہ اللہ تعالیٰ کے بندے بنے، سب میں مساوات آئی، ان میں زندگی آئی۔ تو قرآن کریم نے اپنے کو روح کہا ہے اور حق تعالیٰ نے روح بتلایا ہے اور روح ہی معدنِ حیات ہے۔ اس سے گویا واضح ہوگیا کہ قرآن کریم زندگی ہے اور جس قوم میں یہ سرایت کر جائے گا وہ زندہ ہو جائے گی اور جس سے نکل جائے گا وہ مُردہ ہو جائے گی۔

حافظِ قرآن کا باطل سے تحفظ ...... اور پھر آپ غور کریں تو واقعی جس سینے میں قرآن ہوگا۔ باطل اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا اس واسطے کہ قرآن کی شان مثبت طریق پر یہ فرمائی گئی ہے کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ① "وہ جو ایمان لے آئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ چیز پر قرآن پر فرمایا: ﴿وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ "وہ اللہ کی طرف سے حق ہی بنا کر اتارا گیا ہے"۔

تو مثبت طریق پر تو قرآن کو حق کہا ہے۔ اصل میں حق یہی ہے۔ دوسرے منفی پہلو میں دوسری جگہ فرمایا گیا کہ ﴿لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ ② "یہ وہ کلام ہے کہ اس کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں باطل نہیں پھٹک سکتا"۔ یہ حق ہی حق ہے۔ اندر سے بھی حق اوپر سے بھی۔ نہ باطل اس کے اندر ہے نہ اس کے آس پاس آسکتا ہے۔ پھر قرآن کریم باطل سے منزہ اور مبرا اور ذاتی طور پر حق اور سراپا حق۔ اب یہ حق اور غیر باطل جب کسی کے سینے میں گھسے گا تو اس کے سینے میں بطلان کہاں سے آجائے گا۔

اور دوسرے جب یہ حق ہے تو اس میں باطل نہیں آسکتا۔ تو جن بچوں نے آج قرآن کو اپنے سینے میں لے لیا ہے۔ حقیقت میں لفظوں کے اعتبار سے تو وہ منزہ ہو چکے ہیں باطل سے، کل کو معانی اس کے پڑھ لیں گے تو معانی کے لحاظ سے بھی باطل سے منزہ ہو جائیں گے۔ تو ایک وصف تو یہ تھا کہ قُربِ خداوندی ملا۔ دوسرا وصف یہ کہ

① پارہ: ۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ: ۲۔ ② پارہ: ۲۴، سورۃ حم سجدۃ، الآیۃ: ۴۲۔

مشابہت مل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تیسرا وصف یہ ملا کہ مجسم حق بنے گا۔ باطل اس کے آس پاس نہیں آسکتا۔ اس لئے اس کے اندر قرآن رُوح بن کر سرایت کرگیا ہے اور وہ حق ہی حق ہے۔ بطلان اس کے آس پاس نہیں باطل دُور سے ہی بھاگے گا۔

حافظِ قرآن کی حیات دائمی ہے...... اگر اس پہلو کو دیکھیں کہ وہ حیات ہے اور آپ نے حیات کو اپنے اندر ڈال لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زندہ ہیں مُردہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ مُردنی بدن پر طاری ہوگی اور بدن پہلے ہی سے باطل ہے۔ اسے موت آجائے تو کون سے بڑی بات ہے۔ اصل میں زندہ روح ہے۔ اس کا زندگی کا سامنا تو وہ دوامی زندگی ہے۔ تو حافظ اور قاری مَرنے والا نہیں۔ روح اس کی جاری وساری ہے۔ نہ حافظ مرتا ہے نہ قاری مرتا ہے نہ عالِم مرتا ہے بلکہ اس کا بدن مرتا ہے۔ اس کی روح زندہ ہی رہتی ہے۔ اس روح کا فیضان اس عالَم میں پہنچتا رہتا ہے۔ اس لئے موت حقیقت میں اس کے پاس پھٹکتی ہی نہیں اور موت کا یہ حاصل ہے کہ بدن کھانے پینے کے قابل نہ رہا بلکہ روح کھانے پینے کے قابل ہے۔ اسے وہاں بھی غذا مِل رہی ہے۔ یہاں بھی مِل رہی ہے۔ یہاں بھی اس کی غذا علم و معرفت تھی اور برزخ میں بھی اس کی غذا علم و معرفت ہے اور جنت میں بھی اس کی غذا اعلیٰ سے اعلیٰ علم و معرفت ہوگی، تو ہر جگہ اسے زندگی ہے۔ بدن کو یہاں غذا ملی تھی مگر بہت سی دفعہ بیمار ہو کر یہاں بھی محروم ہو جاتا ہے۔ برزخ میں پہنچا وہاں بھی محروم ہوگا۔ حشر میں پہنچے گا تو وہ وہاں بھی محروم رہے گا۔ جب تک وہ روح کے ساتھ نہ ملے کوئی اس کی قدر و قیمت نہیں۔

تو بدن کی نہ یہاں زندگی نہ برزخ میں زندگی اور نہ وہاں زندگی اور روح یہاں بھی زندہ، برزخ میں بھی زندہ اور عالَمِ آخرت میں بھی زندہ اور روح کی غذا یہی قرآن کریم ہے جس سے حیاتِ اَبدی ملتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حافظِ قرآن مرتا نہیں وہ زندہ ہی رہے گا۔ اس کے لئے موت نہیں، ایک جسی موت ہے کہ بدن ناکارہ ہو جائے۔ روح اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ مگر روح جو لے کر گئی ہے وہ قائم ہے اس کے ساتھ وہ اس سے ہٹنے والی چیز نہیں وہ قرآن ہے جو روح ہے بلکہ روحِ خداوندی ہے۔ تو حافظ کی شان یہ ہے کہ باطل اس کے پاس نہیں آئے گا، جس حد تک وہ قرآن کو لے چکا ہے اور حیات اس کی دائمی بن گئی ہے اور وہ مشابہ بن گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اللہ تعالیٰ کی صفات اور خطابات اسے مل گئے کس کے ایسے نصیب ہیں۔ اسی واسطے اس کا اثر یہ ہوگا۔

حافظِ قرآن کے والد کی تاجپوشی...... حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: قیامت کے دن حافظ کے باپ کی تاجپوشی کی جائے گی یعنی میدانِ حشر میں جہاں اولین و آخرین جمع ہوں گے تاج پہنایا جائے گا جس کی نورانیت سے پورا محشر منور ہوگا۔ اعلان ہوگا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن کریم یاد کرایا تھا۔ یہ آج اس کی عزت افزائی ہو رہی ہے، جو تاج پوشی کی گئی ہے۔

دنیا میں اگر کسی کی تاجپوشی کی جائے تو یہ عظیم ترین اعزاز ہے اس سے بڑھ کر کوئی فخر و اعزاز کی چیز نہیں۔ لیکن

کسی بادشاہ کی اگر تاج پوشی ہوتو اس ملک کے جو اعیان ہیں وہ جمع ہوتے ہیں اور بادشاہ کو تاج پہنا کر اعلان کرتے ہیں کہ آج سے یہ ہمارا بادشاہ ہے ملک والوں کو فخر ہوتا ہے۔ اس میں ہر اقلیم کے لوگ جمع نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے ملک والے لوگ جمع ہو کر تاج پہنائیں گے۔ اور ایک یہ کہ اگر مان لیا جائے کہ کسی کی تاج پوشی میں ساری دنیا کے ملکوں کے نمائندے جمع ہو گئے اور سب نے کھڑے ہو کر تاج پہنایا مگر اس زمانہ کے جو لوگ گزر چکے ہیں وہ تو نہیں آویں گے یا آئندہ آنے والے ہیں وہ تو شریک نہیں ہوں گے پھر تاج پوشی ناقص رہی۔

مگر میدان محشر میں آدم کی ساری اولاد جمع ہوگی۔ اول سے آخر تک۔ اربوں کھربوں انسان جمع ہوں گے۔ جلسہ ہوگا۔ صدر حق تعالیٰ شانہ ہوں گے۔ ملائکہ علیہم السلام معاون ہوں گے، جلسہ کے تمام آفاق پر زمینوں پر ان کی فوجیں کھڑی ہوئی ہوں گی۔ بیچ میں بنی آدم ہوں گے۔ اس میں مسلم غیر مسلم سبھی ہوں گے۔ ابھی حساب و کتاب نہیں ہوا ہوگا۔ اس وقت ایک بچے کے باپ کو جس نے حفظ کرایا اس کی تاجپوشی کی جائے گی۔ تو اولین و آخرین جمع تاج پہنانے والے خدا تعالیٰ تو اس سے بڑھ کر ایک حافظ کے لئے فخر و اعزاز کا اور کون سا موقعہ ہوگا۔ حافظ کو اپنی ذات سے جو تھا وہ تھا ہی۔ اس کے ماں باپ تک یہ اثر پہنچا کہ ان کو بادشاہ بنا دیا گیا ان کی تاج پوشی کی گئی اور اولین و آخرین میں شور یہ ہوگا، بھائی انہوں نے اپنے بچے کو قرآن کریم حفظ کرایا تھا۔ تو بہر حال خود کلام کو دیکھو تو وہ حق محض ہے جس میں باطل پاس نہیں آسکتا جس محل میں آیا بچے کے وہ اتنا بلند ہوا کہ اسے مشابہت حاصل ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے القاب ملے حق تعالیٰ شانہ کی حیات ملی اسے دائمی۔ اس کے اثرات متعدی ہوئے تو ماں باپ تک اثرات پہنچے۔ اور ماں باپ کی تاج پوشی کی گئی۔ اولین و آخرین میں شہرت ہوئی۔ تو گویا قرآن کے آثار دنیا سے لے کر برزخ تک اور برزخ سے لے کر آخرت تک سب سے اعلیٰ ہیں۔

قرآن حکیم کی ابدی حکومت...... اور پھر یہی نہیں کہ یہیں ختم ہو جائیں بلکہ آگے جنت تک بھی یہ اثر چلتا رہے گا۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ: حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَتِّــلْ وَارْتَــقِ تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا جنت کے درجات کماتا جا۔ اس کی جزا یہ ہے کیونکہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: جتنی آیات ہیں قرآن کی اتنے ہی درجات ہیں جنت کے۔ ہر درجہ میں تفصیلات تو لاکھوں ہیں۔ لیکن نوعی طور پر درجات کی وہی تعداد ہے جو قرآنی آیتوں کی تعداد ہے۔ اب جیسے قرآن کی کوئی آیت ہے چار حرفوں کی۔ اس کے اندر غور کرو تو ہزاروں قسم کے درجات نکلیں گے۔ تفصیل کھولو تو احکام الگ نکل رہے ہیں۔ لطائف الگ نکل رہے ہیں۔ علل و الگ نکل رہی ہیں۔ اسرار الگ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حد و نہایت نہیں اس کے کمالات کی تفصیلات کی آیت ایک ہی ہے۔ تو قرآن کی ایک آیت مستقل موضوع ہے علم و کمالات کا۔ لیکن مجمل دیکھا جائے تو انواع علوم کی اتنی ہیں جتنی آیات ہیں۔ اور درجات جنت کے اتنے ہی ہیں جتنی آیتیں ہیں۔ تو فرمایا جائے گا اس حافظ قرآن سے کہ تلاوت کرتا جا۔ جہاں تک تیری طاقت ہے۔ درجات کماتا جا اور پھر ہر درجہ کی تفصیل الگ ہے۔ جیسے آیت کے اندر تفصیلات ہیں۔

لاکھوں علوم بھرے پڑے ہیں۔تو جو درجہ جنت کا کمائے گا اس کی نعمتوں کی تفصیلات اتنی ہیں کہ کوئی حد ونہایت نہیں ہے ابدالآباد گزر جائے گا۔مگر وہ سیر وسیاحت میں ہی رہے گا اور نعمتیں متاثر رہے گا۔تو قرآن کی حکومت دنیا میں ہی نہیں برزخ میں ہی نہیں حشر میں ہی نہیں بلکہ جنت میں ابدالآباد تک رہے گی۔اس واسطے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔میرا اور آپ کا کلام نہیں۔

قرآن کریم کے ابدی آثار کی وجہ...... ہمارا کلام جب فضا میں آتا ہے تو وہ گم نہیں ہوتا وہ ختا نہیں،اس کو فضا گھیر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام جب چلتا ہے تو وہ فضا کو گھیر لیتا ہے۔ساری فضا کو گھیر لیتا ہے ساری فضا اس کا محل بن جاتی ہے۔تو فرق یہ ہے کلام اللہ تعالیٰ نے فضا کو گھیرا اور ہمارے کلام کو فضا نے گھیر لیا ہے جیسے ریڈیو نے ضبط کر کے دنیا تک پہنچا دیا۔اگر فضا میں محفوظ نہ ہوتا تو ریڈیو کس کو پیش کرتا،اسی پر ریڈیو کی بنیاد بنی ہے کہ جو لفظ ہم بولتے ہیں فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے۔جیسے قرآن کریم نے فرمایا ہے۔﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ ① کوئی لفظ کوئی ہاں ہوں تم اپنے منہ سے نہیں نکالتے مگر تکنے والا اسے تاک لیتا ہے،محفوظ کر لیتا ہے ہر ہر لفظ محفوظ ہے،ہر ہر ادا محفوظ ہے اور آواز محفوظ ہے اور قیامت کے دن وہ سامنے کر دی جائے گی،وہ عمل بھی وہ ہیئت بھی وہ قول بھی اس قول کی آواز بھی وہ زمانہ بھی ہر چیز محفوظ ہے۔تو بہر حال ہماری آواز جب نکل جاتی ہے منہ سے تو گم نہیں ہوتی۔یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کلام نکلے وہ گم ہو جائے۔ہمارے اور آپ کے کلام کو تو فضا گھیر کر محفوظ کر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام نکل کر ساری کائنات کو گھیر لیتا ہے تو وہ کیسے گم ہو سکتا ہے وہ تو گم ہونے والی چیز نہیں،جس میں وہ کلام خدا جذب ہوگا۔وہ انشاء اللہ تعالیٰ گم ہونے والی چیز نہیں ہے آخرت تک اس کے آثار و برکات چلتے ہی رہیں گے۔

حافظ قرآن کا حق شفاعت...... حدیث میں ہے کہ حافظ قرآن کو حق دیا جائے گا کہ اپنے عزیزوں میں سے دس کی شفاعت کر خواہ وہ ماں باپ ہوں،بھائی بند ہو۔تجھے حق ہے دس آدمیوں کی شفاعت کا جس کی چاہے شفاعت کرا اور اگر کسی نے گھر میں سے پانچ بچوں کو حفظ کرا دیا ہے تو پچاس آدمیوں کی شفاعت کا حق ہوگا ان کو اگر گھر میں پچاس آدمی نہیں تو باقی شفاعت اوروں کے کام آئے گی۔گھر والے تو بخشے ہی جائیں گے۔باقی شفاعت اوروں میں پہنچ جائے گی۔

کسی کو شفاعت کا حق دیا جانا بڑی عزت وعظمت کی بات ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ بخشا بخشوایا ہے۔جب ہی تو اس کو دوسروں کو بخشوانے کا حق دیا جا رہا ہے کہ تو شفاعت کر دس آدمیوں کی ہم قبول کریں گے۔ اسی طرح سے علماء کو حق دیا جائے گا۔شہداء کو حق دیا جائے گا کسی کو سات کسی کو دس آدمیوں کی شفاعت کا۔اب اگر سارے ہی گھر والے حافظ ہیں تو ان کی شفاعت کہاں تک پہنچے گی۔آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

---

① پارہ:۲۶،سورۃ ق،الآیۃ:۱۸۔

ابدی سربلندی...... بہرحال جن ماں باپ نے اپنے بچوں کو حفظ کرایا ہے۔ وہ یہاں بھی محروم نہیں وہاں بھی محروم نہیں۔ یہاں بھی ان کے لئے برکات ہیں وہاں بھی ان کے برکات ہیں۔ بچہ ابھی چھ سات برس کا ہوتا ہے مگر جب پیش کرتے ہیں پہلے ماں باپ کا نام آتا ہے کہ فلاں صاحب کا بیٹا ہے جس نے قرآن حفظ کیا تو پبلک جان گئی کہ بچہ یہ ہے باپ یہ ہے۔ اس باپ کا احسان ہے جو اس بچے کو قرآن حفظ کرایا۔ تو دنیا میں بھی سرنام ہوا اور آخرت میں تو تشہیر ہوگی ہی۔ اولین میں آخرین میں تو بچہ بھی اور ماں باپ بھی سارے کے سارے ہی سرنام ہوں گے۔

عظمت قرآن کریم...... بہرحال قرآن کریم کی عظمت کے سینکڑوں پہلو ہیں جو احادیث میں فرمائے گئے وقت اتنا نہیں ہے کہ اور سارے پہلوؤں کا ذکر کیا جائے اور سارے پہلو ذکر میں آ بھی نہیں سکتے۔ یہ دو چار پہلو ذکر کر دیئے گئے ہیں کہ یہ قرآن کے پہلو ہیں جن سے قرآن کریم کی عظمت واضح ہوتی ہے اور ان بچوں کو پگڑی باندھ کر چند چیزیں ذہن میں آئیں کہ بڑی اور بڑی خوش نصیبی ہے ان بچوں کی، کہ حق تعالیٰ نے ان کو یہ فضیلت عطاء فرمائی۔ اور یہ بھی کم فضیلت ہے کہ ایک نالائق یہاں آ کر بیٹھا کرسی کے اوپر کہ بچوں کی پگڑی باندھے اور آپ نے سپاس نامے میں یہ کس کی تعریفیں کر دی؟ حالانکہ یہ مبالغہ ہے اور میں کہتا ہوں کہ مبالغہ تو جھوٹ کی قسم ہے اور آپ لوگ بری ہیں خدانخواستہ جھوٹ بولیں۔ آپ نے تو اپنے نزدیک سچی باتیں کہی ہیں۔

نگاہ محبت...... مگر یہ کہتا ہوں کہ آپ نے ایک نالائق بھائی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور محبت کی نگاہ سے کوئی چیز بری نہیں لگتی ہے۔ اس کا عیب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے یہ سب محبت کرنے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبت اور اخلاص سے جب انہوں نے دیکھنا شروع کیا تو عیب دار کے عیب بھی چھپ گئے اور ساری چیزیں انہیں خوبیاں ہی خوبیاں نظر پڑیں تو خوبیوں سراہنی شروع کر دیں حالانکہ وہ خوبیاں کہاں اور ہم جیسے کہاں؟ اور سادگی سے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تو آپ نے اپنی تعریف کی ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اپنے حوصلہ کا ثبوت دیا ہے۔ آپ نے اپنی وسعت قلبی کا ثبوت دیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک ناکارہ بھائی کو بہت بڑھایا آپ میں وسعت تھی جب ہی تو آپ نے بڑھادیا۔ تو وسعت قلبی کا ثبوت آپ دیں تو شکریہ میں کیوں ادا کروں؟ یہ تو آپ نے اپنے کمالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔

برکت سے بڑھ کر برکت...... اور میں کہتا ہوں کہ نہ تم ہمارا شکریہ ادا کرو اور نہ ہم تمہارا شکریہ ادا کریں۔ بس ہم سب مل کر اپنے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہم پر اپنا فضل فرمایا کہ ہمیں ایک جگہ جمع کیا۔ ہمارے بچوں کو حافظ بنایا۔ ہمیں توفیق دی کہ ان کو پگڑی باندھیں، ہمیں توفیق دی کہ ان کو سند دیں اور اس قرآن کریم کی تعلیم کو ہم آگے چلائیں۔ یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے جو ہمیں توفیق عطاء فرمائی۔ تو بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں کہ ہمیں جمع کر دیا کہ مسلمانوں کا اجتماع یہ خود ایک مستقل نعمت ہے اور برکت ہے اور اجتماع ہو قرآن کے لئے یہ برکت سے بھی بڑھ کر برکت ہے۔ اور قرآن سے بھی افادے کے لئے وہ آگے

بڑھیں تو یہ برکت در برکت ہے۔

تو اتنی برکات اور اتنی نعمتیں ہمیں عطا فرمائیں تو اس لئے اصل میں مستحق تو شکر کے وہ ہیں۔ وَلَهُ الثَّنَآءُ الْحَسَنُ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. عزت والا وہ شکر کا مستحق وہ حمد وثنا اس کے لئے۔ تو ہم سب مل کر اس کی حمد وثناء کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ مدرسہ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع فرمائے اور اس کے معلم اور ہمارے قاری صاحبؒ کی عمر دراز فرمائے اور ان کے ایثار اور اخلاص میں اور زیادہ برکتیں عطا فرمائے اور ہمارے اس قصبے اور علاقے کے لوگوں کو اور زیادہ توجہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا بِمَعْرِفَةِ سُبُلِ الْاِجْتِهَادِ وَتَقْلِيْدِهٖ وَاَرْشَدَنَا اِلٰی طَرِيْقِ اِتِّبَاعِ الْاَئِمَّةِ وَتَاْيِيْدِهٖ، فَنَوَّرَ قُلُوْبَنَا بِشُمُوْعِ اَعْلَامِ السُّنَنِ وَجَنَّبَنَا بِهَا عَنْ فِتَنِ الضَّلَالَةِ وَالْغَوَايَةِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ. وَاخْتَارَ لَنَا بِحُسْنِ تَوْفِيْقِهٖ مِنَّةَ الْاِتِّبَاعِ وَيَسَّرَ لَنَا التَّجَنُّبَ عَنْ وَرْطَةِ الْبِدَعِ وَالْاِخْتِرَاعِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ حُبِّبَ اِلَيْنَا اِقْتِدَآءُ الْمُنِيْبِيْنَ بَعْدَ اِتِّبَاعِهٖ وَرَضِیَ لَنَا الْاِهْتِدَاءَ بِهَدْیِ الرَّاسِخِيْنَ بَعْدَ الْوُقُوْفِ عَلَيْهِ وَاطِّلَاعِهٖ. فَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ شَهَادَةً تُنْجِيْنَا عَنِ الْفُسُوْقِ بَعْدَ الْاِيْمَانِ. وَتَكُوْنُ عِدَّةً لِّلتَّقْلِيْدِ بِطُرُقِ اَهْلِ الْفِقْهِ وَالْعِرْفَانِ.

اَمَّا بَعْدُ!

شکریہ و تمہید..... محترم حضرات! میں اس تصور سے بھی خجل اور شرمسار ہوں کہ صدارت کے نام سے مجھ جیسے نااہل کو ایک ایسی جگہ پر بٹھایا گیا ہے جو کسی اہل ترین فرد کے لئے سزاوار ہوسکتی تھی اور اسی لئے مجھے اس منصب کے قبول کرنے میں حد درجہ تامل اور تردد تھا جس کا میں نے اعتذار کے لہجہ میں اظہار بھی کر دیا تھا لیکن وہ درخور پذیرائی نہیں ہوا۔ آخر کار اس جماعتی ارشاد سے روگردانی کو بے ادبی خیال کرتے ہوئے میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور ہوگیا اور آج اپنی بے بضاعتی کے ساتھ آپ کے حضرات سامنے ہوں۔ مجھے ان بے نفس بزرگوں کے اخلاص اور ایثار کی برکت سے جو اپنی صدارت کی دولت کو بے دریغ لٹا کر ہم جیسے نااہلوں کو مسندِ صدارت پر بٹھا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ تو دروتوانا جو رسوم حسنہ میں حقیقت حسنہ ڈالتا ہے اور جو اچھی صورتوں کے سانچے میں اچھی سیرتیں القاء فرما دیتا ہے۔ اس رسمی اعزاز کو حقیقت کا پیش خیمہ بنادے اور اس مبارک ہیئت کو جو بزرگانِ کانفرنس کی عزت افزائی سے بصورتِ موجودہ نظر آرہی ہے عین حقیقت کردے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

بنابریں میرا عقلی اور شرعی فریضہ ہے کہ میں ان تمام بزرگوں کا مخلصانہ شکریہ ادا کروں جنہوں نے مجھے بایں بے بضاعتی قبول فرمایا ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنِّیْ خَيْرَ الْجَزَآءِ وَاَحْسَنَ اِلَيْهِمْ اَحْسَنَ الصِّلَةِ. آمین

حضرات! اس مختصر تحریر سے میری غرض حنفیہ یا فقہ حنفی کی دعوت و تبلیغ یا رعایت واشاعت نہیں یا اس کے منکرین یا غیر حنفی مسالک پر کوئی رد وانکار نہیں ہے کیونکہ یہ فقہی مسالک کچھ شرائع مستقلہ نہیں ہیں کہ ان کی دعوت و

تبلیغ کا سلسلہ چھیڑ کر ایک سے دوسرے مسلک پر ردوطعن یا ایک سے دوسرے کا ابطال کیا جائے۔ یہ اجتہادی مسالک محض عملی راستے ہیں جو چلنے کے لئے صاف کئے گئے ہیں نہ کہ جنگ کے میدان ہیں جو لڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور نہ موجودہ نازک زمانہ جب کہ مسلمانوں میں ہزاروں مابہ النزاع موجود ہیں اس کے لئے موزوں ہی ہوسکتا ہے کہ ایک اور نزاع کو ہوا دی جائے۔

تحریر خطبہ کی غرض وغایت...... اس مختصر نوشتہ سے غرض اصولی طور پر اجتہاد وتقلید کے بارہ میں نقل صحیح اور عقل سلیم کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی معتبر اور مستند یعنی شرعی اجتہاد کی تقلید کوئی بدعت سیہ نہیں ہے کہ اسے قابل ملامت اور اس کے مرتکب کو مستوجب تکفیر تصور کیا جائے بلکہ وہ ایک ایسا مسلوک راستہ ہے جو سلف سے لے کر آج کے خلف تک اجماعی طور پر دینی راہ گزر بنا رہا ہے اور امت نے اس کے سوا اپنے دین کے تحفظ کی کوئی اور صورت نہیں سمجھی۔ یہ غرض نہیں کہ تقلیدی مسلک سے انکار رکھنے والے کیسے ہیں اور کس حکم کے مستحق ہیں؟ میں اس سلسلہ میں ابتداءً چند تمہیدی جملے اور بعد میں اصل مقصد کی چند باتیں عرض کروں گا جس کے خطاء وصواب کا فیصلہ حضرات علماء کے ہاتھ میں ہے۔ فَإِنْ یَّکُ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ وَإِنْ یَّکُ خَطَآءً فَمِنْ نَّفْسِیْ وَالْمَرْجُوُّ الْمُسَامَحَةُ وَالْإِصْلَاحُ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ.

اللہ کا کام اور اس کا کلام...... حضرات! اس عالم کی زندگی اور آبادی ورونق صرف دو چیزوں سے ہے بلکہ عالم میں آبادی صرف دو چیزیں ہیں ایک اللہ کا کام اور ایک اس کا کلام خدا کے کاموں سے کائنات عالم میں حسی نظام بنا ہے جسے عالم خلق کہتے ہیں اور اس کے کلاموں سے اقوام عالم کا یہ شرعی نظام استوار ہوا ہے جسے عالم امر کہتے ہیں۔ ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبٰرَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ① پس عالم خلق ہو یا عالم امر دونوں میں اسی کی ذات وصفات اور کمالات علم وعمل کی جلوہ گری ہے اور تکوین وتشریع کے ان گوناگوں مظاہر میں اسی باطن مطلق کے محاسن اقوال وافعال ظہور کر رہے ہیں۔

ہر چہ دیدم در جہاں غیر تو نیست	یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

تکوین وتشریع کا مبداء ومعاد واحد ہے...... یہی وجہ ہے کہ تکوینی نظام بھی اسی سے چل کر اسی پر ختم ہوتا ہے اور تشریعی انتظام بھی اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی تکوین وتشریع اور امر کا مبداء اور معاد وہی اور صرف وہی ہے۔ عالم خلق کے بارے میں اپنے مبداء ہونے کو اپنے کلام پاک میں اس طرح ارشاد فرمایا ﴿وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ﴾ ② ''وہی ہے جو آغاز فرماتا ہے خلقت کا''۔ پھر اسی آیت سے ملحق اپنے معاد خلق ہونے کی یوں تصریح فرمائی کہ ﴿ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ﴾ ''پھر وہی ہے جو خلقت کو (اپنی طرف) لوٹا لیتا ہے اور وہ اس پر بالکل سہل ہے''۔

① سورة الاعراف، الآیة: ۵۴۔ ② پارہ: ۲۱، سورة الروم، الآیة: ۲۷۔

جس سے واضح ہے کہ کائنات کی ابتداء وانتہا صرف اسی سے ہے کوئی غیر اس میں دخیل نہیں اسی طرح عالم امر کے بارہ میں اپنا مبداء ہونا یوں ظاہر فرمایا ﴿اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَھُنَّ﴾ ① ''اللہ ہی ہے جس نے سات آسمانوں اور انہی کی مانند زمینوں کو بنایا، اتر تا رہتا ہے امر ان کے درمیان'' اور دوسری آیت میں اپنے مرجع الامور اور معاد امر ہونے کی یوں تعبیر فرمائی کہ ﴿وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ ② ''اور اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹ جاویں گے''۔

جس سے نمایاں ہے کہ اوامر ونور شرائع کا نازل کرنا اور آخر کار اپنی طرف اٹھالینا صرف اسی کا کام ہے اس میں کوئی مخلوق یا کوئی بشر شریک نہیں۔ پس نہ تخلیق وتکوین میں اس کا کوئی ساجھی اور شریک ہے اور نہ تشریع وتعمیر میں کوئی اس کا سہیم وندیم ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ ③

تکوین وتشریع کے اصول بھی ایک ہیں...... یہاں سے خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے کہ تکوین اور تشریع کو بروئے کار لانے والے ایک ہی اصول فطرت ہو سکتے ہیں جو ﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ④ کی فطرت سے ناشی ہیں کہ وہی ان دونوں کا مبداء اور انتہا ہے انہی اصول کو جب تخلیق میں استعمال کیا گیا تو عالم مخلوقات مکمل ہو کر سامنے آ گیا اور انہی کو جب تشریع میں بکار لایا گیا تو عالم مشروعات تیار ہو کر پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

چناں چہ حق تعالیٰ کی صفت تانی وتدریج یا صفت ربوبیت کا اصول جس کے معنی آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ کسی شئے کو اس کی حد کمال تک پہنچانے کے ہیں جب تکوین کے ساتھ ہم کنار ہوا تو بتدریج مخلوقات کا نظام مکمل ہو کر اس ہیئت کذائی پر آ گیا جو آج زمین وآسمان شجر وحجر، حیوان وانسان اور پوری منظم کائنات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور وہی تدریج کا اصول جب تشریع سے ہم آغوش ہوا تو بتدریج ہی شرائع کا نظام بھی کامل وتام بن کر اس ہیئت کذائی پر سامنے آ گیا۔ جو اسلام کی صورت میں ہمارے آ گئے ہے۔ مخلوقاتی نظام کی اس تدریجی ساخت اور تکمیلی مدت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں راہنمائی فرمائی کہ ﴿اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ ⑤ ''بلاشبہ تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں، پھر چھا گیا عرش پر کہ امر کی تدبیر فرمائے''۔ اس کی تفصیلات دوسری آیات اور احادیث میں موجود ہیں کہ کتنے دن اور کون سے دن میں کیا چیز بنی اور اس نے اپنی تکمیل میں کتنی مدت لی۔ آیت سے بالاجمال یہ واضح ہے کہ یہ مجموعہ کائنات چھ (۶) دن میں تیار ہوا، اس کے ساتھ جب یہ آیت بھی ملا لی جائے کہ۔ ﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ ⑥ ''اور ایک دن آپ کے پروردگار کا مثل ہزار برس کی مدت کے ہے جو تم شمار کرتے ہو''۔

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۱۲۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۹۔ ③ پارہ: ۷، سورۃ انعام، الآیۃ: ۵۷۔
④ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۱۔ ⑤ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۳۔ ⑥ پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۷۔

تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات خلق کی تکمیل رفتہ رفتہ چھ ہزار برس میں ہوئی۔ ادھر شرعی نظام کی تدریجی ترقی و تکمیل کی طرف بھی قرآن نے اشارہ فرماتے ہوئے تعلیمات الٰہیہ کا اولین مورد اور خلافت ربانی کا پہلا مرکز حضرت آدم علیہ السلام کو بتلایا ان کی علمی خلافت کے بارہ میں جو عالم امر کی ابتداء ہے۔ قرآن عزیز کا ارشاد ہے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ ① اور خلافت نبوۃ کے بارہ میں جو عالم امر کی آخری کڑی ہے۔ حدیث ابوذر غفاریؓ میں جسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے آدم علیہ السلام کو اول الانبیاء اور نبی مکلف فرمایا گیا جن پر آسمانی صحف نازل ہوئے ② غرض قصر نبوت کی تعمیر آدمؑ سے شروع ہوئی جو نبوت اور علم نبوت کے پہلے مرکز تھے جن سے عالم امر کا آغاز ہوا۔ پھر اس قصر نبوت کی آخری خشت جس سے یہ قصر مکمل ہوا۔ حدیث ابی ہریرہؓ میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ: خُتِمَ بِیَ الْبُنْیَانُ وَخُتِمَ بِیَ الرُّسُلُ (وَفِی رِوَایَۃٍ) فَاَنَا اللَّبِنَۃُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ ③ ''مجھ سے قصر نبوت مکمل کر دیا گیا اور رسول ختم کر دیے گئے (اور ایک روایت میں ہے) پس میں وہ خشت ہوں جس سے یہ قصر مکمل ہوا اور میں خاتم النبیین ہوں۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس علم نبوت اور ختم نبوت کے آخری مرکز تھے جن پر عالم امر کا اختتام کر کے اس کی تکمیل کر دی گئی۔ چنانچہ قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری اور وداعی حج کے دن دین کی اس تدریجی تکمیل کے آخری نتیجہ کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا کہ ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ ④ ''آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں تم سے دین کے بارے میں اسلام سے راضی ہو گیا''۔

اگر مورخین کا یہ قول اختیار کیا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے چھ ہزار سال بعد دور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہوتا ہے اور آپ ساتویں الف کے آغاز میں مولود اور مبعوث ہوئے ہیں (جس پر بعض آثار صحابہؓ اور احادیث بھی شاہد ہیں جن کو ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے) تو واضح ہوگا کہ تکوینیات کی طرح تشریعیات کی تکمیل بھی چھ ہزار سال میں ہوئی ہے اور جس طرح تکوین و تشریع میں تدریج و تانی کا اصول مشترک تھا اسی طرح اس کی مدت بھی مشترک اور یکساں ثابت رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے چھ دن یا دنیا کے چھ ہزار سال کی مدت میں مخلوقات اور مشروعات کا نظام مکمل ہو کر اس درجہ پر پہنچا دیا گیا کہ اب اس میں نہ کمی کی گنجائش رہی نہ زیادتی کی نہ ترمیم کی نہ تنسیخ کی کہ ﴿لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ﴾ یعنی جس طرح کائنات عالم کے کلی مواد آب و خاک و باد و آتش پھر مواد کے کلی موالید جمادات، نباتات، حیوانات،

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱۔ ② مسند احمد، حدیث ابی ذر الغفاریؓ ج: ۴۳ ص: ۳۲۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین ﷺ ج: ۱۱ ص: ۳۶۶ والصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ ﷺ خاتم النبیین ج: ۱۱ ص: ۲۰۴۔ ④ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳۔

پھر ان کے علویات اور سفلیات۔ پھر مواد علوی و سفلی کی جامع انواع و اجناس، انسان، شیر، بکری، شجر حجر و ر، بحر و بر، جن، ملک سیارات و ثوابت، ارض و سماء وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جسے عالم کہتے ہیں اب کوئی کی بیشی قبول نہیں کر سکتے۔ اسی طرح دین کے اصول و کلیات اساسی قواعد و ضوابط اور تمام منصوص عقائد و احکام کی اس مجموعی ہیئت کذائی میں جسے اسلام کہتے ہیں کوئی کمی بیشی اور ترمیم و تنسیخ ممکن نہیں کہ ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ ①

ایجاد اور اجتہاد..... مگر ہاں جس طرح تکوین کے ان مرتب مواد اور علوی و سفلی ذخائر سے بواسطہ فکر و تدبیر نئے نئے عجائبات کا انکشاف کیا جا سکتا ہے اور ان کی چھپی ہوئی طاقتوں کا سراغ لگا کر تمدن کے نئے نئے کارنامے دنیا کو دکھائے جا سکتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں کہ۔ لَاتَنْقَضِيْ عَجَآئِبُهٗ ②

اسی طرح تشریع کے منظم احکام و مسائل اور قواعد و کلیات کے مخفی علوم و اسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدین کے نئے نئے فروعی مسائل لطائف و ظرائف اور حقائق و معارف پیدا کئے جا سکتے ہیں کہ قرآن کی شان بھی لَاتَنْقَضِيْ عَجَآئِبُهٗ وارد ہوئی ہے۔ اس تکوینی انکشاف کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔ نہ ایجاد کی کوئی حد ہے اور نہ اجتہاد کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ایجادات ہر زمانہ کی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق ہوتی ہیں اور فطرۃً موجدین کی طبائع ان ہی ایجادات کی طرف چلتی ہیں جن کی زمانہ کو ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو طبائع کی یہ دوڑ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آگے صرف ان ایجادات سے فائدہ اٹھانا رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی اجتہاد کا رنگ بھی ہر دور کی علمی ذہنیت اور وقت کے مقتضیات کے مطابق ہوتا ہے۔ مجتہدین کے قلوب فطرۃً چلتے ہی اس استخراج کی طرف ہیں جس کی اس قرن کو ضرورت ہوتی ہے۔ پس تکمیل ضرورت کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو گذر چکا ہے کہ زمانہ اس کی ضرورت سے فارغ ہو چکا ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع باقی رہ جاتا ہے۔

اجتہاد کی انواع..... مثلاً اگر عین دین میں اجتہاد کر کے استخراج علل و کلیات اور تدوین اصول کی ضرورت ہوگی تو مجتہد دماغ قدرۃً ادھر ہی چلیں گے اور اگر ان کلیات میں سے اجتہاد کے ذریعہ استخراج مسائل اور تدوین قانون کی ضرورت ہوگی تو مجتہد دماغ ادھر ہی متوجہ ہوں گے۔ اور پھر اگر ان مستخرج مسائل کو واقعات پر منطبق کر کے ترجیح و انتخاب فتاویٰ کی ضرورت پڑے گی تو اجتہادات ادھر ہی بڑھیں گے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ جو درجہ بھی اجتہاد کے ذریعہ پردۂ ظہور پر آ جائے گا اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ پھر طبعی طور پر اس کے اعادہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے قدرۃً بعد کے مجتہد دماغ اس کی طرف چل ہی نہ سکیں گے کہ ان کے لئے ان حاصل شدہ اجتہادات میں اجتہاد کرنے کی طرف کوئی کشش ہی نہ ہوگی کہ تحصیل حاصل سے فطرت ہمیشہ گریز کرتی رہی ہے کیونکہ حاصل شدہ شئے سے صرف انتفاع کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے نہ کہ سے حاصل کرنے کی۔

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۶۲۔

② السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء في فضل القرآن، ج: ۱۰ ص: ۱۴۷۔

مجتہد کا کام حقیقت رسی ہے...... اس سے آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچ گئے ہوں گے کہ موجد اور مجتہد کا کام محض سطحی امور کا دیکھ لینا نہیں بلکہ ان کی گہرائیوں میں گھس کر ان کی بنیادوں کا پتہ لگانا ہے۔ موجد کائنات کی اشیاء کی صورت سے گزر کر ان کی مخفی خاصیات کا پتہ چلائے گا تاکہ اس کی باطنی کلیت اور اندرونی وسعت سے اپنا علم وسیع کر کے کوئی ایجادی قدم اٹھا سکے اور مجتہد مسائل شرعیہ اور نصوص کے ظواہر سے گزر کر ان کے باطن میں گھسے گا تاکہ علل کلیہ اور اسرار جامعہ کا سراغ لگا کر ان جزوی مسائل کو ہمہ گیر بنا سکے۔ خلاصہ یہ کہ جزئیات سے کلیات تک پہنچنا اور کلیات سے پھر نئے جزئیات نکالنا ان دونوں طبقات کا کام ہوگا نہ کہ سامنے آئی ہوئی جزئیات کا یاد کر لینا کہ یہ در حقیقت حفظ ہوگا علم نہ ہوگا یا علم ادنیٰ ہوگا علم اعلیٰ نہ ہوگا۔

مثلاً تکوین کے سلسلہ میں دنیا کی بے شمار جزئیات وافراد زید، عمر، بکر، شجر، حجر اور عمرو بکر کا دیکھ لینا یا سن کر معلوم کر لینا کوئی قابل ذکر علم نہیں کہ یہ ہر عامی سے عامی انسان کو میسر آسکتا ہے بلکہ یہ علم ہی نہیں حس ہے۔ خواہ آنکھ سے محسوس کرے یا کان سے ہاں یہ جان لینا کہ زید کن کلیات کے ماتحت زید ہے۔ اس کی حقیقت کی تشکیل کن کن کلیات سے ہو رہی ہے اور اس کی ماہیت میں کون کون سے کلیات حصہ دار ہیں۔ پھر زید جزئی کا اس کی ماہیاتی کلیات سے کیا رابطہ ہے حقیقۃً علم ہے جو حس کے مقام سے بالاتر ہے۔

آپ خود ہی غور کریں کہ زید اور زید کی طرح عالم کی جزئیات منتشر اور بے جوڑ نہیں بلکہ ہر جزئیت میں بیسیوں کلیات سرایت کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ سب جزئیات اور افراد سمٹ کر کسی نہ کسی نوع کے تحت میں آئے ہوئے ہیں۔ پھر ساری انواع سمٹ کر کسی نہ کسی جنس کے نیچے ہیں۔۔ پھر اجناس جمع ہو کر کسی جنس عالی اور جنس الاجناس کے تحت میں آ جاتی ہیں اور کائنات کی اس فطری ترتیب و تنظیم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عالم کی تمام جزئی کثرتیں سمٹ کر کلیات کی طرف اور کلی وحدتیں پھیل کر جزئیات کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ پس یہ زید جزئی بظاہر تو ایک جزوی شخص ہے لیکن بہ نگاہ غائر وہ ایک مستقل جہاں ہے جس میں ترتیب وار سینکڑوں کلیات اور عمومات سمائی ہوئی ہیں اور اس کی زیدیت کی تشکیل و تکمیل کر رہی ہیں۔

اس جزئی زید کے اوپر انسان کلی ہے۔ جس میں زید کی طرح لاکھوں افراد انسانی بیٹھے ہوئے پڑے ہیں۔ پھر انسان کلی کی حقیقت میں یا اس کے اوپر حیوان ہے جس میں حیوان کی طرح لاکھوں نمودار نباتی انواع گھسی ہوئی ہیں۔ پھر نامی کی اصل جسم ہے جس میں نامی کے ساتھ لاکھوں غیر نامی اور بے نمو جمادات شریک ہو گئے ہیں۔ پھر اس جسم مطلق سے اوپر جوہر ہے جس میں اجسام کے ساتھ ان گنت غیر جسمانی مجردات بھی آ جاتے ہیں۔ پھر جوہر سے اوپر وجود ہے جو کلی الکلیات اور جنس الاجناس ہے جس کے نیچے جوہر کے ساتھ لاکھوں اعراض بھی آ جاتے ہیں پس ساری کائنات کے یہ مختلف الماہیات اور شاخ در شاخ اجزاء ان درمیانی کلیات سے گزرتے ہوئے وجود میں جمع ہو جاتے ہیں جو ان سب کی اصل اصول ہے اور اس طرح ایک زید کے بنانے میں کس قدر کلیات نے اپنا کام

گیا۔ اس کا انداز ہ اس سے کیجئے کہ وجود نے جو ہر کا لباس پہنا، جو ہر نے جسم کی قبا اوڑھی، جسم نے نمو کی رداء پہنی۔ نامی نے حیوانیت میں قدم رکھا، حیوان نے انسانیت میں ظہور کیا اور انسان نے ان سارے تشخصات کے ساتھ زید کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ پس زید مجموعہ اصول وکلیات نکلا جس کی جزئیت میں کتنی ہی کلیات سمائی ہوئی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ سے خود متشکل ہو کر نمایاں ہو رہی ہیں۔

پس ایک عامی تو صرف زید کو دیکھ سکے گا، لیکن ایک مفکر زید کے دیکھ لینے ہی پر قناعت نہیں کرے گا۔ اس کی گہری نظر ان مخفی کلیات واسرار تک پہنچ کر رہے گی جن سے زید کا قوام بنا اور وہ یہ ہیئت کذائی نگاہوں کے سامنے آنے کے قابل ہوا۔ اس لئے عامی کو جس میں صرف پیشانی کی آنکھ تھی مُبصر کہیں گے لیکن اس باطن بین دانا کو جس کی مخفی آنکھ نے زید کے ان تمام مخفیات کو بھی دیکھ لیا مُبصر ہی نہیں مبصر بھی کہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ زید کے جثہ کا دیکھ لینا علم نہیں بلکہ زید کی کلی حقیقت کو پالینا اور پھر ان جزئی زید کا اس کلیات سے ارتباط معلوم کر لینا علم ہے جو ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔

شریعت حد درجہ مرتب اور منظم ہے...... بالکل یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ تشریع کے یہ لاکھوں مسائل اور شریعت کی یہ ہیئت کذائی محض سطحی اور نمائشی نہیں بلکہ پوری شریعت اپنے ظاہری مسائل اور باطنی دلائل نیز اپنے تمام فروع اور اصول کے لحاظ سے اس درجہ مرتب اور منظم ہے کہ وہ مثل ایک سیدھی زنجیر کے ہے جس میں یہ سارے اصول وفروع اور جزئیات وکلیات درجہ بدرجہ ترتیب وار پروئے ہوئے ہیں۔

شریعت کا کوئی جزئیہ نہیں جو کسی نہ کسی کلیہ کے ماتحت نہ ہو، ہر ہر فرع کسی نہ کسی اصل کے ماتحت ہے۔ پھر ہر ہر اصول کسی نہ کسی اصل الاصول سے مربوط ہے اور سارے اصول وکلیات سمٹ کر کسی ایک اصل الاصل سے جڑے ہوئے ہیں۔ جس سے پوری شریعت ایک محیر العقول نظام کے ماتحت اور ایک ایسے شجرۂ واحد کی صورت دکھائی دیتی ہے جس کی تمام شاخیں اور شاخ در شاخ ٹہنیاں مع اپنے ثمرات کے ایک اصل واحد سے ناشی ہو رہی ہیں اور ہر آن اپنے مستفیدین کو اپنے پھلوں سے بہرہ مند کر رہی ہیں۔ ﴿مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ○ تُؤْتِيْٓ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا﴾ ① ”مثال کلمہ طیبہ کی اس پاک درخت کی مانند ہے جس کی جڑ تو تہہ میں گھسی ہوئی ہو اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ پھل دے رہا ہو ہر آن اپنے پروردگار کی جانب سے۔

پس آیات واحادیث میں جس قدر بھی جزئی احکام مذکور ہوتے ہیں جو زید، عمر، بکر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں ان کی تشکیل وہ اصول وکلیات وعلل واسرار کرتے ہیں جو ان جزئیات میں مستور ہوتے ہیں کہ ہر جزئی میں ایک علم کلی ہوتا ہے اور ہر علم کلی میں کوئی حکمت مصلحت کلیہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر ہر مصلحت کا تعلق کسی نہ کسی شان کمال

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۲۴، ۲۵. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰.

سے ہوتا ہے۔ پھر ہر شان کمال کسی نہ کسی صفت الٰہی سے مربوط ہوتی ہے جس سے نفس انسانی کی صفات نقص اس جز ئیہ شریعت کی تکمیل کے ذریعہ کمال کا اثر قبول کرتی ہیں اور پھر یہ صفات کمال ذات بابرکات سے مربوط ہیں کہ کمالات کا منبع اسی وجود ہے جیسے شروع کا منبع عدم ہے۔

حرف خوش راست اندر معنے معنے در معنے در معنے

اسی طرح ساری شریعت بالآخران درمیانی اصول وکلیات اور شئون وصفات سے گزرتی ہوئی اپنے وجود سے جاکر جڑ جاتی ہے۔ یعنی شریعت کے تمام اوامرونواہی جو بمنزلہ افراد کے ہیں اپنی اپنی علل کے نیچے ہیں جو بمنزلہ انواع کے ہیں۔ پھر یہ تمام انواع سمٹ کر دو جنسوں کے نیچے آ جاتی ہیں۔ معروف اور منکر پس سارے ماموارت کا سرچشمہ معروف ہے اور سارے منہیات کا سرمنشا منکر ہے۔ اسی کو قرآن عزیز نے یوں واضح کیا ہے کہ ﴿ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ ① ”وہ جو پیروی کرتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جو نبی امی ہے پاتے ہیں وہ لکھا ہوا اپنے پاس تورات وانجیل میں، جو انہیں معروف کا امر کرتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔

پس اصل میں مامور بہ معروف اور منہی عنہ منکر ہے اب جس چیز میں معروفیت ہوگی وہ مامور بہ بن جائے گا اور جس میں منکریت ہوگی وہ منہی عنہ، ہو جائے گا۔ اس لئے بالذات مامور ومنہی معروف ومنکر ہے کہ وہی حسن بالذات اور قبیح بالذات ہوتے ہیں اور بالعرض وہ چیزیں ماموروہنی بنتی ہیں جن میں وصف معروفیت اور وصف منکریت موجود ہو کر ان کا حسن وقبح ذاتی نہیں ہوتا لغیرہ ہوتا ہے۔ پس یہ معروف ومنکر کی دونوں اجناس اللہ کی صفت عدل کے نیچے آئی ہوئی ہیں۔ عدل الٰہی کا تقاضہ ہے کہ معروفات برسرکار آئیں اور منکرات زیر ترک رہیں: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَ یَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ﴾ ”اللہ تعالیٰ امر فرماتا ہے عدل اور احسان کا اور روکتا ہے فحشاء ومنکر سے“۔

پس دین کے حق میں یہ صفت بمنزلہ جنس عالی کے ہے اور ظاہر ہے کہ عدل حصہ ہے اس کے وجود کا یعنی وجودی کمال ہے اس لئے گویا سارے اوامر اور نواہی وجود الٰہی سے مربوط ہو گئے اور اس طرح پوری شریعت ذات بابرکات سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس کو واضح طور پر سامنے لانے کے لئے ذیل کی امثلہ پر غور کیجئے۔

تنظیم شریعت کی چند امثلہ...... ❶ ﴿ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى ﴾ (زنا کے پاس بھی مت پھٹکو) اور ساتھ ہی اس کی علت نقل فرمائی کہ ﴿ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ﴾ ② (کیونکہ زنا فحش ہے) پس بظاہر تو ﴿ لَا تَقْرَبُوْا ﴾ کا حکم زنا پر لگ رہا ہے مگر حقیقۃً فحش پر لگا ہوا ہے کہ فحش ہی کی وجہ سے زنا حرام ہوا ہے۔ اگر اس میں فحش کی شان نہ ہوتی تو وہ ہرگز حرام نہ ہوتا۔ چناں چہ دوسری جگہ کتاب مبین میں اس کی تصریح بھی ہے کہ ﴿ وَ یَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ

① پارہ: ۱۴ سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰۔ ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۲۔

وَالْمُنْكَرِ﴾ ① ”اور اللہ روکتا ہے فحش سے اور منکر سے“ پس حکم کی شکل یوں ہوگی کہ ﴿اَلزِّنٰى فَحْشٌ وَّالْفَحْشُ حَرَامٌ فَالزِّنٰى حَرَامٌ﴾ ”زنا فحش ہے اور فحش حرام ہے لہٰذا زنا حرام ہے“

پس اصل میں فحش کی جنس حرام نکلی اس کی وجہ سے زنی کا جزئیہ حرام بن گیا۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ فحش کی علت کلیہ جن جن افعال میں پائی جاتی رہے گی اور وہ حرام ہوتے جائیں گے لیکن اس کا پتہ چلانا کہ فلاں جزئیہ میں فحش کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ہر ایک کا کام نہیں یہاں سے مجتہد کے کام کا دائرہ شروع ہوتا ہے کہ فحش کی شان کسی فعل میں ثابت کر کے اس پر حرمت کا حکم لگا دے یہ ایسے ہی مجتہد ذہنوں کا کام ہے جنہیں تشریع سے فطرۃً اور ذوقاً مناسبت ہو اور اللہ نے وہ ملکہ ان میں قدرۃً ودیعت فرمایا ہو۔

پھر فحش کے حرام ہونے کی بھی ایک علت ہے جس کی وجہ سے فحش میں حرمت آئی اور وہ اللہ کی صفت حیاء ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ سِتِّيْرٌ. ② صفت حیاء کا فطری تقاضہ ہے کہ اس کے بندوں میں فحش نمایاں نہ ہو۔ پس حکم جزئی یعنی حرمت زنی حرمت فحش سے نکلی ہے اور حرمت فحش اللہ کی صفت حیاء سے نکلی ہے۔ اس لئے زنی کے ساتھ اور بھی تمام فواحش کی حرمت کی علت کلی خدا کی ایک صفت کمال نکلی جو اس کے وجود لامحدود کا ایک حصہ ہے۔

پس جس شخص میں حیاء درجہ حال کو پہنچ چکی ہو اور وہ ظاہراً و باطناً فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ اور فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْخَلْقِ حیاء کامل کے لئے مضطر ہو چکا ہے۔ ادھر قلب میں ذوقِ اجتہاد رکھتا ہو اور دماغ میں کمال عقل تو بلاشبہ وہی اس حیاء اور اس کے تقاضے سے حرمت فحش اور اس کے تقاضے سے حرمت زنی اور پھر حرمت زنی کے تقاضے سے نمونہ و دواعی زنی کو جو ہر زمانہ میں مختلف رنگوں میں نمایاں ہوتے ہیں، پہچان کر حرمت کا حکم لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس اجتہاد سے تشریع کا یہ دائرہ کس قدر وسیع ہو جائے گا اور ایک حکم زنی سے کس قدر احکام پیدا ہو جائیں گے جو مجتہد کی دیانت و امانت اور فقہ و اجتہاد کا ثمرہ ہوں گے۔ پس ایسے احکام میں جہاں یہ علل کلیہ ظاہر نص میں موجود ہوں۔ مجتہد کا کام یہ ہے کہ علت کے اشتراک سے اس جزئیہ پر دوسرے جزئیات کو قیاس کر کے ان پر حرمت کا حکم لگا دے اور احکام کا دائرہ وسیع تر کر دے۔

1 اور کبھی نص میں صرف حکم ہی مذکور ہوتا ہے اور اس کی علت حکم میں مستور و مخفی بھی ہوتی ہے لیکن جن چیزوں پر یہ منصوص حکم لگایا جاتا ہے ان میں خلقی طور پر کچھ اوصاف ہوتے ہیں جو حکم میں موثر ہوتے ہیں۔ گویا علت حکم ان اوصاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے جس کو مجتہد کی گہری نظر ان اوصاف میں سے نکھار کر نکال لیتی ہے اور علت حکم کھل جانے پر یہ حکم جزئی بمنزلہ کلیہ کے ہو کر دوسری جزئیات میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک مجتہد کے نور اجتہاد سے یہ جزئی حکم ایک وسیع دائرہ پیدا کر لیتا ہے جس سے شریعت کی تفصیلات اور ترتیبات نمایاں ہوتی ہیں۔

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰. ② السنن لابی داؤد، کتاب الحمام، باب النہی عن التعری ج: ۱۱ ص: ۲۶. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح و ضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۹، ص: ۱۲، رقم: ۴۰۱۲.

مثلاً احادیث ربوا میں اشیاءِ ستہ ۱۔ گندم ۲۔ جو ۳۔ چھوہارہ ۴۔ نمک ۵۔ سونا ۶۔ چاندی، میں سُود لینا حرام فرمایا گیا۔ لیکن حرمت کی لِمَ اور علت کسی حدیث میں مذکورہ نہیں اس لئے مجتہدین متوجہ ہوئے کہ حکم کی حکمت یا وجہ حرمت نیز اشیاء مذکورہ کی وجہِ تخصیص کیا ہے؟ یعنی شارع نے آخر حرمت ربوٰا کے لئے انہی اشیاء کو کیوں خاص فرمایا؟ تو سوائے اصحابِ ظواہر کے جو قیاس کے منکر ہیں۔ ہر ایک نے ان اشیاء کے اوصاف میں قوت اجتہادی سے غور کر کے کچھ ایسے جامع اوصاف نکالے جو علتِ حکم بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: وہ وصف جامع قدر مع الجنس ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ: وہ طعمیت اور ثمنیت ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: وہ اقتیات وادّخار ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے وہی فرمایا جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

بہر حال ہر ایک نے ایک علتِ حکم برآمد کی جس پر حرمت ربوٰا کا حکم دائر ہے، اب جہاں جہاں جس کی نکالی ہوئی علت پائی گئی وہاں وہاں اس نے سُود کی حرمت کا حکم لگایا۔ ایسے مواقع پر مجتہد کا کام پہلے استنباط علت ہے اور پھر قیاس حکم۔

3 کبھی نص میں حکم کے ساتھ علت نہ منصوص ہوتی ہے نہ مفہوم نہ اس میں کوئی وصف ہی ایسا ہوتا، جس سے علت حکم کا استنباط کیا جاسکے۔ ایسی صورت میں مجتہد محض اپنے ذوق اجتہاد سے آگے بڑھتا ہے اور عام قواعد شرعیہ اور وضع تشریع کی مدد سے جن کے استحضار سے اسے تشریع سے مناسبت اور اس کی اجتہادی قوت کی تشکیل ہوتی ہے۔ علت کا استخراج کرتا ہے اور حکم جزئی کو اس سے مربوط سمجھ کر پھر اس علت سے مختلف ابواب کو احکام قیاس کی مدد سے ظاہر کر دیتا ہے مثلاً حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ ① ''گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو''۔ اجتہادی ذوق سے اس کا کلیہ جس سے یہ حکم ناشی ہے یہ ہے: اِفْعَلُوا الْاُمُوْرَ عَلٰى مَوْاَلِهَا یا ضَعُوا الْاَشْيَاءَ فِیْ مَحَالِهَا'' کاموں کو ڈھنگ سے کرو، بے ڈھنگے پن سے مت کرو یا ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھو''۔

ظاہر ہے کہ دروازہ ہوتے ہوئے گھروں میں دیواریں پھلانگ کر گھسنا حد درجہ بے ڈھنگا پن، بدسلیقگی، ناشائستگی اور بے محل کام کرنا ہے۔ پس اصل میں ممانعت ہوئی ناشائستگی اور بے ڈھنگے پن کی۔ چونکہ یہ بے ڈھنگا پن دیواریں توڑ کر یا پھلانگ کر داخل خانہ ہونے میں پایا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ فعل ممنوع ہوا کہ اس کی علت ممنوع تھی اور علت اس لئے ممنوع ہوئی کہ اللہ کی صفت جمال اور صفت عدل کا تقاضا ہے۔ کیونکہ جمال کے معنی حقیقی موزونیت اور کامل توازن کے ہیں اور عدل کے معنی ''وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ مَحَلِّهٖ'' ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ بے ڈھنگا پن اور بدسلیقگی اس کے خلاف ہے، اس لئے ناپسندیدہ حق ہوئی کہ'' اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ'' ② پس جس کے دماغی قویٰ میں توازن حقیقی حد کمال پر پہنچا ہوا ہو۔ گویا وہ اللہ کی اس صفتِ

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۹.

② الصحیح لمسلم: کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ، ج: ۱، ص: ۲۴۷.

جمال سے مستنیر اور اس کے اس خلق سے متخلق ہے، ادھر قلب میں وہ وہبی ملکہ اجتہاد بھی رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس کلیہ کے انکشاف کے بعد صرف اسی جزئی حکم پر قناعت نہیں کرے گا، جو آیت میں مذکور ہے بلکہ ہر باب کے ہر اس فعل کو ممنوع قرار دے گا جس میں یہ بے ڈھنگے پن کی علت پائی جائے گی۔ البتہ یہ معلوم کرنا کہ آیا اس میں یہ علت غیر موزونیت ہے بھی یا نہیں؟ نہ ہر ایک کا کام ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اس میں معتبر ہے۔

بہر حال علت کے انکشاف پر حکم جزئی کی توسیع موقوف ہے پس اگر یہ علت کلی ہوگی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مجتہد پر ایک کلیہ منکشف ہوگا جس سے بہت سی غیر معلوم جزئیات معلوم ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ مجتہد کے لئے یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہوگی کہ اس نے کلیات کیوں بنالئے کیونکہ وہ کلیات بناتا نہیں بلکہ بتاتا ہے۔ بنے ہوئے تو وہ خود ہی موجود ہیں کیونکہ علم میں جتنا خفا بڑھتا جائے گا اتنی ہی کلیت آتی جائے گی، پس مجتہد کا کمال یہ ہوگا کہ وہ ان خفیات کو نکال لے نہ یہ کہ کلیات کا پیش کرنا اس کے حق میں کوئی عیب اور نقص سمجھا جائے۔

انکشاف علوم میں نبی اور امتی کا فرق ...... ہاں! اس موقع پر یہ فرق سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام پر تو بذریعہ وحی اول علل وکلیات منکشف ہوتے ہیں اور پھر ان سے متعلقہ احکام کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی ان کے مصفی اذہان میں مقاصد وکلیات پہلے آتے ہیں اور ذرائع بعد میں کیونکہ ان کا تعلق ابتداء ہی جاذبِ حق کے ماتحت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے اور وہ ذات سے صفات کی طرف اور صفات سے افعال واحکام کی طرف آتے ہیں۔ لیکن مجتہدین اور امت کے محدثین کے روشن ضمیروں میں اول بذریعہ درس وتدریس اور روایات کے احکام جزئیہ جمع ہوتے ہیں اور پھر علم وعمل کی مزاولت۔ تزکیۂ نفوس اور تصفیۂ قلوب کی برکت اور ہمہ وقت کے ذکر وفکر اور استمرار تفکر وتدبر سے علل وکلیات کا انکشاف ہوتا ہے جس سے ان کے لئے استنباط وقیاس اور اجتہاد کا دروازہ کھلتا ہے کیونکہ امتی کا تعلق ابتداءً ذاتِ حق سے نہیں ہوتا بلکہ نبیِ وقت اور ان کی لائی ہوئی شریعت کے اتباع سے ہوتا ہے۔ یعنی پہلے احکام سامنے آتے ہیں ان پر پھر عمل کی برکت سے علوم واسرار کا انکشاف ہوتا ہے بمصداق حدیث:

مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَالَمْ يَعْلَمْ ① ”جس نے اپنے علم پر عمل کیا تو اللہ اسے ایک ایسے علم کا وارث بناتا ہے جو اب تک اس کے پاس نہ تھا“۔

اور اس پر علم وہبی سے بواسطہ اسرار وکلیات صفاتِ حق سے وابستہ ہوتے ہیں۔ تب کہیں ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ امت میں دین بحیثیت مجموعی پہلے تو مجتہدین اور راسخین فی العلم کے اذہان میں مرتب ہوتا ہے اور پھر وہ پوری ترتیب وتنظیم سے اس کی تشکیل کر کے امت کے سامنے رکھ دیتے ہیں جس سے دنیا کو دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے اور شریعت کا وہ یسر واضح ہوتا ہے جس کے جگہ جگہ قرآن وحدیث میں دعاوی موجود ہیں۔

---

① الحديث اخرجه ابو نعيم في "الحلية" وضعفه، الجزء العاشر، احمد بن ابي الحواري ج: ٣ ص: ٢٥٠.

بہر حال کسی جزئیہ کے واسطے سے اس کے کلیہ کا سراغ لگانا اور پھر اس کلیہ کے نیچے دوسری جزئیات لانا اور اس مرتب سلسلہ کی درمیانی ترتیب اور رابطہ کا پہچان لینا فقیہ کا کام ہے۔ گویا فقیہ کبھی شاہد سے غائب کی طرف جاتا ہے جبکہ واضح جزئیہ سے اس کی مستور عست نکالتا ہے اور کبھی غائب سے شاہد کی طرف آتا ہے جبکہ کلیات سے جزئیات کی طرف لوٹتا ہے اور یہ ابواب وذہاب عوام اور علماء کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، اس لئے فقیہ مجتہد ان کی نگاہوں میں شریعت ذاتی رائے سے متصرف دکھائی دیتا ہے، کوئی نا سمجھ اسے از راہِ طعن قیاسی کہتا ہے اور کوئی صاحب الرائے وغیرہ حالانکہ اس کی یہ رائے اور قیاس عقلی محض نہیں ہوتا اور نہ محض قوت فکریہ کا ثمرہ ہوتا ہے کہ اسے تصرف ذاتی کہا جائے بلکہ اس ذوقی قوت کا ثمرہ ہوتا ہے جو شریعت ہی کے علم وعمل کی مزاولت سے بطور جذبہ صادق اس کے قلب میں من اللہ تعالیٰ القاء کی جاتی ہے۔

پس وہ تصرف خود شریعت ہی کا عین شریعت میں ہوتا ہے نہ کہ اس کا۔ مگر ہاں اس کا ظہور اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسے تمام شرائع سماویہ کا ظہور محض من اللہ ہے۔ مگر ہوتا ہے نبی ہی کے لسان وقلب پر اور نہ یہ طعن کی چیز ہے نہ حیرت وتعجب کی۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد امت میں محدث بھی ہوئے ہیں جن کی خبر دی گئی، انبیاء علیہم السلام کو لسانِ شریعت میں متکلم فرمایا گیا ہے اور غیر انبیاء کو جو ان کشوف الٰہی اور علم تشریعی تک الہام کے ذریعہ پہنچائے جائیں اصطلاحِ شریعت میں مُحَدَّث کہا گیا ہے۔ بہر حال ان محدثین کے ذریعہ حکم شریعت اور اللہ کے درمیان تمام کلیاتی سلاسل منکشف ہوتے ہیں جس سے پوری شریعت کا رابطہ کلیات اور کلی الکلیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کائنات خلق کی طرح عالم امر کا یہ پھیلاؤ بھی بے جوڑ نہیں بلکہ شریعت کا ہر ہر جزئیہ اپنے نوعی اصول وعلل پھر بالائی جنس معروف ومنکر پھر فوقانی جنس کی صفت الٰہی اور پھر جنس الاجناس عدل اور اس میں بھی بالائی علم محیط اور اس سے اوپر لامحدود وجود باجود سے سے ہوتا ہوا ذات بابرکات سے مربوط ہو جاتا ہے گویا جیسے تکوین کی جزئیات زید، عمرو، بکر وغیرہ کا آخری مرجع جسم وجوہر سے گزرتا ہوا وجود حق نکلا تھا، ایسے ہی تشریع کے تمام مسائل کا سر منشاء بھی ان درمیانی انواع سے ہوتا ہوا وہی نکل آتا ہے اور تکوین وتشریع کا مبداء ومعاذ ات حق ٹھہر جاتی ہے جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ابتداء میں ہم نے نقل کیا ہے نیز واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح پوری کائنات آئینہ جمالِ حق ہے جس میں اس کا فعلی ظہور ہے اسی طرح پوری شریعت آئینہ کمالِ حق ہے جس میں اس کا قولی اور علمی ظہور ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ‌ ‌ ‌ ‌ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

نصُوصِ کتاب وسنت کا ظہر وبطن ...... پس امر ونہی کے اس طویل سلسلہ میں سے امر ونہی یا حکم منصوص کا جان لینا کمال علم نہیں بلکہ اس سلسلہ میں سے اس جزئیہ کی فوقانی علل وکلیات اور پھر ان کی فوقانی شئون وصفات سے اس کا ربط اور کیفیت ارتباط کا پتہ چلا لینا اور اس حکم کی نسبت اور کیفیت نسبت کا انکشاف کر لینا اس کی معروفیت ومنکریت کا درجہ معلوم کر کے صفت ونوعیت وجوب، فرضیت، سنیت اور استحباب وغیرہ کی تعیین کرنا کمال علم ہے جو

صرف راسخین فی العلم اور دائرۂ علم کے اولوالامر اصحاب کے حصہ میں آیا ہے۔

نصوص کے اسی سلسلہ علم وحکمت یا معانی جلیلہ اور مدلولات خفیہ کو جس طرح عرض کردہ آیت شجرہ نے کلمہ شریعت کو شجرہ سے تشبیہ دے کر پیش کیا تھا کہ جیسے شجرہ میں فروع واصول ہوتے ہیں فروع نمایاں اور اصول مستور و مبطن اور فروع میں اصول ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ گویا فروع درحقیقت مظاہر اصول ہوتے ہیں جن کی صورت میں اصول کے قویٰ ظہور کرتے ہیں۔ اسی طرح ذیل کی احادیث ظہر وبطن سے تعبیر کررہی ہیں۔ قرآنی نصوص کے بارہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ لِكُلِّ آيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَّبَطْنٌ وَّلِكُلِّ حَدٍّ مُّطَّلَعٌ ① ”ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حد کے لئے طریقہ اطلاع جداگانہ ہے۔ (یعنی مدلولِ ظاہر کے لئے علومِ عربیہ اور مدلولِ خفیہ کے لئے قوتِ فہمیہ)“۔

حدیث بالا میں ظہرِ آیت اور بطن آیت دونوں کے لئے ایک ایک مطلع کی خبر دی گئی ہے مطلع جھروکے اور جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں جیسے جھروکوں اور جھانکنے کی جگہوں سے وہ تمام چیزیں نظر آجاتی ہیں جو ان کے مقابل ہوتی ہیں اور ان کے وسیلہ سے معلوم ہوجاتی ہیں۔ ایسے ہی آیات کے ظواہر یعنی مدلولاتِ لفظی معلوم ہونے کے لئے جھروکہ عربیت ہے کہ کلام عرب کی اصناف اور اسالیب کلام پر عبور، محاورات اور محاسن کلام سے واقفیت ہو، قواعد فصاحت وبلاغت زیرِ نظر ہوں، صیغ ادا اور ان کے تعریفات پر اطلاع ہو تو ان کی مدد سے آیت قرآنی کا صحیح مفہوم سامنے آسکتا ہے بشرطیکہ ذوق سلیم بھی سازگار ہو۔

لیکن بواطنِ آیت یعنی مدلولاتِ خفیہ اور احکام سریہ جو بطون در بطون کے پردوں میں مخفی ہیں، ان کے لئے مطلع اور جھروکہ بھی علل واحکام ہیں جن پر مجتہد اپنے نورِ فہم اور ذوقِ اجتہاد سے وقوف حاصل کرتا ہے ان علل کے جھروکوں کے ذریعہ تمام وہ احکام خفیہ منکشف ہوجاتے ہیں جو ان علل کے بالمقابل ہوئے یعنی ان علل کے معلولات ہوتے ہیں خواہ یہ علل قریبہ ہوں یا علل بعیدہ یعنی بطنِ آیت قریبی ہوں جیسے علت حکم یا بعید ہوں جیسے کلیات عامہ یا ابعد ہوں جیسے صفات حق جو علل اصلی ہیں کیونکہ ثبوت حقوق اللہ یا حقوق العباد کی اصل مقتضی یہ صفات الٰہیہ ہی ہیں، جیسے خدا کی صفت ربوبیت وعظمت عبادت اور تعظیم کی خواستگار ہے، خدا کا بصیر ہونا بندہ سے حیاء اور ترک فحشاء کا مقتضی ہے اور خدا کا جمیل ہونا بندہ سے عشق ومحبت کا متقاضی ہے اور خدا کا مالک وملک ہونا بندہ سے انفاق مال اور صدقات کا مطالب ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض جو شخص بھی ان علل بعیدہ وقریبہ پر مطلع ہوگا وہی عالم

---

① مسند ابي يعلى، مسند عبدالله بن مسعودؓ ج: ١١ ص: ٢٩١، مشكاة، كتاب العلم، الفصل الاول، ج: ١، ص: ١٥٠، رقم: ٢٣٨.

اور حکیم کے لقب کا مستحق ہوگا اور اسی کو ﴿ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ ① کا حقیقی مصداق کہا جائے گا، بہر حال اس حدیث بالا میں علم کے اس مخفی مرتبہ و بطن آیت سے اور اس آیت میں حکمت سے اور آیت شجرہ میں اتفتنا راصل (جڑ) سے تعبیر کیا گیا ہے پھر جس طرح علم کا یہ عمیق مرتبہ آیات قرآنی میں پایا جاتا ہے، اسی طرح کلام نبوت میں بھی موجود ہے اور حدیث کا بھی ایک ظہر ہے اور ایک بطن کہ وہ بھی افصح البشر کا کلام ہے چنانچہ حدیث کے بارے میں خود صاحب حدیث ارشاد فرماتے ہیں: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا وَاَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ ② "ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تروتازہ فرماویں اللہ تعالیٰ اس بندے کو جو میری بات سنے اور اس کو یاد کرے اور یاد رکھے اور دوسرے کو پہنچا دے کیونکہ بعض پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے زیادہ فہیم ہوتے ہیں"۔ اس حدیث میں بعض شاگردوں کا استاذ سے افضل ہونا بیان فرمایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ صرف ظاہری معنی کے اعتبار سے شاگرد کے استاذ سے افضل وافقہ ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں اس لئے افضلیت کا معیار وہی بطن حدیث یعنی مدلولات خفیہ اور اسرار وعلل نکل آتے ہیں جن کو فقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پس علم شریعت کے دو درجات ظاہر و باطن اس حدیث سے بھی واضح ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحابہؓ کی افضلیت تمام امت پر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: كَانُوْا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرُّهَا قُلُوْبًا وَاَعْمَقُهَا عِلْمًا وَاَقَلُّهَا تَكَلُّفًا. "صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تمام امت سے افضل تھے، سب سے زیادہ ان کے قلوب پاک تھے، سب سے زیادہ ان کا علم عمیق تھا اور سب سے کم ان کا تکلف تھا"۔

اس سے واضح ہے کہ علم کا ایک درجہ عمقیت اور گہرائی بھی ہے جو علماء کے لئے معیار فضیلت ہے، چنانچہ اسی معیار سے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو افضل فرمایا گیا اور یہ درجہ بطن نص کا ہے جسے مدلولات خفیہ اور اسرار وعلل سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی علم کی بدولت علماء دقیقہ شناس اور نکتہ رس بنتے ہیں اور اسی سے ان میں فضیلت کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کو قرآن حکیم نے لفظ حکمت سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا ایک حکم ہے اور ایک اس کی اندرونی حکمت ہے۔ ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ③ "اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی"

پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خیر کثیر کو جو یہاں حکمت کا ثمرہ ظاہر کی گئی ہے تفقہ کا ثمرہ کہا گیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِى الدِّيْنِ ④ "جس کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹۔ ② السنن لابن ماجہ، المقدمۃ، باب من بلغ علما ج: ۱ ص: ۲۷۳، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح وضعیف سنن ابن ماجہ ج: ۱ ص: ۳۰۲ رقم: ۲۳۰۔

③ پارہ: ۳ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹۔ ④ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱ ص: ۱۱۹۔

کرتا ہے اسے دین کا فقہ عطاء فرماتا ہے''۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکمت اور فقہ ایک ہی چیز ہے کہ ثمرہ دونوں کا ایک ہے، پس ایک فقیہ حکیم دین ہوتا ہے اور ایک حکیم اسلام فقیہہ دین۔ بہر حال اس آیت کریمہ سے بھی علم کا یہ مستور اور خفی درجہ ثابت ہو گیا جو حکماء اسلام، فقہاء دین اور مجتہدین شرع متین کے ساتھ خاص ہے۔

علماء شریعت کے دو طبقات اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن...... ظاہر ہے کہ جب علم النص کے دو مراتب نکلے ایک ظاہر اور ایک باطن یا ایک مدلول جلی اور ایک مدلول خفی تو لامحالہ علماء نصوص کے بھی دو طبقات ہونے قدرتی تھے۔ ایک عالم جزئیات اور ایک عالم کلیات یا ایک عالم ظاہر اور ایک عالم باطن یا ایک عالم حکم اور ایک عالم حکمت۔ یعنی ایک وہ کہ جس کی نگاہیں نص کے مدلول ظاہر تک رہ جائیں اور ایک وہ کہ جس کی عمیق نگاہیں اس ظاہری جزئیہ کی تہہ تک پہنچ کر اس کلیہ کا بھی پتہ چلا لیں جس کے وسیع سلسلہ میں یہ جزئیہ بطور ایک فرد کے منسلک ہے اور ظاہر ہے کہ جس کی نظر علم کلی تک پہنچ گئی تو اس کا علم اسی ایک منصوص جزئیہ تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ اس علت جامعہ کے سبب ہزار ہا دہ جزئیات بھی اس پر کھل جانی ممکن ہوں گی جو اس منصوص جزئیہ کی طرح اس امر کلی کے عموم میں لپٹی ہوئی پڑی تھیں، اس لئے یہ عالم جزئیات اگر چہ ہزار جزئیات کا حامل ہو پھر بھی اضافاً عالم نہیں حافظ کہلائے جانے کا مستحق ہوگا، عالم اسے مجازاً ہی کہیں گے، ہاں جو شخص کلیات و جزئیات پر حاوی ہو، پھر ان کی باہمی نسبت اور کیفیت نسبت کا مدرک اور منکشف اور پھر اس نسبت سے سیکڑوں نامعلوم جزئیات کا مستخرج ہوگا وہی حقیقی معنی میں عالم کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

پس حافظ آیات و نصوص محض راوی اور محدث ہوتا ہے اور مدرک مخفیات و اسرار مجتہد اور فقیہ ہوتا ہے۔ ان دونوں طبقات کو ذیل کی حدیثوں میں یوں واضح فرمایا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ مِنَ الْھُدٰی وَالْعِلْمِ کَمَثَلِ الْغَیْثِ الْکَثِیْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَکَانَتْ مِنْھَا طَآئِفَۃٌ طَیِّبَۃٌ قَبِلَتِ الْمَآءَ وَاَنْبَتَتِ الْکَلَأَ وَالْعُشْبَ الْکَثِیْرَ. وَکَانَتْ مِنْھَا اَجَادِبُ اَمْسَکَتِ الْمَآءَ فَنَفَعَ اللّٰہُ بِھَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا. وَاَصَابَ مِنْھَا طَآئِفَۃً اُخْرٰی اِنَّمَا ھِیَ قِیْعَانٌ لَا تُمْسِکُ مَآءً وَلَا تُنْبِتُ کَلَأً، فَذٰلِکَ مَثَلُ مَنْ فَقُہَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ وَنَفَعَہٗ بِمَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ یَرْفَعْ بِذٰلِکَ رَاْسًا وَلَمْ یَقْبَلْ ھُدَی اللّٰہِ الَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِہٖ ①. ترجمہ'' حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثال اور میرے لائے ہوئے علم و ہدایت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موسلا دھار بارش زمین پر پڑی تو زمین کا ایک حصہ تو نہایت عمدہ تھا جس نے پانی کو جذب کیا اور طرح طرح کے پھول پتے اور خشک و تر اگایا اور ایک حصہ سخت تھا جس نے پانی تو جمع کر لیا (مگر گھاس

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلّم ج: ۱ ص: ۱۳۱.

وغیرہ اگا نہیں سکا) تو اللہ نے اس زمین سے لوگوں کو پانی ہی کا نفع پہنچایا کہ انہوں نے پانی پیا بھی اور سیراب بھی ہوئے اوران سے کھیتوں میں آبپاشی بھی کی اور ایک حصہ اورتھا جو بالکل چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو روک سکا ہی تھا اور نہ گھاس پھونس اگا تا ہی تھا۔ بس یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور انہیں اس علم نے نفع دیا جسے لے کر میں مبعوث ہوا ہوں اور مثال ہے ان کی جو سرے ہی سے اس انتفاع کے درجہ کو نہ پہنچ سکے اور انہوں نے خدا کی وہ ہدایت ہی قبول نہیں کی جسے لے کر میں آیا تھا''۔

اس حدیث میں علم کو بارش سے اور قلوب بنی آدم کو زمین سے تشبیہ دیتے ہوئے لوگوں کی دو اقسام بیان فرمائی گئی ہیں، ایک دین سے منتفع اور ایک غیر منتفع۔ پھر منتفع کی دو اقسام ارشاد فرمائی گئیں، منبت اور غیر منبت یعنی ایک وہ کہ جنہوں نے علم وحی حاصل کر کے اسے اپنے قلوب میں بھرا، جمع کیا اور اس سے استنباط و اجتہاد کے ذریعہ طرح طرح کے علوم ومعارف اور علل وحکم نکالے اور نکات واسرار بیان کئے پھر ان باطنی علوم کے ذریعے سیکڑوں نامعلوم مسائل امت کے سامنے لا رکھے جس سے دین منقح اور مدون ہو کر ایک قانون کی صورت میں آ گیا اور دوسرے وہ کہ جنہوں نے علم وحی حاصل کر کے اپنے سینوں میں جمع کیا اور پوری امانت داری سے بلا کم وکاست دوسروں تک پہنچا دیا تا کہ ان میں جو بالغ نظر ہو وہ اس سے پھل پھول نکال سکے۔ پہلا طبقہ فقہاء مجتہدین اور علماء راسخین کا ہوا اور دوسرا محدثین اور حفاظ کا ہوا۔ محدث اور حافظ کا کام حفظ وامانت اور بلا کم وکاست روایت ہے اور فقیہ مجتہد کا کام فہم اور تفقہ اور محققانہ درایت ہے کہ تخم علم کی آبیاری کر کے دریا کو بصورت باغ و بہار دکھلا دے۔ اسی حدیث میں فَکَانَتْ طَیِّبَۃٌ کے کلمہ سے مجتہد اور فقیہ محقق کی فضیلت بھی غیر مجتہد حافظ پر ظاہر فرما دی گئی جس کی وجہ بجز اس علم باطن کے اور کچھ نہیں۔

ان روایات سے علما کے دو طبقات بھی واضح ہوئے۔ مجتہد اور غیر مجتہد اور ساتھ ہی فقیہ مجتہد کی غیر فقیہ و مجتہد پر یا راوی محض پر صاحب درایت و تفقہ کی افضلیت بھی نمایاں ہوگئی جس کا راز اس کے سوا کچھ نہیں کہ فقیہ کلام الٰہی اور کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جامعیت اور معجزانہ بلاغت کو کھولتا ہے جو کتاب کے متعلق ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ① سے اور حدیث کے متعلق اعطیت جَوَامِعَ الْكَلِمِ ② سے واشگاف فرمائی گئی ہے گویا ایک فقیہ کے ذریعہ کلام وحی کی وجوہ اعجاز نمایاں اور فراہم ہوتی ہیں جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور مقام ختم نبوت کی حقیقت اور رفعت شان کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

پس علم اولی حفظ و روایت ہے تو علم حقیقی فقہ و درایت اور اس لئے طبقات علماء کے سلسلہ میں حافظ حدیث یا اہل حدیث یا محدث مبتدی ہے جو وحی کا مواد جمع کر کے ذخیرہ فراہم کرتا ہے اور فقیہ و مجتہد منتہی ہے جو اس ذخیرہ کی

① پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۸۹.

② الصحیح لمسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلوٰة، باب (بلا ترجمه) ج:۳ ص:۱۰۳.

تہ کی چیزیں نکال کر جسے فقہ کہتے ہیں ہمہ گیر جزئیات سے امت کی تربیت کرتا ہے اور اس مواد سے مختلف صورت کے دینی سامان بنا کر دین کو سجاتا اور امت کے حق میں اسے قابلِ استعمال بناتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں اہلِ علم کے دو طبقات...... یہ دونوں طبقات حضرات صحابہؓ میں بھی موجود تھے۔ کوئی حافظ حدیث تھا، جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، اور کوئی فقیہ و مجتہد تھا جیسے عبادلۂ اربعہ اور حضرات شیخینؓ وغیرہ پھر فقہائِ صحابہ میں بھی فرقِ مراتب تھا بعض کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم، چناں چہ صحاح کی مشہور روایت ہے:

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِاعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ قُلْتُ فَوَاللّٰهِ مَا عَلٰى اَحَدٍ جُنَاحٌ اَنْ لَّا يَطُوْفَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ فَقَالَتْ بِئْسَ مَا قُلْتَ يَا ابْنَ اُخْتِيْ اِنَّ هٰذِهٖ لَوْ كَانَتْ عَلٰى مَا اَوَّلْتَهَا كَانَتْ لَاجُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطُوْفَ بِهِمَا وَفِي الْحَدِيْثِ قَالَ الزُّهْرِيُّ فَاَخْبَرْتُ اَبَا بَكْرِ بْنَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ فَقَالَ اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ مَا كُنْتُ سَمِعْتُهٗ. ① ترجمہ "حضرت عروہ ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا: اِنَّ الصَّفَاوَ الْمَرْوَةَ الخ اور میں نے کہا کہ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص صفا و مروہ کا طواف نہ کرے تو اس کو گناہ نہ ہوگا (جیسا کہ ظاہر ترجمہ سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس پر کچھ گناہ نہیں ہے جو طواف کرے تو اس سے متبادر یہی ہے کہ طواف مباح ہے اگر نہ کرے تو بھی جائز ہے) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے بھانجے! تو نے بڑی غلط بات کہی اگر یہ آیت اس معنی کو مفید ہوتی جو تم سمجھے ہو تو عبارت یوں ہوتی لا جناح علیه ان لا یطوف بهما یعنی طواف نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن کو اس کی خبر دی تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ علم میں نہ سنا تھا"۔

اس سے واضح ہے کہ نصوص کے سمجھنے میں فہم متفاوت ہوتے ہیں کوئی ظاہر نص تک رہ جاتا ہے۔ کوئی بطن نص تک پہنچ جاتا ہے۔ چناں چہ اس آیت میں جو دقیقہ تھا باوجود یہ کہ وہ زیادہ خفی نہ تھا مگر حضرت عروہؓ اسے نہ سمجھ سکے اور حضرت عائشہ سمجھ گئیں۔ بات چونکہ لطیف تھی اس لئے ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ نے سن کر اس پر مسرت ظاہر کی اور اسے علم کہا۔ اسی تفاوتِ فہم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ: رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ بعضے پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے بھی زیادہ فہیم ہوتے ہیں"۔

مگر ساتھ ہی یہ امر بھی مخفی نہ رہنا چاہیے کہ اس تفاوتِ افہام کے سلسلہ میں زیادہ فہم کا ہر درجہ معتبر نہیں یعنی ہر فہیم مجتہد یا فقیہ نہیں کہلایا جائے گا بلکہ اس بارہ میں فہم کا صرف وہی درجہ معتبر ہوگا جو متعدیہ ہو اور محض موہبت ربانی

① الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب وجوب الصفا والمروة ج:۲ ص:۸۳۔

ہو جو بطور علم لدنی قلب مجتہد میں القاء کیا گیا ہو یعنی جس طرح کائنات خلق کے سلسلے میں نہ ہر چھوٹے بڑے فہم کا آدمی موجد ہو سکتا ہے۔ نہ ہر دور میں موجدین کی بھرمار ہوتی ہے بلکہ حق تعالیٰ کی حکمت جب بھی تمدن کے کسی خاص پہلو میں ترقی دیکھنا پسند کرتی ہے تو قرون ودُہور میں چند مخصوص دماغ منتخب کر کے ان سے ایجاد کا کام لیتی ہے اور وہ تمدن کے ان گوشوں کو آراستہ کر دیتے ہیں جن کی زیبائش کی ضرورت تھی۔

اسی طرح کائنات امر کے سلسلہ میں نہ ہر فہیم وذہین مجتہد ہو سکتا ہے نہ ہر دور میں مجتہد پیدا ہوتے ہیں بلکہ حکمتِ ربانی جب بھی دین کے کسی مخفی گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتی ہے تو خاص خاص ذہنیت کے افراد پیدا کر کے ان کے قلوب میں ذوقِ اجتہاد ڈالتی ہے اور وہ اپنے اس خاص وہبی ذوق سے تدین کے ان پہلوؤں کو واضح اور صاف کر کے اور گویا بال کی کھال نکال کر امت کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جن کے اظہار کی ضرورت تھی۔ فہم خاص یا ذوقِ اجتہاد کے اسی وہبی درجہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: عَنْ اَبِیْ جُحَیْفَۃَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِیٍّ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ هَلْ عِنْدَکُمْ مِنْ سَوْدَآءٍ فِیْ بَیْضَآءٍ لَیْسَ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ قَالَ لَا وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَأَ النَّسَمَةَ مَا عَلِمْنَا اِلَّا فَهْمًا یُعْطِیْهِ اللّٰهُ رَجُلًا فِی الْقُرْاٰنِ. ① ’’ابی جحیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کچھ ایسے مضامین لکھے ہوئے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔ قسم اس ذات کی جس نے دانے کو شگاف دیا اور جان کو پیدا کیا ہمارے پاس کوئی علم ایسا نہیں، لیکن فہم خاص ضرور ہے جو اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو قرآن میں عطاء فرمادیں‘‘۔

ملکہ اجتہاد وہبی ہے کسبی نہیں اور بعض اس کے اہل ہیں اور بعض نہیں...... اس سے جہاں کتاب اللہ میں دقیق معانی کا ثبوت ہوتا ہے جنہیں غیر معمولی ہی فہم کا آدمی سمجھ سکتا ہے وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فہم کوئی اکتسابی چیز یا فن نہیں ہے جسے محنت سے حاصل کر لیا جائے بلکہ ایک عطاءِ الٰہی ہے جو خاص خاص افراد امت کو عطاء ہوتا ہے۔ بعینہ اس طرح جیسے رسالت ونبوت کوئی فن نہیں کہ جس کا جی چاہے محنت کر کے نبی بن جائے۔ چنانچہ قرآن نے رسالت کے بارہ میں تو یہ ارشاد فرمایا کہ: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ ② ’’اللہ ہی بہتر جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھتا ہے‘‘۔ اور اس قسم کے صاحب فہم یا صاحب علم اسرار وحقائق کے بارہ میں حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ ③ ’’اور ہم نے انہیں (خضر علیہ السلام کو) اپنے پاس سے مخصوص علم دیا‘‘۔

غرض دونوں امور کو یعنی علم نبوت اور علم حقیقت کو اپنی طرف منسوب فرما کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ علم کا یہ مرتبہ اکتسابی نہیں بلکہ محض عطاءِ الٰہی اور موہبت ربانی ہے جس کے لئے من جانب اللہ ہی افراد کا انتخاب فرمایا جاتا ہے،

① الصحیح للبخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب فکاک الاسیر، ج: ۱۰، ص: ۲۵۸.

② پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۲۴. ③ پارہ ۱۵، سورۃ الکہف، الآیۃ: ۶۵.

چناں چہ ارشادِ علوی میں بِعُطِيَّةِ اللّٰهِ اور رَجُلًا سے اسی طرح اشارہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرنِ اوّل میں جب اجتہاد و قیاس اور استنباط کا دروازہ کھلا اور حضرات صحابہؓ نے نصوص نہ ہونے کی صورت میں اپنی رائے وقیاس پر عمل کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں ہر ایک کی رائے کی تصویب وتوثیق نہیں فرمائی۔ بعض کے اجتہاد کو قبول فرمایا اور بعض کے اجتہاد کو رد فرمادیا۔

گویا انہیں اجتہاد کا اہل اور مجتہد نہیں سمجھا کہ وہ اس فہم خاص کا وہ وہبی درجہ نہیں رکھتے تھے جس کی رو سے شرعیات میں صحیح حقیقت کو سمجھ کر استدلال کرسکیں، چناں چہ ابوداؤد میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خیر القرون میں ایک زخم زدہ شخص کو احتلام ہوگیا ساتھیوں نے اسے غسل کرادیا وہ غسل کرتے ہی مرگیا۔ علم ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی رائے پر ناگواری کے اظہار کے ساتھ فرمایا کہ: خدا انہیں قتل کرے اسے قتل کر ڈالا: وراس کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ تیمم کر لیتا اور زخم پر پٹی باندھ کر مسح کر لیتا اور باقی بدن دھولیتا۔ ① ان لوگوں نے بظاہر غسلِ جنابت کی آیت ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ کو تو معذور اور غیر معذور کے حق میں عام سمجھا اور آیت تیمم مریض ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى﴾ ② کو حدثِ اصغر کے ساتھ مخصوص سمجھ کر یہ فتویٰ دے دیا کہ: س جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں اوراس لئے اسے غسل کرنے پر مجبور کیا۔

یا مثلاً حضرت عدیؓ بن حاتم کے واقعہ میں جسے بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے قرآنی الفاظ خَيْطِ اَبْيَضْ خَيْطِ اَسْوَد سے سفید وسیاہ ڈورے سمجھ کر تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور جب تک ان کی سفیدی وسیاہی ممتاز نہ ہوجاتی سحر کا کھانا کھاتے رہتے حالانکہ ان ڈوروں سے مراد رات اور دن تھے، پس باوجود اہلِ زبان ہونے کے چونکہ قوتِ اجتہادیہ نہ تھی اس لئے نفسِ مرادِ قرآنی تک کے سمجھنے میں غلطی کی، چہ جائیکہ حقائق تک پہنچے۔

تو ان کی رائے اور قیاس دین میں کس طرح سند ہوسکتا تھا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برنگ مزاح اِنَّ وِسَادَتَكَ لَعَرِيْضٌ ③ "تمہارا تکیہ بڑا ہی لمبا چوڑا ہے جس کے نیچے ابیض اور اسود یعنی رات اور دن آگئے" کے جملہ سے ان کے فہم پر رد فرمادیا۔ نیز پہلے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث گزر چکی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض حاملِ فقہ خود غیر فقیہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے غیر فقیہ کی رائے بھی دین میں معتبر نہیں ہوسکتی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض کی رائے وقیاس کو رد فرمادینا اس کی واضح دلیل ہے کہ نہ ہر ایک مجتہد ہوتا ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اور قیاس پایۂ اعتبار کو پہنچ سکتی ہے جب تک کہ وہبی طور پر فہم وذوق کا وہ خاص درجہ نہ پیدا ہوجائے جو شارع کی نظر میں متعین ہے۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یہ تقسیم ہوسکتی تھی تو آج کس طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کا فہم معتبر اور حدِ اجتہاد تک پہنچا ہوا تسلیم کیا جائے۔ آج بھی یہ تقسیم لازمی ہوگی پس اسی ذوقی نور اور علم خفیات و

① السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب فی المجروح یتیمم ج:۱ ص:۱۱۱ ② پارہ:۶، سورة المائدة، الآية:۶ ③ الصحيح لمسلم، کتاب الصيام، باب بيان ان الدخول فی الصوم ج:۲ ص:۷۶۶

اسرار اور تصرف کو شرعی الفاظ میں کہیں بطن سے جیسے حدیث "لِكُلِّ اٰيَةٍ ظَهْرٌ وَّ بَطْنٌ ① میں ہے کہیں فہم سے جیسے حدیث " اِلَّا فَهْمًا يُعْطِيْهِ اللّٰهُ ② میں ہے۔ کہیں رویت ورائے سے جیسے حدیث" رَاَيْتُ فِيْ ذٰلِكَ الَّذِیْ رَاٰی عُمَرُ ③ میں ہے۔ کہیں تفقہ سے جیسے حدیث" مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ④ میں ہے۔

کہیں حکمت سے جیسے آیت "وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ ⑤ میں ہے۔ کہیں فرقان سے جیسے آیت ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ ⑥ میں ہے۔ کہیں شرح صدر سے جیسے حدیث " فَشَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِیْ لِلَّذِیْ شَرَحَ صَدْرَ عُمَرَ ⑦ میں ہے اور کہیں انبات سے جیسے حدیث " قَبِلَتِ الْمَآءَ وَاَنْبَتَتِ الْكَلَاَ ⑧ میں ہے۔

اور جامع عنوان کے ساتھ کہیں اجتہاد سے جیسے حدیث " اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَ يُصِيْبُ میں تعبیر کیا گیا ہے جس پر عام عرف شریعت میں یہی اجتہاد واستنباط کا عنوان غالب اور معروف ہوگیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اجتہاد ایک ملکہ اور فہم خاص کی ایک قوت اور علم کا ایک مخصوص وہبی درجہ ہے جس کی وساطت سے اس کے اہل نصوص کے دقیق اور خفی معانی اور احکام کے اسرار وعلل کو سمجھ کر ان پر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اور ان کے مقتضی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

علمِ باطن ہی مورثِ طمانینت ہے..... چناں چہ ظاہر ہے کہ علم کا یہ مرتبہ جس کا تعلق براہِ راست شرح صدر اور علم الٰہی سے ہے جس حد تک مورثِ طمانیت اور مسائل میں موجبِ اطمینان ہوسکتا ہے وہ اکتسابی درجہ نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ قرآن کے بارہ میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جو مسلمہ فقیہ اور مجتہد ہیں استدلالی علم سے وہ طمانیت نہ ہوئی جو اس حالی علم سے میسر آئی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ دقیقہ کافی وضاحت کے ساتھ حل ہوتا ہے۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ اَرْسَلَ اِلَيَّ اَبُوْبَكْرٍ مَقْتَلَ اَهْلِ الْيَمَامَةِ فَاِذَا عُمَرُ جَالِسٌ عِنْدَهٗ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّ عُمَرَ جَآءَنِیْ فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِقُرَّآءِ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ يَّسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّآءِ فِیْ كُلِّ الْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبُ مِنَ الْقُرْاٰنِ كَثِيْرٌ وَاِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ فَقُلْتُ وَكَيْفَ اَفْعَلُ مَالَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عُمَرُ وَاللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ يُرَاجِعُنِیْ فِیْ ذٰلِكَ حَتّٰی شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِیْ لِلَّذِیْ شَرَحَ لَهٗ صَدْرَ عُمَرَ وَرَاَيْتُ فِیْ ذٰلِكَ الَّذِیْ رَاٰی. ⑨ ترجمہ" حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بن ثابت کی روایت ہے کہ

---

① مسند ابی یعلی، مسند عبداللہ بن مسعودؓ ج: ۱۰ ص: ۱۱۲۔ مشکاۃ، کتاب العلم، الفصل الاول، ج: ۱ ص: ۴۸۳ رقم: ۲۱۳۳۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب الجهاد و السیر، باب فکاک الاسیر، ج: ۱۰، ص: ۲۵۸۔
③ الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، ج: ۱۵، ص: ۳۸۵۔ ④ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱، ص: ۱۱۹۔ ⑤ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۹۔
⑥ پارہ: ۹، سورۃ: الانفال، الآیۃ: ۲۹۔ ⑦ الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، باب یستحب للکاتب ان یکون امینا عاقلا، ج: ۲۲، ص: ۱۲۷۔ ⑧ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم، ج: ۱، ص: ۱۳۰۔
⑨ الصحیح للبخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قوله لقد جاء کم رسول من انفسکم... ج: ۱۴ ص: ۲۵۲۔

زمانہ جنگ یمامہ میں حضرت ابوبکرؓ نے میرے بلانے کے لئے آدمی بھیجا وہاں جا کر دیکھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ بھی بیٹھے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے قصہ بیان فرمایا کہ: حضرت عمرؓ نے میرے پاس آ کر یہ صلاح دی کہ واقعہ یمامہ میں بہت سے قراء قرآن کام آ گئے۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر اسی طرح سب جگہ یہ لوگ کام آتے رہے تو قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا امر فرما دیں۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کس طرح کروں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا، واللہ یہ کام خیر محض ہے اور برابر اسی کو بار بار کہتے رہے حتی کہ جس باب میں ان کو شرح صدر اور اطمینان تھا مجھ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی بات مجھے محسوس ہوئی جو انہیں ہوئی تھی"۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اولاً جمع قرآن کے بدعت ہونے کا خیال تھا احادیث ذم بدعت ان کے سامنے تھیں اس لئے انہیں جمع قرآن میں تردد تھا۔ مگر جب استدلال سے گزر کر ان کے قلب میں باطنی علم منکشف ہوا کہ جمع قرآن کا یہ جزئیہ تحفظ دین کے عام کلیہ کے ماتحت ہے اور ذم بدعت کے ماتحت نہیں آ سکتا۔ تو شرح صدر کے ساتھ اس فعل کو کر گزرے اور آج تک دنیائے اسلام ان کے اس احسان عظیم سے مستفید ہو رہی ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ مجتہد کے لئے علم کا یہ خفی درجہ بعض اوقات جلی درجہ سے بھی زیادہ موجب طمانیت ہوتا ہے اور وہی اطمینانی کیفیات اس کے متبع افراد میں سرایت کر جاتی ہیں جبکہ وہ اس کی اتباع کریں۔

بہر حال اتنا واضح ہو گیا کہ امت کے لئے ایک درجہ علم خفی کا بھی پیغمبر نے وارثت میں چھوڑا ہے جو کلیات سے استخراج مسائل اور جزئیات سے استنباط دلائل کا ہے اور اس کے افراد مخصوص ہیں، نیز وہ ایسے مواقع کے لئے ہے جہاں یا نص ہی موجود نہ ہو یا ہو مگر معانی مختلفہ کو محتمل ہو یا متعین المحمل ہو مگر یہ محتمل دقیق اور غامض ہو یا محتمل بھی واضح ہو مگر اس کی علت مستور ہو۔ جس کا انکشاف ہر فہم نہ کر سکتا ہو تو ایسے مواقع میں بجز اجتہاد و استنباط کے چارہ کار نہیں اور ضرورت تھی کہ امت کو اس فہم خاص کا رتبہ بھی عنایت ہو جو در حقیقت تشریع ہی کا ایک دقیق حصہ ہے اور جو علماء کے لئے عُلَمَاءُ أُمَّتِیْ كَأَنْبِيَاءِ بَنِیْ إِسْرَائِيلَ کے معزز اور بابرکت خطاب کے ماتحت ثابت کرتا ہے کہ علماء امت انبیاء بنی اسرائیل کے سے کام کریں گے۔

اگر تبلیغ دین اور تربیت خلق کریں گے تو ایک ایک عالم خطوں کو رنگ دے گا اور ہزاروں کو دائرہ اسلام میں داخل کر دے گا ان میں دینی رنگ پیدا کر دے گا تعلیم مسائل پر آئیں گے تو انبیاء جو امور وحی سے کہتے تھے یہ بالہام وحی، وحی سے استنباط کر کے کہیں گے یعنی احکام تکلیفیہ کی طرح احکام وضعیہ امت کے سامنے لا رکھیں گے اور یہ صورت بغیر اجتہاد و قیاس کے نہیں ہو سکتی تھی اس لئے امت میں یہ علم غامض القاء کیا گیا اور قرن اول سے شروع ہو گیا تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں اہلِ اجتہاد...... چناں چہ جب ان لوگوں کا اجتہاد سامنے آیا جو اس کے اہل تھے اور تشریع کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اجتہاد و استنباط کی تحسین فرمائی۔ چناں چہ

نص سامنے نہ ہونے کی صورت میں عمومات اور کلیات سے استدلال کرتے ہوئے جو رائے پر عمل کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی اس کی مثال یہ ہے کہ: عَنْ طَارِقٍ اَنَّ رَجُلًا اَجْنَبَ فَلَمْ يُصَلِّ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ لَهُ ذٰلِكَ فَقَالَ اَصَبْتَ. فَاَجْنَبَ اٰخَرُ فَتَيَمَّمَ وَصَلّٰى فَاَتَاهُ فَقَالَ نَحْوَمَا قَالَ لِلْاٰخَرِ يَعْنِيْ اَصَبْتَ. ''حضرت طارق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو نہانے کی حاجت ہوگئی اس نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا اور اس قصہ کا ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے ٹھیک کیا۔ پھر ایک دوسرے شخص کو اسی طرح نہانے کی حاجت ہوئی اس نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ویسی ہی بات فرمائی۔ جو ایک شخص سے فرما چکے تھے یعنی تو نے بھی ٹھیک کیا''۔

اس حدیث سے اجتہاد و قیاس کا جواز صاف ظاہر ہے کیونکہ اگر ان کو نص کی اطلاع ہوتی تو پھر بعد عمل کے سوال کرنے کی ضرورت نہ تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک نے اپنے اپنے قیاس و اجتہاد پر عمل کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصویب و تحسین فرمائی اور ظاہر ہے کہ شارع علیہ السلام کی تقریر یعنی کسی چیز کو سن کر رد نہ فرمانا بلکہ صراحتًا اس کی تصویب فرما دینا اس کی مشروعیت کی واضح دلیل ہے اس لئے نصِ صریح نہ ہونے کی صورت میں جواز اجتہاد و قیاس میں کوئی شبہ نہ رہا۔

اسی طرح بروایت ابوداؤد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوہ ذات السلاسل کے موقع پر سردیوں کی ایک رات میں جان کے خوف سے بحالتِ جنابت، بجائے غسل کے تیمم سے نماز پڑھا دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استفسار پر عرض کیا کہ: میں نے اللہ کے اس قول پر عمل کیا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ. ''اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو''۔ حضور نے مسکرا کر سکوت اختیار فرمایا۔ ① جس سے واضح ہے کہ نصِ صریح نہ ہونے کی صورت میں رائے پر عمل کرنا عمومات و کلیات سے استدلال کرنا یعنی اجتہاد سے کام لینا خلاف حدیث نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکیر فرماتے کہ تم لوگ دین میں رائے اور قیاس کو کیوں دخل دیتے ہو۔ یا نص تو موجود ہو مگر محتمل الوجوہ ہو تو اجتہاد سے کسی ایک وجہ کا تعین کر کے اس پر عمل کرنا بھی خلاف نص یا خلاف حدیث نہیں۔ چناں چہ حدیث ذیل اس پر شاہد ہے۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْاَحْزَابِ لَا يُصَلِّيَنَّ اَحَدٌ الْعَصْرَ اِلَّا فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ فَاَدْرَكَ بَعْضُهُمُ الْعَصْرَ فِي الطَّرِيْقِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا نُصَلِّيْ حَتّٰى نَاْتِيَهَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلْ نُصَلِّيْ لَمْ يُرِدْ ذٰلِكَ فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُعَنِّفْ وَاحِدًا. ② ''حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احزاب کے موقع پر صحابہؓ

① الصحیح للبخاری، کتاب التیمم، باب اذا خاف الجنب علی نفسه المرض، ج: ۲، ص: ۲۷۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الجمعة، باب صلوة الطالب والمطلوب راكبا، ج: ۳، ص: ۴۹۹۔

سے فرمایا کہ: عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچنے سے ادھر کوئی نہ پڑھے بعض صحابہ کو راہ میں عصر کا وقت آ گیا تو باہم رائے مختلف ہوئی۔ بعض نے کہا کہ: ہم نماز پڑھیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب تاخیر صلوٰۃ نہیں تھا بلکہ مقصود تاکید تھی کہ عصر سے قبل وہاں پہنچنے کی کوشش کرو، پھر یہ قصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر بھی ملامت نہیں فرمائی''۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ بعض نے اپنی قوت اجتہادیہ سے قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی غرض کو سمجھ کر جو کہ نص کی ایک محتمل وجہ تھی نماز پڑھ لی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر ملامت نہیں فرمائی کہ تم نے حدیث کے ظاہر الفاظ کے خلاف کیوں عمل کیا؟ یعنی ان کو عمل بالحدیث کا تارک قرار نہیں دیا یا نص صریح بھی موجود ہو اور اس کا محمل بھی متعین ہو مگر مجتہد اس حکم کو کسی علت سے معلول سمجھ کر علت باطنیہ پر عمل کرے اور ظاہر نص کو ترک کر دے تو یہ بھی خلاف حدیث نہیں۔

چناں چہ حدیث انسؓ اس پر شاہد عدل ہے۔ عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَجُلًا كَانَ يُتَّهَمُ بِاُمِّ وَلَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِعَلِيٍّ: اِذْهَبْ فَاضْرِبْ عُنُقَهُ فَاَتَاهُ فَاِذَا هُوَ فِيْ رَكِيٍّ يَتَبَرَّدُ فَقَالَ اُخْرُجْ فَنَاوَلَهُ يَدَهُ فَاَخْرَجَهُ فَاِذَا هُوَ مَجْبُوْبٌ لَيْسَ لَهُ ذَكَرٌ فَكَفَّ عَنْهُ وَاَخْبَرَ بِهِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَسَّنَ فِعْلَهُ (زَادَ فِيْ رِوَايَةٍ) وَقَالَ يَرَى الشَّاهِدُ مَالَا يَرَى الْغَائِبُ ① ''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لونڈی ام ولد کے ساتھ متہم تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ: جاؤ اس کی گردن ماردو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس آئے تو اس کو دیکھا کہ وہ کنویں میں اترا ہوا بدن ٹھنڈا کر رہا ہے۔ آپؓ نے فرمایا باہر نکل۔ اس نے اپنا ہاتھ دے دیا۔ آپؓ نے اس کو نکالا تو وہ مقطوع الذکر نظر پڑا تھا۔ آپؓ اس کی سزا سے رک گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے اس فعل کو مستحسن فرمایا (اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: حاضر ایسی بات دیکھتا ہے جو غائب نہیں دیکھتا''۔

ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اور صاف حکم موجود تھا مگر حضرت علیؓ نے اپنے ذوق اجتہاد سے اسے ایک علت سے معلول سمجھا اور جب علت کا وجود نہ پایا تو حکم سزا بھی جاری نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا یہ عمل ظاہراً اطلاق حدیث کیخلاف تھا۔ اس سے واضح ہے کہ حدیث کی لِم اور علت حکم سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا اور الفاظ حدیث کے ظاہر کو ترک کر دینا خلاف حدیث نہیں بلکہ وہ عمل بالحدیث ہے گو بطن حدیث پر ہے جو خود حدیث سے ثابت شدہ چیز ہے، اس کی نظیر یہ بھی ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو بشارت دی کہ جو بھی صدق دل سے کلمہ طیبہ پڑھے گا وہ نار جہنم پر حرام ہو جائے گا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں لوگوں کو اس کی بشارت عام نہ دے دوں؟ فرمایا نہیں، لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں

① الصحيح لمسلم، كتاب التوبة، باب براءة حرم النبي صلى الله عليه وسلم من الريبة، ج:١٣، ص:٣٣٩.

گے۔(اور عمل چھوڑ دیں گے۔)

اس ممانعت تبشیر میں کسی زمانہ کی قید نہ تھی مگر حضرت معاذؓ نے اپنے نورِ اجتہاد سے دوسرے دلائل کلیہ پر نظر کر کے اس ممانعت کو اس زمانہ کے ساتھ مقید سمجھا جس میں اس پر بھروسہ کر بیٹھنے کا احتمال باقی رہے اور وفات کے وقت جب کہ وہ زمانہ ان کے زعم میں باقی نہیں رہا تھا، اس بشارت کا اعلان عام کر دیا۔

یا مثلاً (بروایتِ مسلم) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: ایک لونڈی کو جس نے بدکاری کی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درے مارنے کے لئے مجھے حکم دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ زچہ تھی۔ اس لئے درے نہ لگائے کہ کہیں مر نہ جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کی تحسین فرمائی۔ اس سے واضح ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نصوص کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کو مذموم نہ جانتے تھے ورنہ ظواہر احکام کو مقصود جان کر ان باطنی علل اور علوم کلیہ سے بحث ہی نہ فرماتے۔ چہ جائیکہ ان بواطن پر عمل کرتے۔ یہ نظائر اس پر شاہدِ عدل ہیں کہ اگر مجتہد اپنی قوتِ اجتہادیہ سے کسی حدیث کے مدلول ظاہری کے خلاف یعنی اس سے بالاتر کوئی دقیق معنی سمجھ جائے جس تک عوام علماء کی رسائی نہ ہو تو اس پر عمل جائز ہے۔

اُمت میں اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہے...... بہرحال جب یہ واضح ہو گیا ہے کہ دین میں نص نہ ہونے یا متعین الوجہ نہ ہونے یا غیر معلول نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد و قیاس جائز ہے اور اس کے لئے افرادِ من اللہ منتخب اور مخصوص ہوتے ہیں۔ ہر ایک اس کا اہل نہیں اور وہ بتصدیق پیغمبر حجت شرعیہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیر اہلِ اجتہاد یعنی غیر مجتہد کے لئے بجز اس کے چارہ کار ہی کیا ہے کہ اس اجتہاد کی متابعت اور پیروی کرے اور جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کا اتباع کرے خود ان مخفی دلائل اور علل نہیں تک پہنچ سکتا۔ تو دانایانِ اسرار و علل کے سامنے جھک جائے، کیونکہ مراتب علم کے دو ہی ہیں یا خود سمجھنا یا فہمیدہ لوگوں کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ یہی وہ دو مراتب ہیں کسی واسطہ کے قرآن نے ہدایت کے رکھے ہیں۔ قیامت کے دن کفار اسی پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ خود اپنی عقل سے سمجھا اور نہ عقل والوں کی سنی۔ ﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ﴾ ① ''اور کہیں [illegible] ہائے کاش ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے''۔

بس یہی درجہ سمع و طاعت [illegible] کے حق میں ایک لاعلم یا ایک محقق کے سامنے ایک غیر محقق عمل میں لاتا ہے، تقلید کہلاتا ہے، جو فی نفسہٖ بھی اور بضرورت اجتہاد بھی جائز اور معقول ہے ورنہ اگر عوام اور غیر اہلِ اجتہاد کے حق میں اب بھی اہلِ اجتہاد کی تقلید جائز نہ ہو تو اجتہاد کا حجت شرعیہ ہونا لغو ہو جائے اور اس آیت کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہیں کہ: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ② ''اگر تم لاعلم ہو تو علم والوں سے سوال کرو''۔ اور اس حدیث کا کوئی مصداق ہی باقی نہ رہے کہ اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِیِّ السُّؤَالُ ③ ''کیا عاجز کی شفاء سوال نہیں ہے''؟

① پارہ: ۲۹ سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۰۔ ② پارہ: ۱۷ سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۷۔

③ السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی المجروح یتیمم ج: ۱ ص: ۲۱۲۔

پس اگر اجتہاد مشخص حدیث شرعی چیز ہے اور غیر مجتہد شخص حدیث دنیا میں موجود ہیں کہ قرنِ اوّل تک میں موجود تھے۔ ادھر غیر مجتہد کا علاج وشفاء جس حدیث سوال وتعمیل ہے تو غیر مجتہد کے لئے اجتہادی مسائل میں بجز مجتہد کی تقلید کے کوئی دوسرا چارہ کار ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے تقلید کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مستقلاً موجود ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ کَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ۔ ① ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: جس شخص کو بے تحقیق کوئی فتویٰ دے دے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے کو ہوگا''۔ ظاہر ہے کہ اگر تقلید نہ جائز ہوتی اور کسی کے فتویٰ پر بدونِ معرفت دلیل کے عمل جائز نہ ہوتا جو حاصل ہے تقلید کا تو گناہگار ہونے میں مفتی ہی کی کیا تخصیص تھی بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ دینے کا گناہ ہوتا اسی طرح سائل کو دلیل تحقیق نہ کرنے اور بلا تحقیق عمل کرنے کا گناہ ہوتا۔ پس جبکہ شارع علیہ السلام نے سائل کو باوجود تحقیق دلیل نہ کرنے کے عاصی نہیں ٹھہرایا تو جوازِ تقلید بلا شبہ ثابت ہوگیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی تقلید رائج تھی...... چنانچہ حضرات صحابہؓ میں جیسے اجتہاد رائج تھا ویسے ہی تقلید رائج تھی۔ یعنی غیر مجتہد، مجتہد کے فتویٰ پر بلا تحقیق دلیل محض اس حسنِ ظن کی بناء پر عمل کرتا تھا کہ وہ مجتہد ہے اور بلا دلیل فتویٰ نہیں دے رہا ہے۔ عَنْ سَالِمٍ سُئِلَ ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنْ رَجُلٍ یَکُوْنُ لَهُ الدَّیْنُ عَلٰی رَجُلٍ اِلٰی اَجَلٍ فَیَضَعُ عَنْهُ صَاحِبُ الْحَقِّ لِیُعَجِّلَ الدَّیْنَ فَکَرِهَ ذٰلِکَ وَنَهٰی عَنْهُ۔ ② ''حضرت سالم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے شخص پر کچھ دین میعادی واجب ہے اور صاحبِ حق اس میں سے کسی قدر اس شرط سے معاف کرتا ہے کہ وہ قبل از میعاد اس کا دین دے دے۔ آپ نے اس کو ناپسند کیا اور منع فرمایا۔ چونکہ اس مسئلہ جزئیہ میں کوئی حدیث مرفوع صریح منقول نہیں۔ اس لئے یہ حضرت ابن عمرؓ کا قیاس ہے اور چونکہ سائل نے دلیل نہیں پوچھی اس لئے اس کا قبول کرنا تقلید ہے نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا دلیل بیان نہ کرنا خود تقلید کو جائز رکھنا ہے، اس لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے قیاس وتقلید دونوں کا جواز ثابت ہوگیا۔

اسی طرح بروایت مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی کو غلہ اس شرط پر قرض دے دیا کہ وہ شخص اس کو دوسرے شہر میں ادا کردے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند فرما کر منع فرمادیا اور فرمایا کہ بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟ چونکہ اس بارہ میں بھی کوئی صریح حدیث مرفوع مروی نہیں لہٰذا حضرت عمرؓ کا یہ جواب قیاس سے تھا اور چونکہ جواب کا ماخذ نہ آپؓ نے بیان فرمایا نہ سائل نے پوچھا بدونِ دریافت دلیل قبول کرلیا تو یہی تقلید تھی۔

پس جوازِ قیاس وتقلید حضرت عمرؓ کے فعل سے بھی ثابت ہوا۔ اسی طرح بروایت مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو

① السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا ج:١٠ ص:١٤٨۔ ② جامع الاصول ج:١ ص:٣٠٦۔

ایوب انصاری رضی اللہ عنہ حج کے لئے نکلے۔ راستہ میں اونٹنیاں گم ہو گئیں اور حج کا وقت نکل جانے پر پہنچے۔ حضرت عمرؓ سے سارا قصہ بیان کر کے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ افعال عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو اور اگلے سال حج کر کے میسر شدہ قربانی دے دو۔

اس سے واضح ہے کہ جو صحابہؓ اجتہاد نہ کر سکتے تھے وہ مجتہدین صحابہؓ سے استفسار کر کے اس کی تقلید کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے حضرت عمرؓ سے صرف حکم سن لیا اور دلیل کی تحقیق نہیں کی جو تقلید کا حاصل ہے۔ یہی صورت تابعین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے جیسا کہ کتب احادیث سے مزاولت رکھنے والے جانتے ہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ قرونِ خیر میں اجتہاد و تقلید دونوں رائج تھے اور دونوں کے افراد و اشخاص الگ الگ تھے۔ یہ اگر اس کی دلیل ہے کہ ہر کس و ناکس کے لئے اجتہاد جائز نہیں تو اس کی بھی دلیل ہے کہ ان تمام کس و ناکس کے لئے تقلید کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں۔

اجتہاد و تقلید کی حدود...... نیز اس کی بھی واضح دلیل ہے کہ شریعت نے امت میں بیک وقت اجتہاد و تقلید دونوں کی ضرورت محسوس کی جس سے واضح ہے کہ شریعت نہ تو اجتہاد بلا تقلید چاہتی ہے اور نہ تقلید بلا اجتہاد اور یہی اس کی جامعیت اور عدل و اعتدال کا مقتضیٰ بھی ہے ورنہ اجتہاد بلا تقلید افراط تھا اور تقلید بلا اجتہاد تفریط تھی۔ عدل کا مقتضیٰ یہی تھا کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں پھر ساتھ ہی اس اجتہاد و تقلید کا شریعت ایک نظم بھی چاہتی ہے کہ مقلدین کی اکثریت مجتہدین کی مطیع رہ کر اپنے دین کی حفاظت کرے جس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت اسلام چونکہ کمال اعتدال اور جامعیت کی شان رکھتی ہے اور اسی لئے یہ امت بھی اعدل الامم اور جامع اقوام ہے جس کا لقب ہی قرآنی زبان میں امت وسط ہے۔ اس لئے منشاء شریعت یہ ہے کہ امت میں ہر ایک کام جامعیت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں ہو اور یہ اجتماعیت نظام لئے ہوئے ہو۔ خواہ وہ نظام سیاسی ہو۔ خواہ دینی اس انداز کا ہو کہ نہ اس میں تشتت اور پراگندگی ہو جو بدنظمی ہے اور نہ جمود و استبداد ہو جو اجتماعیت اور جمہوریت کے منافی ہے۔ اس لئے اس نے امت کے سیاسی اور دینی دونوں نظامات میں یہی معتدل صورت قائم کی ہے۔ مثلاً امت کے سیاسی نظام میں ایک طرف تو امارت رکھی تاکہ قوم میں فوضویت اور لامرکزیت نہ آنے پائے جو پراگندگی اور بدنظمی کی روح ہے۔ اس سے تو حکومت میں شخصیت قائم ہوئی۔

ادھر اس امارت کے لئے شوریٰ لازم قرار دیا تاکہ امیر میں استبداد بھی نہ پیدا ہو سکے اور قوم کے اجتماعی فکر کے قویٰ معطل اور بے کار نہ ہوں۔ اس صورت سے قوم میں جمہوریت باقی رہے۔ پس اسلامی امارت میں نہ تو ایسی شخصی حکومت ہے جس میں جمہور کی کوئی مداخلت نہ ہو اور نہ ایسی جمہوریت ہے کہ وہ لامرکزیت کی حد تک پہنچ کر امیر کو معطل اور بے کار بنا دے اور عوام بھی اس پر حکومت کرنے لگیں۔

پس امیر کی شخصیت اور آمریت سے تو قوم کی طوائف الملوکی اور پراگندگی دفع کی اور قوم کی شورائی تشکیل

سے امیر کے استبداد کی روک تھام کر دی۔ اس طرح شخصیت اور جمہوریت دونوں کو ایک معتدل درجہ کے ساتھ امت کے سیاسی نظام میں شامل کر دیا گیا یعنی دونوں کے مضر پہلوؤں کو نکال پھینکا اور دونوں کے نافع پہلو اختیار کر لئے گئے جو کمال اعتدال ہے۔ ٹھیک اسی طرح امت کے دینی نظام میں شریعت نے نص نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عام افکار کو اس درجہ آزاد چھوڑا کہ امت کا ہر شخص مجتہد ہو اور کتاب وسنت میں ہر کس وناکس کے آراء وقیاسات کا دروازہ کھل جائے اور نہ اس امت کو ایسی تقلید جامد میں چھوڑا کہ اس کے قوائے فکر واجتہاد سرے ہی سے معطل ہو جائیں بلکہ ایک طرف تو جنس اجتہاد کو باقی رکھا جس کی انواع حسب اقتضاء زمانہ آتی اور ختم ہوتی رہیں گی تاکہ امت کے قوائے فکر وتدبیر ست نہ ہونے پائیں۔

اور ایک طرف تقلید کو قائم رکھا تاکہ عامی اور ناواقف اپنی اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر سارے دین ہی کو آراء وقیاسات کا مجموعہ نہ بنا دے اور اس طرح دین میں تشتت و پراگندگی کے جراثیم نہ پھیل جائیں پس امت کے علمی تشتت کو تقلیدی سمع وطاعت سے رفع کر دیا اور تقلیدی جمود کو شان اجتہاد وتحقیق سے دفع کیا اس طرح اجتہاد و تقلید کے مضر پہلوؤں سے بچا کر امت کو درمیان کے معتدل نقطہ پر قائم فرما دیا جس میں نافع پہلو سب قائم ہیں۔

چناں چہ امت اگر مقلد بھی ہے تو وہ اس تقلید میں محقق بھی ہے اور اگر وہ اجتہادی فکر بھی رکھتی ہے تو اس میں اسوہ سلف کی مقلد بھی۔ غرض اس اعتدالی درجہ کا یہ اثر ہے کہ ان کے اجتہاد میں تقلید اور تقلید میں شان تحقیق نمایاں ہے۔

اس لئے نہ تو تقلید کو ایک مستقل شریعت بنا کر اس سے جنس اجتہاد کی تردید کوئی موزوں فعل ہو سکتا ہے اور نہ اجتہاد کو ایک مسلک عام مان کر اس سے تقلید پر رد وانکار کوئی خوبی قرار دی جا سکتی ہے۔

اجتہاد کی ایک نوع ختم ہو چکی ہے اور اس کی واضح دلیل ...... باقی یہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اجتہاد کی وہ نوع جو استنباط علل اور اجتہاد فی الدین سے تعلق رکھتی ہے آج اس لئے نہیں پائی جاتی کہ اس کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ ائمہ نے اسے اس اس حد تک مکمل کر دیا ہے کہ آئندہ اس سے نفع اٹھانے کی صورت تو باقی رہ جاتی ہے لیکن اس میں مزید تلاش وتحقیق کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی اصول ہے کہ جو مقصد دنیا میں مکمل ہو جاتا ہے اس کی متعلقہ قوت بھی ختم کر دی جاتی ہے۔ دین کی بنیادیں دو ہی ستونوں پر قائم تھیں۔ روایت اور درایت، روایت کا تعلق حافظہ سے ہے اور درایت کا تعلق فہم سے۔ اوائل اسلام میں جب کہ اسلام کا روایتی حصہ مکمل ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے محدثین کو جو مخصوص حافظہ عطاء فرمایا کہ آج اسے بجز کرامت اور خرق عادت کے کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، ایک ایک محدث کو لاکھوں کی تعداد میں احادیث یاد ہوتی تھیں اور نہ صرف متون وحدیث بلکہ مع اسانید و رجال اور نہ صرف رجال کے اسماء بلکہ ان کی سوانح اور صفات بھی ازبر ہوتی تھیں جیسا کہ کتب طبقات سے واضح ہے [illegible] سینوں سے وہ سفینے مدون ہوئے جو آج کتب حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

مگر جب دین سینوں کے ذریعہ سے سفینوں میں منضبط ہو گیا اور محض حفظ پر مدار نہ رہا تو قوت حافظہ قدرتی عوامل

کے ماتحت گھٹنی شروع ہوئی اور آج اس حد پر آ گئی کہ اگر ہم روزانہ کی معاشرتی زندگی میں نوٹ بک اور ڈائری جیبوں میں نہ رکھیں تو کاروبار صفر ہو جائے۔ پس جس حد تک اس محیر العقول قوت حافظہ کا کام پورا ہو گیا جو اس امت کو بطور اعجاز کے دی گئی تھی تو قوت کی وہ نوع بھی قدرتی طور پر ختم ہو گئی۔ گو جنس حافظہ آج بھی موجود ہے جس کی باقی ماندہ نوعیت مناسب وقت کام کر رہی ہے۔

دور روایت کے بعد اسی طرح جب کہ اسلام کا درایتی حصہ مکمل ہونا شروع ہوا اور روایات سے دین کو استنباط کر کے مبوب اور مفصل کرنے کی نوبت آئی تو حق تعالیٰ نے اس امت میں وہ ارباب درایت وفقہ اور ائمہ اجتہاد پیدا کئے کہ ان کے مصفّٰی اذہان کا سرعت انتقال ونفوذ ان کے حیرتناک استنباطات اور ان کے فقہ نفس کے عجائبات بھی خرق عادت ہی کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف مسائل ہی مستنبط کئے بلکہ وجوہ استنباط بھی علیٰ وجہ البصیرت ظاہر کیں۔ کیفیت استنباط پر بھی روشنی ڈالی۔ پوری شریعت کی جزئیات کا ان کی کلیات سے ارتباط بھی معلوم کیا اور اس ربط کے واسطہ سے ہزاروں نئے مسائل کلیات سے اور ہزار ہا علل کلیہ جزئیات سے استخراج کیں جس سے پوری شریعت شاخ در شاخ ہو کر ایک ہی شجرہ اور متصل واحد شئے دکھائی دینے لگی اور یہ سب کچھ اس شان سے ہوا کہ ارباب فہم آج ان حضرات کی رسائی فہم پر انگشت بدنداں ہیں اور اسے ان کا کوئی اکتسابی کارنامہ نہیں بلکہ محض وہبی عمل کہنے پر مجبور ہیں جس کے لئے خدا نے انہیں منتخب کر لیا تھا۔

جب دین کا یہ فقہائی مکمل صورت میں آ گیا۔ امہات مسائل حقیقی تنقیح کے بعد باب وار مرتب ہو گئے اور ائمہ فقہ کے سینوں سے نکل کر سفینوں میں مدون بھی ہو گئے تو ان ہی قدرتی عوامل کے ماتحت وہ خاص قوت فہم بھی کم ہونی شروع ہو گئی کہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور رفتہ رفتہ زمانہ آج اس درجہ پر پہنچ گیا کہ جدید استنباط تو بجائے خود ہے مستنبط شدہ مسائل کے خفی رشتہ کو جو منصوص کلیات سے قائم ہے بلکہ جزئیات وکلیات کے سلسلہ کے تسلسل اور صورت انسلاک کو بھی پوری طرح سمجھنے کا فہم عامہ خلائق میں باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے اجتہاد کی وہ نوع بھی باقی نہیں جس کا تعلق استخراج علل واستنباط مسائل سے تھا کہ یہ ضرورت زمانہ نے پوری کر کے ختم کر دی اور اس بناء پر وہ قوت بھی مضمحل ہو گئی۔

ختم شدہ اجتہاد کے استعمال کے نتائج بد......اس فقدان قوت کے بعد بھی اگر مدعیان زمانہ کو اجتہاد کی اس نوع میں آزادی مل جائے جس کے لئے لوگ تڑپتے ہیں تو قطع نظر استنباط مسائل کی ضرورت وعدم ضرورت کے فساد مذاق غلبہ ہوا وہوس اور جذبہ خود مختاری کے ماتحت ہر ایک فاضل ہر ایک گریجویٹ ہر ایک وکیل ہر ایک بیرسٹر ہر ایک ایڈیٹر جو چند پیسوں میں لوگوں کا کچھ وقت خرید سکتا ہے بلکہ ہر ایک خواندہ وناخواندہ مجتہد عصر ہوگا اور اجتہادات کے ایسے ایسے انوکھے نمونے دنیا کے سامنے آئیں گے کہ اسلام کی اصل شکل پہچانی بھی مشکل ہو جائے گی۔

چناں چہ حسب مضمون ''الاقتصاد'' ایک شخص کہے گا کہ جس طرح سابق مجتہدین نے نصوص کو کسی علت

سے معلول سمجھا اور بسا اوقات ظاہر نص کو چھوڑ کر باطنی علت پر عمل کیا اور کرلیا مجھے بھی اس کا حق ہے لہٰذا میرے نزدیک مثلاً وضو کا حکم معلل ہے جس کی علت یہ تھی کہ عرب کے اکثر لوگ اونٹ بکریاں چراتے تھے۔ ان کے ہاتھ پیر ان جانوروں کے بول و براز کی چھینٹوں سے آلودہ ہو جاتے تھے وہی ہاتھ منہ پر بھی لگ جاتا تھا اس لئے ان کو وضو کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے اعضاء وضو وہی رکھے گئے جن کی آلودگی عادتاً اکثر و بیشتر تھی۔ لیکن ہم ضروریات تمدن کے ماتحت روزانہ غسل کرتے ہیں محفوظ مکانوں میں کرسی نشین رہتے ہیں اور وہ آلودگی کی علت ہم میں نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا وضو ہم پر واجب نہیں۔ ایک کہے گا کہ: مثلاً نکاح میں شہود اور اعلان نکاح فی نفسہٖ ضروری نہیں بلکہ اس علت سے تھا کہ زوجین میں اختلاف و نزاع کے وقت تحقیق حال میں سہولت ہو۔

پس جہاں اس کا احتمال نہ ہو وہاں بلا شہود نکاح جائز ہے وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ آج کہا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی علل و اسرار دین کے ہوں گے اور ان ہی علل پر احکام مبنی ہوں گے تو ان مجتہدین عصر کی بدولت غریب اسلام کو تو منہ چھپانے کی بھی جگہ نہ ملے گی کیونکہ اس کا انجام احکام کی تحریف، اجماع کی مخالفت و تخریب نصوص کی تبدیلی اور اصلی اسلام کا انہدام ہے۔ یہ آج کے اجتہادات کے عریاں نمونے ہیں جنہیں ہر شخص ادنیٰ تامل سے پہچان سکتا ہے اور بعض نمونے علمی رنگ کے ہوں گے جن کے اہمال کو خواص پہچان سکیں گے مگر اس قسم کے اجتہادی مفاسد پیش آنے کی وجہ وہی ہے کہ تکوینی طور پر وہ استخراج علل کی قوت تو بوجہ انتفاء ضرورت کے ختم ہو چکی ہے اور یہ علم کہ کون سا حکم معلل ہے علت کے ساتھ اور کون سا تعبدی ہے جس تو آ فہم پہنچتی تھا وہ رفتہ رفتہ زائل ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس کا ادعاء اور اوپر سے استعمال ایسے ہی نتائج پیدا کرے گا جو تمثیلاً عرض کیے گئے۔ ہاں اس خاص نوع کو چھوڑ کر جس نوع کے پردہ میں آج بھی جنس اجتہاد باقی ہے وہ عام تحقیق و تلاش کتاب و سنت میں تدبر ان کے لطائف و حقائق کا استخراج ہر زمانے کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتویٰ دینا۔ معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک و شبہات کی تردیدات نصوص سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات و تحقیق کے لئے کتاب و سنت سے مؤیدات پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ ہے۔ اجتہاد کی یہ نوع کل بھی تھی ور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی کہ قرآن کی شان لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ ① فرمائی گئی ہے جس میں کسی زمانہ کی تخصیص نہیں۔

پس جس طرح کتب روایت میں آج کسی جدید چھان بین اور رواۃ پر نئی جرح اور تعدیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ حسب ضرورت صرف ائمہ فن سے ان کی عرق ریزیوں کا ثمرہ پیش کر دینا کافی حجت ہے ورنہ تحصیل حاصل ہوگی۔ اس طرح کتب درایت میں بھی آج پھر سے اس اجتہاد کی ضرورت نہیں رہی جو کیا جا چکا ہے۔

بلکہ حسب ضرورت ائمہ درایت سے ان کی کاوشوں کے ثمرات کا نقل کر دینا اور اس پر عمل کر لینا کافی ہے۔ وہاں ہم روایت میں تقلید ائمہ پر مجبور ہیں۔ یہاں درایت میں مجبور ہیں۔ گویا نئی حدیث کی ضرورت ہے نہ نئے فقہ

① السنن للترمذي، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء في فضل القرآن، ج: ١٠، ص: ١٢٧.

کی۔ محدثین نے کوئی روایت نہیں چھوڑی جس کا صحت وسقم کھول کر نہ رکھ دیا ہو۔ فقہاء نے کوئی درایتی احتمال اور بعید سے بعید صورت عمل ایسی باقی نہیں چھوڑی جس کو نکھار کر بدلائل سامنے نہ رکھ دیا ہو اور کسی جویائے عمل کے لئے تشنگی کی کوئی ادنیٰ صورت بھی باقی رہ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نئے سے نئے مسائل پیش آئے اور آ رہے ہیں مگر مفتیین کو فتاویٰ کے لئے اب تک کوئی جدید فقہ مرتب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی فقہ سے جو ایک لاء اور قانون کی صورت میں مدون ہے اور ان ہی اصول سے جن کے ماتحت یہ فقہی ترتیبات عمل میں آئیں زمانہ کی ساری ضروریات پوری ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں خواہ اس کے منصوص حصہ سے اور خواہ اس کے اجتہادی حصہ سے۔ یہ خود اس کی ایک مستقل دلیل ہے کہ اجتہادی دور اپنا کام پورا کر کے منقضی ہو چکا ہے جو لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اجتہاد فی الدین کا دور ختم ہو چکا تو ہو جائے مگر اس کی تقلید کا دور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ تقلید ہر اجتہاد کی دوامی رہے گی خواہ وہ موجود ہو یا منقضی شدہ کیونکہ تقلید عین اجتہاد میں نہیں کی جاتی بلکہ اس سے پیدا شدہ مسائل میں کی جاتی ہے اور وہ مسائل آج بھی موجود ہیں اور رہیں گے۔ اس لئے تقلید پر کوئی دور بھی اختتام وانقضاء کا نہیں آ سکتا۔ خلاصہ یہ کہ جنس اجتہاد وتقلید میں سے کسی کو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی وقت بھی دنیا سے منقطع ہوئے ہیں اس لئے آج بھی وہ دونوں اپنی اپنی اسی نوعیت کے ساتھ جس کی تفصیل ابھی عرض کی گئی دنیا میں موجود ہیں کہ دین کی جامعیت تو ان دونوں کے وجود کو مقتضی ہے جبکہ یہ دونوں شرعی چیزیں ہیں اور دین کا اکمال واتمام ان دونوں کے درجہ اعتدال کو مقتضی ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم نہ کیا جائے بلکہ درمیانی نقطہ پر لا کر دونوں کو قائم رکھا جائے جس کی صورت ابھی عرض کی گئی۔

اختلاف ائمہ باعث رحمت ہے...... یہاں سے بحث کا ایک اور نقطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب اجتہاد شرعی چیز ہے جس میں رائے اور فہم کا دخل ہوتا ہے اور آراء متفاوت افہام متعدد اور مختلف ہو سکتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی اجتہادی مسئلہ میں آراء کئی ہو جائیں اور اجتہادات مختلف رنگوں کے ظاہر ہوں تو کیا اس اختلاف رائے کا دروازہ کھلنا امت کی تفریق بلکہ تخریب اور تمذہب کا باعث نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ صورت اختلاف نہ فی نفسہٖ مضر ہے نہ دین کے لئے مضر ہے نہ امت کے لئے مضر ہے۔ بلکہ علم علماء اور پوری امت کے خواص وعوام کے لئے موجب ترقی اور باعث سود وبہبود ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ترقی بغیر تصادم وتزاحم کے نہیں ہوتی بلکہ ترقی نام ہی دو متخالف چیزوں کے ٹکرانے کا ہے۔ اس لئے علم کی وسعت بھی بغیر تزاحم آراء اور تصادم افکار کے نمایاں نہیں ہو سکتی۔ ایک حکیم کا مقولہ ہے۔ ''اَلْقَلْبُ مَیِّتٌ وَحَیَاتُهٗ بِالْعِلْمِ وَالْعِلْمُ مَیِّتٌ وَحَیَاتُهٗ بِالْبَحْثِ وَالْمُنَاظَرَةِ'' ''دل آدمی کا مردہ ہے اس کی زندگی علم سے ہے اور علم انسان کا مردہ ہے اس کی زندگی بحث ومناظرہ سے ہے''

ظاہر ہے کہ بحث ومناظرہ علم کو علم سے ٹکرانے کا ہی نام ہے جس سے علم کے مختلف مخفی گوشے کھل جاتے ہیں۔ تکوین الٰہی نے اسی لئے اسلام کے مقابلہ میں کفر کی طاقتیں کھڑی کیں تا کہ کفر باطل کے جتنے پہلوؤں سے اسلام

سے ٹکرائے، اسلام کے اتنے ہی حقانی پہلو نمایاں ہو جائیں اور انجام کار حق کا غلبہ سب دیکھ لیں۔ علم کے مقابلہ پر شبہات کا لشکر اسی لئے صف آرا ہو گیا کہ جہل اپنے جس جس حصہ سے علم سے ٹکراتا ہے علم کے اتنے ہی مخفی گوشے دنیا کے سامنے ہوتے رہیں۔ پھر علم کو علم سے جتنی بھی ٹکر دی جائے معلومات کے اتنے ہی بوقلموں نقشے کھلتے رہیں۔ شریعت نے مشورہ کا اصول اسی لئے رکھا کہ آراء کے تصادم سے مسئلہ کے موافق اور مخالف پہلو کھل جائیں اور بات چھن چھنا کر منقح ہو جائے۔ غرض اگر اصول کے مقابلہ پر اضداد نہ ہوں اور متخالف اشیاء کے سامنے ان کے متخالفات نہ ہوں تو نہ ان کے مخفی حقائق اور توئی واشگاف ہو سکتے ہیں اور نہ بے حقیقت اضداد کی قلعی کھل سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے دین میں ایک حصہ محلِ فکر و بحث رکھ کر اجتہاد و تحقیق اور تزاحم آراء کے لئے چھوڑ دیا تاکہ اسلام کا وہ باطنی علم جو وسیع ترین کلیات اور مخفی علل اور اسرار پر مشتمل ہے ''لَا تَنقَضِي عَجَائِبُهُ'' کی حد تک کھلتا چلا جائے اور امت کے مخصوص دماغوں کی جولانیاں اور قلوب صافیہ کی رسائیاں سارے عالم کے لئے نفع بخش ثابت ہوں۔

ساتھ ہی اسلامی علوم کی جامعیت اور اسی کے ساتھ کتاب وسنت کی ہمہ گیری بھی کھل جائے۔ اس کی مختصر مختصر نصوص میں کتنے کتنے علوم بھرے پڑے ہیں کہ ہر معنی قلب و دماغ کے لئے اس میں ہر وقت اور وقت کے مناسب علم کا جدید سے جدید سامان تیار ہے جس سے ''أُعطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ'' ① اور ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ② کا پورا پورا ظہور ہو جائے۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے کہ کتاب وسنت کے بلیغ جملات اور ذو وجوہ فقرات جس قدر بھی شرعی احتمالات اپنے اندر رکھتے ہیں جو قواعد عربیہ اور اصول لسان کے اعتبار سے ان میں سے حقیقۃً پیدا ہوئے ہیں۔ وہ تمام محتملات بعض احتمالات ہی نہ رہیں۔ بلکہ ہر ایک محتمل قابل عمل اور ایک مستقل اسوہ بن جائے اور اس احتمال کی طرف جانے والا چل نکلے اور اسے اپنا مسلک ٹھہرائے تاکہ کلام الٰہی اور کلام رسالت پناہی کا کوئی گوشہ بھی مہمل نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی امام کے اختیار کر لینے کے سبب وہ امت کے زیرِ عمل آ جائے۔ پس آج اختلاف آئمہ کی بدولت احادیث کا ہر ہر محمل اجتہادی مسائل کی صورت میں امت میں معمول ہے اور کلام پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی گوشہ نہیں ہے جو ایک مستقل مذہب اور مسلک بنا ہوا نہ ہو۔ اسی لئے اس اختلاف کو رحمت واسعہ فرمایا گیا کہ اس کی بدولت کلام نبوت کا اعمال ہوتا ہے اہمال نہیں رہتا ''والاعمال أولى من الاهمال'' نیز امت کے لئے اور سہولت بھی بہم پہنچتی ہے کہ ہر مذاق کا طبقہ ہر مذاق کا امام اپنے مناسب مذاق علمی پہلو کو لے کر اپنی آخرت سنوار سکتا ہے اس صورت میں اسلام ایک ایسے دریا کی مانند ہوگا جس کا ایک ہی گھاٹ نہ ہو بلکہ متعدد ہوں کہ جو راہ گیر جس جانب سے بھی گزرے سیراب ہو سکے اور اسے کسی ایک ہی گھاٹ کی طرف گھوم کر آنے کی مجبوری لاحق نہ ہو کہ ہر گھاٹ پر پانی بھی وہی ہے مزہ بھی وہی ہے۔ البتہ سمت اور رخ بدلا ہوا ہے ایک عظیم

---

① الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب (بلا ترجمہ) ج:۳ ص:۱۰۹۔

② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۹۔

الشان درخت کے مشابہ ہوگا جس کی ہزاروں شاخیں ہوں اور ہر سمت میں ہوں تا کہ جدھر سے بھی کوئی آئے پھل کھا سکے۔ یہ نہیں کہ شاخ ایک ہی ہے اور ہر جانب سے آنے والے کو ناگزیر طریقے پر ایک ہی سمت خاص میں پہنچ کر پھل سے انتفاع کا موقع ملتا ہے یا ایک ایسے عظیم ایوان کی طرح ہے جس میں ہزاروں دروازے ہیں کہ ہر جہت سے آنے والے ہر سمت سے مکان میں داخل ہو سکتے ہیں اور اس کے سامان سے راحت اٹھا سکتے ہیں جو مجبور نہیں ہیں کہ گھوم پھر کر ایک ہی دروازے سے داخل ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت اختلاف ائمہ ہی کی بدولت امت کو حاصل ہو سکتی تھی اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اختلاف ائمہ اصول کا نہیں بلکہ اتحاد اصول کے ساتھ سمتوں اور جہات و کیفیات کا اختلاف ہے تا کہ علم کی اس وسعت سے اسلام کی ہمہ گیری اور امت کے لئے عمل کی تیسیر ہو جائے۔ نیز ہر مذاق کے انسان کو الوان فہم کے مذاق کے مطابق مربی اور سامان تربیت بھی میسر آ جائے۔

بس اس حکمت بالغہ کے ماتحت حق تعالیٰ نے آئمہ اجتہاد میں تعدد بھی پیدا فرما دیا اور ان میں متعدد حضرات کے مذاق اجتہاد میں الوان کا بھی اختلاف ڈال دیا۔ اصول استنباط بھی مختلف ہو گئے اور ان کے ماتحت مستنبط شدہ مسائل کی لمیات اور پھر ان لمیات کے ماتحت حکمیات بھی مختلف ہو گئیں اور یہ سارے اختلافات سمٹ کر اس اختلاف ذوق سے پیدا ہوئے جو ائمہ کو قدرت الٰہی نے تکوینی طور پر بخشا تھا۔ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی رونما ہوا کہ ان ائمہ کی مختلف شئون سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف اور متنوع شئون نبوت واشگاف ہوئیں۔ گویا وہ ساری شئون جو ایک ذات بابرکات نبوی میں مجتمع تھیں اور ان سب کا کوئی ایک امتی انفرادی طور تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ پوری امت کے راسخین فی العلم پر منقسم ہو کر مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئیں اور اس شان سے کہ ہر شان نبوت نے ایک ایک مجتہد کے ذریعہ ایک مستقل مسلک اور تہذیب کی صورت اختیار کر لی جس پر امت کے کروڑوں افراد چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ اور شئون نبوت کے یہ تمام الوان ایک صد رنگ گلدستہ کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوئے بنظر بریں فقہاء امت کا یہ اختلاف امت کے حق میں نہ صرف غیر مضر بلکہ علماً وعملاً مفید ثابت ہوا۔ فہیم شخصیات کے مکنون جوہر کھلے کتاب وسنت کی بلاغت و جامعیت کے مستور پہلوؤں کا اعلان ہو گیا۔ امت کے لئے عملی آسانیاں بہم پہنچ گئیں۔ پیغمبر کے متنوع علم کی شئون واضح ہو گئیں، غرض امت، پیغمبر، دین، مذہب سب کے لئے اجتہادی اختلاف اور فروعی تنوع بہر نہج مفید ہی مفید اور رحمت ثابت ہوا۔ اسی لئے شریعت نے کھلے الفاظ میں اس اختلاف کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے رحمت واسعہ کہا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "اِخْتِلَافُ اَصْحَابِیْ رَحْمَةٌ وَاسِعَةٌ"۔ ① "میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا اختلاف بڑی رحمت ہے۔"

پھر اسی پر قناعت نہیں فرمائی گئی بلکہ ہر اس اجر وثواب کے مواعید دے کر امت کو اس کی رغبت دلائی گئی۔

---

① علامہ سخاوی فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام بیہقی نے "المدخل" میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث کی سند میں جویبر ہے چنانچہ فرماتے ہیں: وجويبر ضعيف جداً دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ۱ ص: ۱۴۳، حرف الهمزة.

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَاَصَابَ فَلَهٗ اَجْرَانِ وَاِذَا حَكَمَ ثُمَّ اجْتَهَدَ ثُمَّ اَخْطَاَ فَلَهٗ اَجْرٌ. ①
''حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب کوئی حکم والا حکم کرے اور اجتہاد میں مصیب ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور اگر خطاء ہو جائے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے''۔

قرآن کریم نے بھی اپنے نظم میں اس اختلاف کی مشروعیت کی طرف اشارہ فرمایا گویا فروعی اختلافات کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ ② ''اور تم لوگ ان کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا واضح احکام پہنچ جانے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی''۔ ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ کی قید سے واضح ہے کہ اختلاف مطلقاً مذموم نہیں بلکہ صرف وہی اختلاف مذموم ہے جو دلائل کھل جانے کے بعد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا اختلاف یا تو اصول کا اختلاف ہو سکتا کیونکہ اصول خود ہی نفسِ کھلے ہوئے اور واضح ہوتے ہیں اور یا ان فروع کا ہو سکتا ہے جن کے دلائل واضح ہو جائیں۔ پس اصول واضحہ اور فروع واضحہ الدلائل میں اختلاف آیتِ بالا سے مذموم اور ممنوع ثابت ہوا کہ وہ اختلاف محض نفسانی ہوتا ہے لیکن ان فروع میں اختلاف جن کے دلائل ہی ابھی تک واضح نہ ہوئے ہوں خواہ اس طرح کہ ان کے بارہ میں کوئی نص ہی نہ آئی ہو یا نص ہے مگر اس سے متعارض ایک دوسری نص بھی ہو جن میں وجہ تطبیق صریح اور واضح نہ ہو۔ تو اس قسم کی فروعات میں اختلاف ظاہر ہے کہ وضوحِ بینات سے پہلے پہلے کا ہوگا اس لئے مذموم بھی نہیں ہو سکتا یہی وہ اجتہادی اختلاف ہوگا جو اتحادِ اصول کے ساتھ محض فروعاتی ہوگا اور مجبوری ہوگا جسے لسانِ نبوت پر رحمتِ واسعہ کہا گیا ہے اور جس کی خطاء پر اجر کا وعدہ دیا گیا ہے پس ایسے اختلاف کی مشروعیت حدیث کے تو منطوق اور قرآن کے مفہوم سے ثابت ہوگئی۔

مسائلِ فقہیہ کی تدوین مذموم نہیں ہو سکتی...... بہرحال جبکہ اجتہاد مشروع بھی ہوا، اجتہادی اختلافات بھی شرعی اور مطلوبِ شرعی ٹھہرے تو آخر اجتہاد کے ذریعے ایسے اجتہادی اختلافات کا ظہور بھی نہ قابلِ ملامت ہو سکتا ہے نہ ایسے مسائل کی تدوین ہی قابلِ طعن ہو سکتی ہے۔ اگر کسی مجتہد کے تلامیذ اپنے عمل کے لئے اس کے اجتہادات کو ایک جگہ جمع کر لیں گویا بالفاظِ دیگر ان شرعیات کے مسائل کی تدوین کرنے لگیں تو آخر اس میں کون سی شرعی قباحت ہے کہ اس پر انہیں قابلِ سرزنش شمار کیا جائے۔ بس ایسے ہی اجتہادی مسائل کے ایک جگہ جمع شدہ مجموعہ کا نام فقہ ہے جس کو کسی مجتہد کے متوسلین نے باب وار اوراق میں ذخیرہ کر لیا ہو۔ پھر یہ نام بھی کوئی اختراعی نام نہیں بلکہ حدیثِ نبوی سے ثابت شدہ اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز فرمودہ نام ہے جیسا کہ

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب اجر الحكم اذا اجتهد، ج: ۲۲، ص: ۳۳۵.

② پارہ: ۴ سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۵.

حدیث رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اور حدیث مَثَلُ مَنْ فَقِهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اور حدیث مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ سے تفصیلی طور پر اس فقہ کی نوعیت عرض کی جا چکی ہے۔

تبعین فقہ کے لقب ''اہل السنّت والجماعۃ'' کا ماخذ..... ہاں پھر چونکہ یہ فقہ مجموعہ سنن تھا جس میں سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تو بطور ماخذ کے شامل تھیں اور سنن صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بطور ماخذ کے جمع تھیں اس لئے اس میں سنیت کا بھی نور تھا اور جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا جماعتی نور بھی مجتمع تھا اس لئے عاملین فقہ نے اپنا نام اہل السنۃ والجماعۃ رکھ لیا تو کیا برا کیا بلکہ غور کرو تو یہ نام بھی حدیث ہی سے ماخوذ ہے، حضرت عمرو بن عاص کی روایت میں ارشاد نبوی ہے۔ وَإِنَّ بَنِيْ إِسْرَآءِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَّ تَفْتَرِقُ أُمَّتِيْ عَلٰى ثَلٰثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ. ① ''اور بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں پر منقسم ہو جائے گی سب فرقے ناری ہوں گے بجز ایک کے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں اس پر چلنے والا ناجی ہے''۔

ظاہر ہے کہ اصحاب کے لفظ سے جو جمع لایا گیا ہے اس سے جماعت مفہوم ہوتی ہے اور مَا سے مراد طریقہ اور سنت ہے جو پیغمبر اور صحابہؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس لئے فرقہ ناجیہ کا ترجمہ ہوا ''سنت نبی و جماعت نبی'' ظاہر ہے کہ جب اہل فقہ کی فقہ میں یہی سنت نبی اور جماعت نبی جمع ہے اور انہوں نے اس لفظی اور معنوی مناسبت سے اپنا لقب اہل سنت والجماعت تجویز کر لیا تو اس میں کیا برائی ہے کہ یہ لقب ان کے حق میں مستوجب ملامت شمار کیا جائے بلکہ اس لقب کی ترکیب پر غور کیا جائے تو ایک اور شرعی حقیقت بھی اس لقب سے واشگاف ہوتی ہے جو دینی جماعت کے جسم کے لئے بمنزلہ روح کے ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اہل سنت اور اہل الجماعت کہنے والے گویا یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سنن نبوی کو محض الفاظ حدیث سے اخذ نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہ کی شخصیات کو ملا کر معانی لیتے ہیں جو حاملین حدیث ہیں جن کی زبانوں پر تو حدیث و قرآن کے الفاظ ہیں اور سینوں میں ان الفاظ کے مخفی حقائق و دقائق ہیں۔ گویا الفاظ کتاب و سنت کے ساتھ صحبت و معیت اساتذہ بھی ضروری ہے۔

اگر صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن و حدیث سنا اور ان کے حقائق کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک سے لیا پھر تابعین نے صحابہؓ کی زبان سے تو قرآن و حدیث لیا اور ان کے قلوب سے اس کی صفائی و اسرار کو حاصل کیا ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ② وہم بھی اس توارث کے ماتحت الفاظ کتاب و سنت تو کتب سے لیتے ہیں اور ان کے حقائق ان روشن ضمیر اساتذہ کے قلوب سے جو خلفاً عن سلف اس باطنی نور کو اخذ

① المستدرک، ج: ۱، ص: ۲۱۸، رقم: ۴۴۳۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۱ ص: ۴۰۲، رقم: ۲۰۳۔

② پارہ: ۲۰ سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹۔

کرتے چلے آئے ہیں۔ پس اہل السنت والجماعت کے لفظ سے طریقہ اور مذہب بھی نکلتا ہے اور طریقہ کے ساتھ اہل طریق کی معیت ملازمہ بھی مفہوم ہوتی ہے جو حقائق کے سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ چناں چہ قرآن کریم نے دینی سلسلہ میں تعلیم و تربیت کے بھی دو اصول ذکر فرمائے ہیں۔ ایک کتاب اور ایک استاذ۔ گویا کتاب کے ساتھ ایک عالم کتاب رسول، ضرور لازم رکھا ہے تا کہ وہ کتاب کے جلی وخفی حقائق سمجھائے بھی اور کر کے دکھلائے۔

چناں چہ ارشاد ربانی ہے۔ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ① ”بلاشبہ ہم نے اپنے رسول بھیجے کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان تا کہ لوگ عدل کے ساتھ قائم ہوں“۔ اس لئے اہل السنت والجماعت کا عنوان ایسا جامع عنوان نکلا کہ اس میں دینی تربیت کے ان دونوں بنیادی اصول (کتاب اور شخصیت) کی طرف اشارہ ہو گیا جس سے ایک سچی جماعت یا صادق فرقہ کی تشکیل ہوتی ہے کہ اس کے لقب میں طریق اور اہل طریق دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جو اہل السنت والجماعت ہے وہ اہل حدیث اور اہل قرآن بھی ہے کہ یہ کتاب کا مرتبہ ہے۔ اہل عترۃ بھی ہے کہ یہ شخصیت کا درجہ ہے لیکن ہر اہل حدیث اور اہل قرآن کا اور اہل عترۃ کا اہل السنت والجماعت ہونا ضروری نہیں کہ ان القاب میں کسی میں فقط کتاب کی طرف اشارہ ہے اور کسی میں محض شخصیت کی طرف۔ پس حدیث میں جہاں بھی مسلمانوں کو اہل حدیث فرمایا گیا جیسے حدیث شرف سخاوی سے نقل کی جاتی ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ”اَنْتُمْ اَهْلُ الْحَدِيْثِ“ سے خطاب کیا گیا یا قیامت میں کیا جائے گا یا کسی حدیث میں مسلمانوں کو اہل قرآن کہا گیا ہے جیسے حدیث علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ فَاَوْتِرُوْا يَآ اَهْلَ الْقُرْاٰنِ۔ ”اللہ وتر ہے، وتر کو پسند کرتا ہے پس وتر پڑھوائے اہل قرآن“۔ ②

یا کسی حدیث عترت کے اتباع کی دعوت دے کر گویا انہیں اہل عترت کہا گیا یہ سب اسماء جزوی اور نسبتی ہیں کہ یا مسلمانوں کو کتاب اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے یا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یا اصحاب واہل بیت کی طرف ایک دم اشارہ بلکہ صراحۃً موجود ہے۔ درآں حالیکہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے القاب والی روایات میں اس لقب سے کسی اصطلاحی جماعت کی طرف اشارہ نہیں ورنہ چکڑالوی اہل قرآن اور شیعان اہل عترت کو اپنی حقانیت پر استدلال لے آنے کا کافی موقع مل جائے گا۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نسبت محض ہے جو ملابست کی وجہ سے فرمائی گئی ہے جیسے جنت میں مختلف دروازوں باب الصلوٰۃ، باب الجہاد، باب الریان وغیرہ سے داخل ہونے والوں کو محض ان اعمال یا ان دروازوں کی طرف منسوب ہو جانے کے سبب مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ بعض کو اہل الصلوٰۃ کہا گیا بعض کو اہل الصیام کہا گیا

① پارہ: ۲۷ سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۵۔

② السنن للترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء ان الوتر لیس بحتم ج: ۲ ص: ۲۵۵۔

اور بعض کو اہل الجہاد کہا گیا۔ یا بعض روایات میں انہیں اہل دین کہا گیا ظاہر ہے کہ ان القاب سے فرق اور مذہبی گروہ مراد نہیں ہیں بلکہ محض نسبتوں کا اظہار ہے جس سے مسلمانوں کی امتیازی شان اور تشریف مقصود ہے نہ کہ عقائد و مسائل کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ فرمانا۔ اسی طرح حدیث میں اہل الحدیث اہل القرآن فرمانے سے اصطلاحی جماعتیں چکڑالوی یا امرتسری مراد نہیں بلکہ نسبتوں کا اظہار مقصود ہے کہ مسلمانوں کو کتاب سے بھی نسبت ہے۔ حدیث سے بھی ہے۔ صحابہؓ سے بھی ہے صلوٰۃ سے بھی ہے صیام سے بھی ہے جہاد سے بھی ہے، دین سے بھی ہے کلمہ طیبہ سے بھی ہے۔ پس ایک مسلمان اہل حدیث بھی ہے اہل قرآن بھی ہے اہل عترت بھی ہے، اہل صلوٰۃ بھی ہے اہل صیام بھی ہے۔ اہل جہاد بھی ہے، اہل دین بھی ہے، اہل علم بھی ہے اور اہل لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بھی ہے۔ لیکن "مَآ اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ" کا جملہ جس سے اہل السنۃ والجماعۃ کا لقب مستنبط ہوتا ہے بولا ہی گیا ہے فرق کے تذکرہ کے سلسلہ میں اور اس لقب سے ایک ہی فرقہ کی تشخیص منظور ہے جو عنداللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ پس یہ لقب محض نسبت ہی نہیں بلکہ ایک جماعت کا شرعی سرنامہ اور عنوان ہے، اس لئے میرے خیال میں اہل السنت والجماعت نے اس لقب کو اپنے لئے اختیار کر کے اپنے کمال تفقہ کا ثبوت دیا ہے کہ مسلک کا لقب بھی منصوص ہی انتخاب کیا یعنی اہل السنت والجماعت اور پھر لقب بھی وہ اختیار کیا جو لقب ہی کے طور پر حدیث میں مذکور رہا ہے نہ کہ محض نسبت کے طور پر " فَمَآ اَحْسَنَ فِقْهَهُمْ وَاَحْسَنَ بِلَدْرَایَتِهِمْ " پس جس طرح حدیث کی اس نسبت "اہل حدیث" سے "اہل قرآن" کی نفی نہیں ہوتی اور اہل قرآن کے لفظ سے اہل حدیث کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اہل حدیث کے لفظ سے آخر اھل السنت والجماعت کے لقب کی یا ان کے مسلک فقہ کی یا اس کے لوازم اجتہاد و تقلید کی نفی کیسے ہو جائے گی اور حدیث کی یہ مراد ہی کب ہے کہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے لقب کو بمقابلہ لقب اہل السنت والجماعت استعمال کیا جائے؟ نہیں بلکہ سوچا جائے کہ اگر فرقہ ناجیہ کے لقب (اھل السنت والجماعت) سے نسبت محض اہل حدیث یا اہل قرآن کی نفی کی جاتی تو موقع بھی تھا لیکن نسبت محض کے عنوان سے ایک جماعتی لقب کے عنوان کی نفی کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے جبکہ وہ منصوص بھی ہو۔ بہر حال اھل السنت والجماعت بحمداللہ فرقہ ناجیہ ہے۔ فرقہ ضالہ نہیں۔ اس کا لقب شرعی ہے بدعت نہیں۔ اس کے دستور العمل کا لقب (فقہ) منصوص ہے، اختراعی نہیں۔ اس لئے اگر یہ شرعی جماعت اپنے شرعی مسلک کے مسائل کو بنام فقہ ایک جگہ مرتب اور جمع کر دے تو اس میں ملامت کی کیا بات ہے؟ چناں چہ آئمہ مجتہدین کے فقہیات مرتب ہوئے اور اپنی اپنی جگہ کروڑوں مسلمانوں کے لئے دستور العمل بنے ہوئے ہیں اور کبھی بھی امت نے ان کو ذریعہ مطاعن و ملامت نہیں بنایا۔ بلکہ ہر طبقہ نے امت کی اس محنت کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ہی اسے قرآنی معجزہ کی حجت سمجھا کہ اس کے ذریعے سے قرآن کے علوم سربستہ جو اس کے اعجاز کی روح اور وجوہ اعجاز کا اہم جزء تھے کھل گئے اور کتاب وسنت کے جوامع کلم کی اعجازی بلاغت و جامعیت نمایاں ہو گئی۔

تقلید شخصی؛ اختلافی مسائل میں ناگزیر ہے..... بہر حال جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ اجتہاد شروع، اجتہاد پر عمل شروع، ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کیا جانا شرعی چیز، اس کا نام رکھنا شرعی بات اور ان سارے اجتہادات میں غیر مجتہد کے لئے تقلید ناگزیر اور ساتھ ہی یہ کہ ہر اجتہادی مسئلہ میں دو آراء کا ہونا ممکن اور دائرہ شرع میں داخل بلکہ مستحسن اور مطلوب ہے۔ تو یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے اختلافی مسائل میں پھر تقلید شخصی بھی ناگزیر طریقہ پر ضروری ہو کیونکہ ایک مسئلہ دو متضاد جانبین میں دائر و سائر کبھی رہ ہی نہیں سکتا، نہ اعتقاداً نہ عملاً آخر ایک ساعت میں ناسخ و منسوخ، راجح و مرجوح، اولیٰ غیر اولیٰ، حقیقت و مجاز، مشترک، مؤول، واجب اور مکروہ، فرض اور حرام پر عمل یا اعتقاد کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے؟ چار و نا چار ایک ہی جانب کو اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس غیر مجتہد کو اختلافیات میں کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید کرنا پڑے گی۔ حتیٰ کہ اگر ایک مسئلہ میں ایک امام کی تقلید ہو اور دوسرے میں دوسرے کی تو میں کہوں گا کہ: جس مسئلہ میں بھی کسی کی تقلید ہوئی ایک کی ہوئی اور وہی تقلید شخصی پھر باقی رہی۔ زیادہ سے زیادہ امام کئی ہو گئے۔ مگر ہر ہر مسئلہ میں امام ایک ہی رہا اور تقلید بھی واحد ہی کی رہی۔ یہ تو نہ ہوا کہ کسی ایک مسئلہ میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی۔ تقلیدات متعدد ہو گئیں امام متعدد ہو گئے مگر جس میں بھی جس امام کی تقلید واقع ہوئی وہ رہی شخصی ہی۔ یا اگر ایک شخص ایک مسئلہ میں صبح کو ایک امام کا مقلد ہے اور اسی مسئلہ میں شام کو دوسرے کا، جبکہ وہ دونوں مختلف الرائے بھی ہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ اب بھی وہ تقلید شخصی ہی رہی کیونکہ جس صبح کو اس نے ایک امام کی تقلید کی تو اس صبح کو وہ یقیناً دوسرے امام کے نظریہ سے ہٹا ہوا اور اس کے عمل سے الگ تھلگ۔ شام کو جب اس نے دوسرا امام اختیار کیا تو یقیناً صبح کا مذہب اور صبح کا امام بھی بدل دیا۔ اس لئے صبح کو تقلید شخصی ہی کی اور شام کو بھی تقلید شخصی ہی رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی کے سوا عقلاً کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تقلید شخصی میں کون سی مذموم ہے اور کون سی مستحسن؟ مگر مختلف فیہ مسائل میں کوئی نوعیت بھی لی جائے تقلید شخصی کے سوا عامی کے لئے اور تحقیق شخصی کے سوا مجتہد کے لئے کوئی چارہ کار نہیں جس کا راز یہ ہے کہ عقلاً آدمی بیک وقت نقیضین میں دائر و سائر کبھی نہیں رہ سکتا۔ نیز دین میں شرعاً تناقض غیر ممکن ہے۔ جو بھی کسی ایک جانب کو اختیار کرے گا خواہ وہ مجتہد ہو جو فقہی نظریہ سے عمداً اس کی ایک جانب کو بڑھا ہے یا وہ مقلد ہو جو اعتقاداً و عملاً مسئلہ کی ایک جانب کو اختیار کر رہا ہے وہ ناگزیر ہے کہ اس مسئلہ کی دوسری جانب کو ترک کرے ورنہ وہ اور اس کا دین تناقض کا شکار ہو جائے گا۔ جو عقلاً و شرعاً محال ہے۔ جس کی دین میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ہاں اس کے نظائر ملیں گے کہ ایک جانب سے رجوع کر کے دوسری جانب اختیار کر لی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں پہلی جانب کو ترک کرنا پڑے گا۔ اور وہ تقلید شخصی یا تحقیق شخصی پھر آ جائے گی۔ غرض یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نقیض کو مانتے ہوئے دوسری نقیض بھی مانی جائے یا ایک کے زیر عمل ہوتے ہوئے دوسری بھی معمول بن جائے۔

تقلید شخصی کون سی مطلوب ہے اور وہ کیوں ضروری ہے؟...... رہا یہ کہ ان ساری شخصی تقلیدات میں مطلوب کون سی تقلید ہے یا عقلاً اور نقلاً قابلِ قبول بلکہ قابلِ وقوع کون سی ہے؟ سو اس کے متعلق اگر انصاف سے غور کیا جائے تو صرف ایک ہی صورت معقول ہو سکتی ہے کہ عمل کے دائرہ میں ایک ہی فقہ کے تمام مسائل پر عمل کیا جانا یا بالفاظِ دیگر کل مسائل اجتہادیہ میں ایک ہی امام کی تقلید کیا جانا ضروری ہے کیونکہ علمی نظر میں یہ غیر ممکن ہے کہ اجتہادیات میں تقسیم کر کے بعض مسائل میں ایک امام کی اور بعض میں دوسرے کی تقلید کی جا سکے۔ بلکہ جس فقہ کو بھی اختیار کیا جائے گا اسے پورے ہی کو اختیار کرنا پڑے گا ورنہ وہی تناقضِ محال کسی نہ کسی جہت سے سر پر پڑ جائے گا۔ بعض مسائل میں جزئیاتی تناقض نمایاں ہوگا۔ بعض میں ان جزئیات کے مبادی اور تعمقات کا تناقض رونما ہوگا اور بعض میں ان جزئیات کے کلیات اور اصول میں تناقض پیدا ہو جائے گا کیوں کہ:

1 ...... بعض مسائل اجتہادیہ تو وہ ہیں کہ خود ان ہی میں کھلا تناقض ہوتا ہے جسے ایک عامی سے عامی آدمی بھی پہچان سکتا ہے۔ مثلاً مسِ مراۃ (عورت کا چھو دینا) کہ حنفیہ کے یہاں ناقضِ وضو نہیں اور شوافع کے یہاں ہے یا خارج من غیر السبیلین شوافع کے یہاں ناقضِ وضو نہیں اور حنفیہ کے یہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلا ہوا تناقض ہے جو حکم کے لحاظ سے بھی ہے اور بناءِ حکم یعنی دلائل وغیرہ کے اعتبار سے بھی۔ پس ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ وہ ان مسائل کی ان دو متناقض جہات کو متناقض مانتے ہوئے بیک وقت نہ دونوں پر عمل کر سکتا ہے نہ دو اعمال کے درمیان دائر سائر رہ سکتا ہے کہ دین میں ایسے تناقض کی کوئی جہت اور کوئی نظیر ہی موجود نہیں الا یہ کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے دو متناقض باتوں میں صراحۃً امت کو خیار دے دیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں دو فقہیات یا دو فقہاء میں دائر سائر رہنا کھلا تناقض قبول کر لینا ہے گویا دو متعارض چیزوں کو بیک وقت حق جان کر قابلِ عمل ماننا ہے جو عقلاً بھی باطل ہے اور شرعاً بھی محال ہے اس لئے ناگزیر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ایک عامی آدمی کھلے طور پر مسئلہ کی ایک ہی جانب اختیار کر کے ایک ہی امام کی تقلید پر مجبور ہوگا۔

2 ...... دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ کی دو متخالف جانبین میں سے ایک وقت ایک پر عمل کیا جائے اور دوسرے وقت دوسری پر۔ یا ایک امام اور ایک فقہ کا پابند رہتے ہوئے اسی نوع کے کسی ایک آدھ مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید کر لی جائے اور جبکہ اس مسئلہ کی وہ جانب ہی چھوڑ دی جائے گی جو اپنے امام کی اختیار کردہ تھی اور صرف وہی جانب لی جائے گی جو دوسرے امام کی مختار ہے تو اس میں وہ مذکورہ تناقض حکم بھی پیدا نہ ہوا اور ایک امام کی تقلید سے بھی آدمی باہر نہ ہوا کہ بہر حال اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً کل ہی مسائل میں بجز اس ایک آدھ مسئلہ کے اپنے ہی امام کی تقلید موجود ہے تو ایسی معدودے چند جزئیات میں دوسرے امام کی تقلید کرنے میں کیا حرج ہے؟ مثلاً ایک حنفی تمام مسائلِ فقہیہ میں حنفی رہتے ہوئے مفقود کے مسئلہ میں مالکیہ کے مذہب پر عمل کرنے لگے اور حنفیہ کا مسلک اس بارے میں ترک کر دے تو اس میں وہ تناقض یا جمع بین الضدین کب لازم آیا جس سے بچنے کے لئے دو تقلیدیں

غیر معقول بھی ہوگئی تھیں لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو وہ تناقض اب بھی موجود ہے اس خاص جزئیہ میں نہیں تو اس کے مبادی اور متعلقات میں موجود ہے وجہ یہ ہے کہ ہر ایک امام جب کسی مسئلہ میں کوئی اجتہادی رائے قائم کرتا ہے تو اس کے سامنے اس باب کے تمام مسائل کا ایک سلسلہ مستحضر ہوتا ہے اور وہ اپنے مخصوص ذوق اور اصول سے ان تمام مسائل باب میں ایک خاص تناسب محسوس کرتے ہوئے اور اپنے ذوق اجتہاد سے اسی تناسب کو قائم رکھ کر اس باب کے تمام مسائل کی کڑیاں جوڑتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے امام کی ذوقی نظر میں بھی مذکورہ تناسب کا مذہبی رنگ قائم ہو بلکہ وہ تناسب وتوازن کا کوئی اور رنگ لئے ہوئے ہو جو اس رنگ سے بالکل جداگانہ ہو اس لئے اگر ایک امام کا مقلد کسی ایک مسئلہ میں بھی دوسرے امام کی تقلید کرے گا تو اس خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے ہر رنگ اور مبادی دوسرے مسائل میں تناقض رونما ہوگا اور اس نئے مقلد کے سر ان متعلقات مسائل کی تقلید بھی لازم آجائے گی جن میں تقلید کا اس نے ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ مفقود کے مسئلہ میں یہی صورت ہے کہ مالکیہ کے یہاں چار سال میں تفریق اس پر دائر ہے کہ ان کے یہاں اکثر مدت حمل چار سال ہے اس لئے چار سال تک براءۃ رحم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نیز چار سال کے بعد اعسار بھی موجب تفریق ہوجاتا ہے لیکن فقہ حنفی میں اکثر مدت حمل دو سال سے زائد نہیں اور اعسار موجب تفریق نہیں پس مفقود کے اعتبار سے چار سال پر تفریق کا فتوی دیا جانا گویا مدت حمل بھی چار سال مان لینا اور اعسار پر تفریق کا ترتب کر لینا ہے حالانکہ یہ مفتی بحیثیت حنفی ہونے کے اکثر مدت حمل دو سال مانے ہوئے ہے جس سے ابھی تک منکر نہیں اور اعسار کو موجب تفریق ہی نہیں کہتا۔

پس وہ مسئلہ مفقود کے معانی میں حنفی بھی ہے اور مالکی بھی ہے۔ دو سال کا بھی قائل ہے اور چار سال کا بھی، تفریق اعسار کا بھی قائل ہے اور عدم تفریق کا بھی قائل ہے اگر نفس مسئلہ مفقود کے فتوی میں وہ گرفتار تناقض نہ ہوا تو اس کے مبانی اور متعلقات میں ہوگیا جس کے رفع ہونے کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ہر مسئلہ میں حنفی رہے یا ہر مسئلہ میں مالکی بن جائے۔

3 ...... تیسری صورت یہ ہے کہ نہ ایک مسئلہ کی دو جانبین میں دائر رہے نہ ایک مسئلہ کے دو اجتہادی پہلوؤں میں دو وقتوں میں دائر رہا جائے بلکہ دو باب کے الگ الگ مسائل میں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو دو اماموں کی تقلید کی جائے مثلاً فروع صلوۃ میں ایک امام کے اجتہاد پر عمل کیا جائے اور فروع حج میں مثلاً دوسرے کے اجتہاد پر تو اس میں بظاہر تناقض کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور تقلید شخصی کی مصیبت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو اس صورت میں گو جزئیاتی تعارض نہیں مگر اصولی اور کلیاتی تعارض سے یہاں بھی مفر نہیں ہوسکتا کیونکہ ہر امام کے اصول استنباط الگ الگ ہیں جو اس کے فطری مزاج اور افتاد طبع سے سرزد ہوئے ہیں۔ اس لئے وہی رنگ اس کے پورے فقہ میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شرائع میں انبیاء علیہم السلام کا رنگ سمایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک شریعت جبکہ نبی کے دل و دماغ سے ہوکر ظہور پذیر ہوتی ہے تو نبی کا فطری رنگ شریعت

میں جھلکنا؛ گزیر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان جلالی تھی تو شریعت کے احکام میں بھی تشدد اور شدت غالب ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شان جمالی اور رافت ورحمت کی تھی تو ان کی شریعت میں بھی لین (نرمی) کا غلبہ ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان جامع شئون تھی جن کا غالب رنگ عدل واعتدال' وررحمت ویسر تھا تو شریعت محمدی کے ہر ہر مسئلہ میں یہ جامعیت اور مظاہرہ عدل ورحمت بھی نمایاں ہے۔ غرض مذہب کے اصول وفروع میں صاحب مذہب کی فطری ذہنیت کا الگ رنگ اس لئے جھلکنا ضروری ہے کہ یہ تمام الہامی اصول وفروع اسی کی ذہنیت کے راستے سے گزر کرآتے ہیں۔ اس لئے باوجود دین انبیاء کے واحد ہونے کے ہر نبی کی شریعت کا ایک ممتاز رنگ ہے اور اس کے کمالات وکرامات کا ایک خاص لون ہے جو دوسروں میں نہیں۔ اور اس رنگ کے ماتحت اس کے تربیت یافتوں میں بھی وہی رنگ سرایت کرتا ہے جو مقتدائے اعظم کا ہوتا ہے چناں چہ مختلف امم کی شئون اور آثار وخواص بالکل ممتاز اور باہم تخالف بھی ہیں اور اپنے اپنے نبی کی شئون کا مظہراتم بھی ہیں۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے ایک دریا باوجود ایک ہونے کے جس جس خطہ زمین سے گزرتا ہے اس کی خصوصیات اور وہاں کی ہواؤں کے مخصوص اثرات لیتا جاتا ہے اور اس کے سیراب ہونے والوں کے مزاج میں بھی وہی کیفیت سرایت کرتی ہے۔

پس شرائع تکلیفیہ کی طرح یہ شرائع وضعیہ (اجتہادی مسالک) بھی باوجود متحد الاصول ہونے کے جس امام کے دل ودماغ سے گزر کر وجود کا جامہ پہنتی ہیں اس کا ذوقی رنگ لئے ہوئے ہوتی ہیں اور اسی کے ذوق سے نکلے ہوئے اصول استنباط سے مستنبط ہوتی ہیں۔۔ پس اس مجتہد کا پورا فقہ اور فقہ کے سارے ابواب اسی ایک رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو انجام کار ان عملی جزئیات کے واسطہ سے اس فقہ کے ہر متبع میں سرایت کرتا ہے۔ گویا اس فقہ کے تربیت یافتوں کی ذہنیت بھی اسی رنگ کی ہوجاتی ہے جو اصلی مربی اور بانی فقہ کی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مجتہد کے مزاج میں توسیع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا۔ کسی میں شدت ہے اور کسی میں لین۔ کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا۔۔ کسی میں دیانت کا وفور ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست ونظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے۔ کسی میں ظاہریت کا غلبہ ہے۔۔ اور کسی میں باطنیت کا۔۔ کسی میں تاسی یا اسوۃ السلف کا غلبہ ہے اور کسی میں رجحانات کے تتبع واستقراء کا۔ ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑا مرجع ظواہر روایت ہوں گے اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجع بواطن روایت یعنی درایت ہوگی، جہاں تاسی کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجع تعامل سلف ہوگا اور جہاں شرعی جمہوریت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجع سلف کی اکثریت ہوگی۔ بہرحال جس امام کی جو بھی ذہنی خصوصیات ہوں گی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنیں گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصول کے ماتحت مستنبط شدہ جزئیات سے بھی مترشح ہوں گی اور ان ہی خصوصیات کا خاص رنگ بالآخر ان افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عمل ہوں گے۔

حاصل یہ ہے کہ ایک فقہ کا مقلد بظاہر تو جزئیات فقہ کی تقلید کرتا ہے لیکن بنظر حقیقت وہ ان اصول کی تقلید کرتا

ہے جن سے وہ فقہ بنتا ہے اور اسے راہ عمل پر حقیقۃً وہ کلیات چلاتی ہیں جو ان جزئیاتِ فقہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں۔

پس اگر دو فقہوں پر چلنے والا مثلاً ایسی جزئیات کا انتخاب کرے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نہ ہوں اور دونوں فقہوں کی تصیدان غیر متعارض جزئیات میں شروع کردے تو گو وہ جزئیاتی تناقض میں گرفتار نہ ہو مگر در حقیقت اس کلیاتی تناقض کا شکار رہے گا جو ان جزئیات کی تشکیل کی ضامن ہیں اور ان میں رچی ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولاً متناقض اور ذوقاً متخالف ہیں تو اس مقلد میں بھی یقیناً دو ذوقی رنگ اپنے تناقض سمیت بھرے جائیں گے۔ اندریں صورت ناگزیر ہے کہ باطنی طور پر اس کے روحانی مزاج میں فساد پیدا ہو اور وہ متضاد اثرات کی کشاکش کا شکار ہو کر پراگندہ حال بن جائے اگر فی الحال تناقض مضر ہے اور وہ جزئیات کو ناقابل عمل بنا سکتا ہے تو وہی تناقض کلیات کو ناقابل نظر کیوں نہیں بنادے گا؟ اور جبکہ عمل نظر کے تابع ہے تو بالواسطہ اس کے عمل میں مفاسد پیدا ہوں گے جو بعد چندے ظاہر ہونے لگیں گے۔

ائمہ کے اختلاف مزاج سے پیدا شدہ مختلف اصول..... ائمہ کے اس اختلاف مزاج کو مثلہ سے واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس پر غور کیجئے کہ مثلاً تعارض روایات کے وقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اس سے پیدا شدہ قوت سند ہے وہ روایات متعارضہ میں عموماً قوت سند کے معیار سے ترجیح دیتے ہیں۔ پس جس حدیث کی سند اصول روایت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہوگی وہ اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دے کر دوسری ضعیف السند روایات کو جو اس کے خلاف ہیں یا ترک کر دیں گے یا مرجوح قرار دیں گے یا اس کی کوئی توجیہ کریں گے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دارالہجرۃ کا ایسی صورت میں سب سے بڑا اصول تاسی باسوۃ السلف ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان دو متخالف روایات میں اہل مدینہ کا تعامل کس طرف ہے۔ یہ تعامل جس روایت کے ساتھ ہوگا وہ اختلافی مسائل میں اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دیں گے اور بقیہ روایات کو ترک کر دیں گے ان کی کوئی توجیہہ کریں گے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اصولی معیار ایسے اختلافی مواقع پر رجحانات سلف کا تتبع ہے کہ کثرت سے فتاویٰ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین و تابعین رحمۃ اللہ علیہ کس طرف ہیں۔ جدھر بھی یہ صورت ہوگی وہ اسی روایت کو مذہب کی اصل قرار دے کر بقیہ روایات کا اس سے فیصلہ کر دیتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اس سے پیدا شدہ اصول ایک خاص جامعیت کے ساتھ تطبیق و توفیق بین الروایات ہے۔ یعنی وہ ایک باب کی تمام متعارض روایات کو جو قابل احتجاج ہوں بیک دم سامنے لاکر ان کے مجموعہ سے شارع علیہ السلام کی غرض و غایت کا پتہ چلاتے ہیں اور نور اجتہاد سے یہ دیکھتے ہیں کہ آخر اس مسئلہ سے شارع علیہ السلام کا منشاء کیا ہے۔ یہ منشاء جس روایت میں زیادہ واضح ہوتا ہے اس کو مذہب کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اگر چہ وہ سنداً کچھ ضعیف ہی ہو اور بقیہ روایات کو اس طرح اس کلی غرض و غایت سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ساری روایات اپنے اپنے محل پر چسپاں نظر آنے لگتی ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ تمام روایات میں مسئلہ ایک ہی

ہے مگر کسی روایت میں اس کا حکم ہے کسی میں اس کی حکمت ہے اور کسی میں اس کی کیفیت ہے اور کسی میں اس کی کمیت ہے، کسی میں اس کی اصلیت ہے اور کلیت ہے اور کسی میں اس کے احوال وعوارض ہیں۔ غرض روایات کو غرض شارع کے سلسلہ سے ترتیب وار جوڑ کر انہیں جمع کر دینا امام رحمۃ اللہ علیہ کا اصل اصول ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کلام پیغمبر کا ہر گوشہ تا بحد امکان زیر اعمال آ جائے زیر اہمال نہ رہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تفقہ کی چند امثلہ..... مثلاً صوم سفر کے سلسلہ میں مختلف احادیث وارد ہوئیں کسی حدیث میں نمایاں ہے کہ سفر میں صوم افضل ہے افطار سے۔ چناں چہ حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هِيَ رُخْصَةٌ مِّنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَمَنْ اَخَذَبِهَا فَحَسَنٌ وَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّصُوْمَ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِ. ① ”افطار کرنا اللہ کی طرف سے رخصت ہے جو اسے اختیار کرے گا تو یہ خوبی کی بات ہوگی اور جو روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں“۔

اس حدیث میں افطار کو رخصت فرما کر اس کو حسن فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ عزیمت روزہ ہی رکھنا ہے مگر جائز افطار بھی ہے۔ بعض روایات سے واضح ہوتا ہے کہ افطار افضل ہے صوم سے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ کسی غزوہ میں بزمانہ رمضان ہم سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہجوم دیکھا کہ ایک شخص پر سایہ کیا جا رہا ہے۔ فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ ایک روزہ دار کی حالت گرمی سے بہت بگڑ رہی ہے۔ فرمایا لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ. ② ”سفر میں روزہ رکھنا کوئی خوبی نہیں“۔

دوسری حدیث میں ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک سفر میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ کچھ لوگ روزہ دار تھے، کچھ بے روزہ، منزل پر پہنچ کر روزہ دار تو بے دم ہو کر گر پڑے اور بے روزہ لوگوں نے کام کیے، خیمے گاڑے، جانوروں کو پانی پلایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ بِالْاَجْرِ ③ ”بے روزہ لوگ اجر سمیٹ لے گئے“۔

اور بعض روایات میں صوم اور افطار میں تخییر معلوم ہوتی ہے کہ خواہ روزہ رکھ لو خواہ افطار کر لو، دونوں برابر ہیں۔ چناں چہ ان ہی حضرت حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَ اِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ ④ ”بحالت سفر جی چاہے روزہ رکھ لو اور جی چاہے افطار کر لو“۔

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب التخيير في الصوم ج:٥ ص:١٥٢.

② الصحيح للبخاري، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لمن ظلل عليه ج:٧ ص:٢٩.

③ الصحيح للبخاري، كتاب الجهاد والسير، باب فضل الخدمة في الغزو، ج:١٠، ص:١٥.

④ الصحيح للبخاري، كتاب الصوم باب الصوم في السفر والافطار، ج:٧، ص:٢٣.

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ واوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث انس ؓ کو اختیار کر کے کہا کہ: سفر میں افطار افضل ہے تو انہوں نے افضل صوم اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض افضلیت صوم کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت افطار اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض تخییر کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت افطار اور افضلیت صوم دونوں کی نفی کر دی اور معیار انتخاب روایات ان حضرات کے یہاں وہی حدیث کی سند کی قوت وضعف یا تعامل کی مطابقت وغیرہ ہے۔ لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تطبیق وتوفیق روایات کے ماتحت تینوں قسم کی روایات کو جمع فرما کر سب کو قابل عمل بنا دیا اور کسی ایک جہت کی نفی نہیں کی۔ انہوں نے نور اجتہاد اور ذوق تشریع سے دیکھا کہ ان مختلف روایات سے شارع علیہ السلام کی غرض مختلف احوال میں مختلف احکام دینا ہے نہ کہ ایک حکم سے دوسرے کی نفی کرنی ہے۔ پس حدیث تخییر کو تو مساوات فی الجواز پر محمول فرمایا کہ اس سے شارع کی غرض صوم وافطار دونوں کو بلا کراہیت جائز بتلانا ہے کہ نفس جواز صوم وجواز افطار میں کوئی تفاوت نہیں اور افضلیت صوم کی روایت کو اصل پر محمول فرمایا کہ بالذات صوم ہی افضل ہے کیونکہ رمضان زمانہ ہی صوم کا ہے اس میں افطار کسی طرح اصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اصلی افضلیت صوم ہی کو حاصل رہے گی جس کو اس روایت سے نمایاں فرمانا مقصود ہے اور افضلیت افطار کی روایت کو عوارض پر محمول فرمایا کہ جب حالت پریشان کن ہوجائے اور روزہ رکھنے میں تعب حد اعتدال سے گزرنے کا خطرہ ہو تو پھر عارضی فضیلت افطار ہی میں ہے۔ پس تخییر ہوئی جواز میں۔ افضلیت صوم ہوئی اصلیت صوم اور وقت میں اور افضلیت افطار ہوئی احوال صائم میں اور ظاہر ہے کہ جب مسافر پر یہی تین احوال آسکتے تھے تو شارع نے تینوں حالات کا حکم بیان فرما دیا پس ان تین حالات کی تفسیر نے ساری روایات کو ایک نقطہ پر جمع کر کے ان کے تعارض کو اٹھا دیا۔ تخییر بھی باقی رہی۔ افضلیت صوم بھی قائم رہی اور افضلیت افطار بھی ثابت رہی کسی ایک حکم سے دوسرے حکم کی نفی نہ ہوئی۔

پس امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس علم وفقہ سے ساری احادیث کو جمع کر کے قابل عمل بنا دیا نہ ان میں اور نہ کسی حدیث میں دور از کار تاویل وتوجیہ کی ضرورت پیش آئی۔ یا مثلاً شک کے بارہ میں تین قسم کی احادیث وارد ہوئیں۔ ایک یہ کہ جب شک ہوجائے کہ کتنی رکعات پڑھی ہیں تو نماز کا اعادہ کرنا چاہئے "اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فَلْیَسْتَأنِف" "جب کسی کو نماز کی رکعات میں شک پڑ جائے تو نماز لوٹا لے"۔

دوسری یہ کہ بصورت شک نماز ہی میں تحری کرنی چاہئے یعنی اٹکل لگا کر غور کرنا چاہئے کہ کتنی رکعات ہوئیں۔ جدھر غلبہ ظن ہو، اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے۔ "اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلٰوتِہٖ فَلْیَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْیُتِمَّ عَلَیْہِ" جب کسی کو تم میں سے نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے تو اٹکل لگانی چاہئے۔ اور اسی پر (جو اٹکل میں غلبہ ظن سے دل میں جم جائے) نماز پوری کر لینی چاہیے"۔

تیسری روایت میں ہے کہ جب شک ہوجائے اور اٹکل سے غلبہ ظن بھی کسی جانب سے حاصل نہ ہو کہ تین رکعت ہوئی ہیں یا چار تو جانب اقل کو اختیار کر کے اس پر نماز کی بناء کرو۔ تین اور چار میں اقل عدد تین کا ہونا

بہر صورت یقینی ہوگا۔ اس لئے یقینی جہت لے لو۔ چناں چہ عطاء بن یسار کی حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ''اِذَا شَکَّ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلٰوتِہٖ فَلَمْ یَدْرِ کَمْ صَلّٰی؟ ثَلٰثًا اَوْ اَرْبَعًا فَلْیَطْرَحِ الشَّکَّ وَلْیَبْنِ عَلٰی مَا اسْتَیْقَنَ''۔ ''جب تم میں سے کسی کو نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار، تو شک کو چھوڑ کر جو جانب یقینی ہے (یعنی اقل) اسی پر بنا کرنی چاہیے''۔

ان تینوں احکام میں سے ایک ایک کو ایک ایک مجتہد نے اختیار کر لیا ہے بعض نے شک کی صورت میں اعادۂ صلوٰۃ کا حکم اختیار کر لیا ہے تو انہیں قدرتی طور پر تحری (عمل بغلبہ ظن) اور بناء علی الاقل کی نفی کر دینی پڑی ہے۔ جمہور نے تحری اور غلبہ ظن کا اعتبار کیا ہے تو انہیں استیناف اور بناء اقل کا حکم ترک کر دینا پڑا ہے لیکن جب کہ یہ تینوں صور حدیث میں آ چکی ہیں تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جمع بین الروایات کے اصول کے تحت تینوں احکام کو بیک وقت اختیار کر کے تینوں قسم کی روایات کو جمع فرما دیا۔ اگر عمر میں پہلی بار شک پڑا تو اس کے لئے اعادہ صلوٰۃ کا حکم ہے کیونکہ بار بار کے شک اور اعادہ سے جب شک کا وقوع عادۃً ضروری ہے نماز وبال جان ہو جائے گی جو تیسیر دین کے خلاف ہے اور حرج شرعاً مدفوع ہے اگر ایک سے زائد بار شک پڑنے لگے تو تحری کا حکم ہے کہ غلبہ ظن پر عمل کیا جائے اور اگر غلبہ ظن کسی جانب نہ ہو بلکہ دونوں جانبین میں شک مساوی رہے تو جانب اقل کو اختیار کیا جائے جو یقینی ہے۔ اس صورت میں اعادہ صلوٰۃ تحری اور بناء اقل تینوں حکم جمع ہو گئے اور روایات میں کسی کا رد اور کسی کا قبول لازم نہ آیا جس کی فقہی روح یہ ہے کہ شک ہو جانے پر اعادۂ صلوٰۃ، تحری اور اختیار اقل در حقیقت حصول یقین اور دفع شک کے لئے ہیں اور ظاہر ہے کہ بالکل ابتدائی شک میں جو ایک مرض نا آشنا کی طرح نماز میں طاری ہوا حصول یقین اعادہ صلوٰۃ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے کہ پچھلی مشکوک نماز ترک کر دی جائے۔ کیونکہ جس کے لئے شک کا مرض ہی نیا ہے وہ ابتداءً ہی اس کے علاج پر غور کر سکتا ہے۔ ہاں بار بار کے شک میں جبکہ عادۃً اس کی حقیقت کھل گئی اور وہ عادت بھی بن گئی۔ نماز میں رہتے ہوئے بھی اس کا علاج ممکن ہو گیا اور وہ تحری اور اٹکل سے غلبہ ظن معلوم کر لینا ہے جدھر بھی غلبہ ہو گیا خواہ تین رکعت کی طرف یا چار کی طرف۔ پس امام صاحب کے طریق کے مطابق حدیث کے یہ تینوں احکام ایک دوسرے کی نفی اور تردید کے لئے نہیں رہتے بلکہ مختلف حالات کے مختلف احکام بن جاتے ہیں جن میں نہ تعارض ہے نہ تدافع اور تینوں احادیث اپنی اپنی جگہ چسپاں ہو کر قابل عمل ہو جاتی ہیں۔ غرض امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذوق اجتہادیات میں یہ ہے کہ تابحد امکان ہر حدیث زیر اعمال آئے۔ زیر اہمال نہ رہے۔ اس لئے وہ عامۃً متعارض روایات میں سند کی قوت وضعف کے معیار سے ترجیح وانتخاب کی صورت اختیار نہیں فرماتے کہ اس میں کسی نہ کسی جہت سے ترک حدیث یا ترک عمل بالحدیث لازم آ جانا یقینی ہو جاتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ترک ہو۔ جس کی صورت انہوں نے یہی اختیار فرمائی کہ ایک باب کی تمام احادیث سے وہ پہلے شارع کی غرض وغایت کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر اسی بنیادی غرض

پر تمام احادیث کو دائر فرما دیتے ہیں۔ متعارض روایات میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تطبیق اور جمع بین الروایات اور دوسرے حضرات ائمہ کی ترجیح وتعلیل روایات کی امثلہ بکثرت ہیں جن سے فقہ حنفی بھری پڑی ہے۔ نمونہ کے طور پر یہ دو مثالیں جو اس وقت سامنے آ گئیں عرض کی گئیں۔

اس طولانی بحث سے غرض یہ ظاہر کرنا ہے کہ اصول اجتہاد ائمہ کے فطری مزاج کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ طبیعت میں جامعیت ہے تو اصول بھی جامعیت کے وضع ہوں گے۔ طبیعت میں ظاہریت ہے تو اصول میں بھی ظاہریت کا رنگ رہے گا اور طبیعت میں تاسی بالاسوہ کا مزاج ہے تو اصول میں بھی وہی رنگ نمایاں ہوگا اور ان ہی اصول پر مجتہد کا پورا فقہ مرتب ہوتا ہے جس سے متبعین فقہ اور مقلدین کی ذہنی اور عملی تربیت ہوتی ہے۔ جن اصول میں تخالف ہوگا تو مقلد کی ذہنیت پر عملی جزئیات کا اثر بھی متضاد ہی پڑے گا۔ گو ابتداء سے اسے کوئی جزئیاتی تخالف اور تضاد محسوس نہ ہو کیونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ مربوب میں سامان تربیت اثر انداز نہ ہو یا مثلاً متعارض روایات میں امام صاحب کا ایک خاص اصول یہ بھی ہے کہ وہ کسی باب کی ایسی حدیث کو جو کلیہ اور ضابطہ عامہ کا رنگ لئے ہوئے ہو اصل قرار دے کر اس باب کے جزئی افعال کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں اور اس کلیہ کے خلاف پڑتے ہوں اس کلیہ کے تابع کرتے ہیں کلیہ کو افعال جزئیہ کے سبب توڑنا پسند نہیں کرتے کہ وہ معلوم السبب اور معلوم العلت ہے اور افعال جزئیہ واقعہ حال ہوتے ہیں جن میں کوئی عموم نہیں ہوتا کلیہ کو اصلیت پر باقی رکھ کر ان جزئی واقعات کی کوئی ایسی توجیہ فرما دیتے ہیں کہ وہ اس کلیہ کے مخالف نہ رہیں بخلاف دوسرے آئمہ کے کہ وہ ان جزئیات کی محض سندی قوت دیکھ کر ان سے کلیہ کی تخصیص کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً آداب خلاء کے سلسلہ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیث میں ایک کلیہ ارشاد فرمایا گیا إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا وَلَكِنْ شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوا. ① ”جب تم استنجاء کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ رخ ہو کر بیٹھو اور نہ قبلہ پشت ہو کر بلکہ شرقاً غرباً بیٹھو (تاکہ قبلہ بغل میں رہے)“۔

یہ ایک حکم عام ہے جس میں استقبال واستدبار کو کسی مکان کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا کیونکہ یہ حکم عظمت بیت اللہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے تاکہ افعال خسیسہ کے وقت قبلہ کا استقبال واستدبار نہ ہو کہ وہ صورت توہین بیت اللہ ہے اور تعظیم بیت اللہ فی نفسہٖ حسن اور ہر زمان ومکان میں مطلوب ہے۔ چنانچہ حکم کی یہ علت ایک دوسری حدیث میں صراحتاً مذکور بھی ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ إِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الْبَرَازَ فَلْيُكْرِمْ قِبْلَةَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ ② ”جب تم میں سے کوئی استنجاء کے لئے جائے تو چاہیے کہ قبلہ الٰہی کا اکرام کرے اس کا استقبال نہ کرے یعنی قبلہ رخ ہو کر نہ بیٹھے“

① الصحيح للبخاري، كتاب الصلوٰة، باب قبلة أهل المدينة وأهل الشام والمشرق ج۲ ص: ۱۵۳۔

② السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الطهارة، باب ماورد في الاستنجاء بالتراب، ج۱ رقم: ۱۱۱۔

پس جبکہ اکرام بیت اللہ کی علت سے بحالت بول و براز استقبال واستدبار قبلہ ممنوع تھا اور یہ علت فی نفسہ مطلوب ہونے کے سبب کسی قید سے مقید نہ تھی تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مذہب کی اساس اس کلیہ کو قرار دے کر مطلقاً استقبال واستدبار کی حرمت کا فتویٰ دے دیا خواہ مکان ہو خواہ جنگل ہو بحالت قضاءِ حاجت استقبال قبلہ اور استدبار دونوں غیر جائز ہیں جس کیلئے اس حدیث کو بطور ایک کلی ضابطہ اور دستور العمل کے پیش فرمایا۔ مگر اس کلیہ کے خلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ افعال ثابت ہوئے۔ چناں چہ حسب روایت بخاری رحمۃ اللہ علیہ و مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حفصہؓ کے مکان کی چھت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی طرف پشت کئے ہوئے اور شام کی طرف رخ کئے ہوئے پیشاب کرتے خود دیکھا۔ امام صاحب نے اپنے ذوق خاص سے جن کا ذہن کلی انضباط اور تعلیمات کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ اس جزئیہ سے متاثر ہوئے بغیر ضابطہ کلیہ کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور اس جزئی واقعہ کی ایسی توجیہات فرمادیں کہ وہ اس کلیہ کے خلاف نہ رہے کیونکہ کلیہ کا حکم جس علت پر دائر ہے یعنی تعظیم بیت اللہ وہ مکان اور صحراء ہر جگہ موجود ہے تو اس کو کسی ایسے جزئی واقعہ سے کیوں توڑا جائے جس کی نہ علت کا پتہ ہے نہ سبب کا۔ لیکن دوسرے ائمہ نے جن کا ذہن تخصیصات کی طرف زیادہ چلتا ہے اس کلیہ کو اہمیت نہیں دی بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کلیہ کا ہم پایہ جزئیات کو بناتے ہوئے یا اس جزئی واقعہ سے کلیہ سابقہ کی تخصیص کرتے ہوئے فرمایا کہ استقبال واستدبار مکان میں جائز اور صحراء میں غیر جائز۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ استدبار ہر جگہ جائز اور استقبال ہر جگہ غیر جائز۔

بہر حال یہ اختلاف اسی اصول استنباط کے اختلاف کے تابع ہے کہ اور حضرات نے صرف حکم حدیث پر نظر فرمائی اور امام صاحب نے حکمت حدیث پر، اوروں نے ظہر حدیث لیا اور امام نے بطن حدیث کو آگے رکھا اور شارع علیہ السلام کا یہ منشاء پا کر کہ اصل مقصود حرمت بیت ہے اسے ہی بنیاد قرار دے دیا اب جو روایت اس کے خلاف آئی اس کی وجہ سے بنیاد کو منہدم نہیں ہونے دیا بلکہ اسے ہی بنیاد سے جوڑ دیا۔ پس ایک مقلد جو اس مسئلہ میں امام کی تقلید کرے گا وہ درحقیقت ان اصول کی تقلید کرے گا جو ان مسائل میں سمائے ہوئے ہیں اور جبکہ ان میں تخالف ہے تو ان کی جزئیات میں بھی ہے یا مثلاً کہیں کہیں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایک باب کے اصل موضوع کی روح پر مطلع ہوتے ہیں جو نصوص کتاب وسنت سے ان پر منکشف ہوتی ہے اور اس کو بنیاد قرار دے کر اس باب کی تمام روایات کے انتخاب کا معیار اسی روح کو قرار دیتے ہیں اور خلاف روایت کی ایسی توجیہ فرما دیتے ہیں کہ اس روح پر کوئی اثر نہ پڑے لیکن دوسرے ائمہ مثلاً اس باب کی روح دوسری سمجھتے ہیں تو احکام میں اختلاف اس روح کے تفاوت سے پڑ جاتا ہے۔

مثلاً صلوٰۃ کے بارے میں جب فعلی اور ترکی احادیث آتی ہیں تو امام صاحب اکثر و بیشتر ترکی احادیث کو اختیار کرتے ہیں اور فعلی احادیث کو ان کے تابع کرتے ہیں جیسے قراۃ فاتحہ خلف الامام اور ترک قرآۃ فاتحہ کی

روایات میں ترک قراۃ کو، رفع یدین اور ترک رفع یدین میں ترک رفع کو، جہراً آمین اور ترک جہر میں ترک جہر کو جہر بسم اللہ اور ترک جہر میں ترک جہر کو، نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو روکنے کے لئے جمع بین الاشارۃ والتسبیح کی بجائے ترک جمع کو اختیار فرمایا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امام کے نزدیک نماز میں فعل پر ترک کو یا حرکت پر سکون کو ترجیح ہے۔ شاید اس بناء پر کہ امام کے نزدیک نمازی کی بناء سکون پر ہے حرکت پر نہیں اور یہ لطیفہ امام پر آیات و روایات اور نماز کے انداز تشریع سے منکشف ہوا۔ مثلاً نماز کی اصلیت کے بارہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ ① ''نماز بھاری ہے مگر خشوع والوں پر''

اور خشوع کی حقیقت سکون ہے جو اولاً قلب میں آتا ہے اور پھر قالب پر، پھر اسی کے ساتھ امام نے نماز کی رفتار تشریع پر نظر فرمائی ہو کہ اس میں بھی حرکت سے سکون کی طرف آئے مثلاً پہلے نماز میں نقل و حرکت جائز تھی بعد میں نص حدیث سے منسوخ ہوئی اور سکون آ گیا، پہلے سلام کلام جائز تھا بعد میں نص حدیث اس سے روک کر سکوت کا حکم دیا گیا، پہلے التفات (ادھر ادھر دیکھنا) جائز تھا بعد میں منسوخ ہو کر اس بارہ میں سکوت پیدا کر دیا گیا، اولاً نشر کی حرکات کے ساتھ نمازیں جائز تھیں بعد میں انہیں منسوخ کر کے نماز میں سکون پیدا کر دیا گیا۔

بہر حال رفتار تشریع حرکت سے سکون کی طرف آنا تھا تو امام کے اس قلب صافی نے جو ایک اساسی رنگ تشریع سے مصبغ (رنگا ہوا) اور افتادِ شریعت کا محرم راز تھا یہ اخذ کیا کہ نماز میں اصل چیز سکون ہے۔ لہٰذا جتنا سکون ترقی کرتا جائے گا نماز کی حقیقت سے اشتباع زیادہ ہوتا جائے گا۔ شارع کی اس غرض کو پیش نظر رکھ کر امام کے نزدیک جب امام کے فعلی اور ترکی امور میں اختلاف و تزاحم واقع ہوا تو انہوں نے اسی رفتار اور لون اجتہاد کے ماتحت جانب سکون کو ترجیح دی اور تمام وہ روایت اختیار کر لیں جو اس رنگ پر مشتمل تھیں کہ ان کے نزدیک یہی روایات غرض شارع سے زیادہ موافق تھیں۔ خواہ سنداً وہ کسی درجہ کی ہوں، مگر قابل احتجاج ہوں۔ لیکن اس کے برخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فعلی اور ترکی روایات میں سے عموماً فعلی روایات کو ترجیح دی ہے۔ قراۃ فاتحہ کو اختیار کیا، رفع یدین کو ترجیح دی، جہراً آمین کو منتخب فرمایا، جہر بسم اللہ کو اولیٰ کہا وغیرہ وغیرہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کی ہیئت کذائی پر غور کر کے اسے فعل سمجھا ہے اور جب وہ از قسم فعل ہے تو اس میں افعال جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کا حسن بڑھتا جائے گا۔

حج میں اس کے برعکس قصہ ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ حج کی عبادت ہی حرکت ہے گھر سے نکلنا، بیت اللہ کے گرد گھومنا، صفا مروہ میں دوڑنا، عرفات کا سفر اختیار کرنا، منیٰ میں رمی جمار کرنا وغیرہ۔ غرض پوری عبادت ایک مستقل سفر اور متعدد انواع حرکات کا مجموعہ ہے۔ پس جتنے بھی افعال اور حرکات زائد ہوں گے، حج میں حسن پیدا ہوگا۔ اس لئے اس عبادت میں ان روایات کو ترجیح دی ہے جو کسی حرکت اور فعل پر مشتمل ہیں

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۴۵۔

بخلاف امام شافعی رحمہ اللہ، کہ انہوں نے حج میں اس کے برعکس جانب سکون اور تقلیل حرکت کی جہت کو اختیار فرمایا ہے شاید اس لئے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حج مظاہرہ محبت ہے اور محبت کا ثمرہ ربودگی اور ترک ہے۔ ترک وطن، ترک لباس، ترک زینت، ترک خوشبو، ترک راحت، ترک لذت وغیرہ اس لئے اس عبادت میں جتنے تروک بڑھتے جائیں گے۔ اس کی حقیقت تام ہوتی جائے گی مثلاً قارن کے حق میں امام صاحب کے یہاں دو طواف اور سعی ہے اور شوافع کے یہاں ایک طواف اور سعی ہے وہ تکثیر فعل کی طرف گئے اور یہ تقلیل فعل کی طرف۔ اس قسم کی سدہا امثلہ کتب فقہ سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ بہر حال حجت احوال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غائر نظر ہمیشہ اصول اور تہ کی طرف دوڑتی ہے اور وہ ہر مسئلہ کی لم اور اس کی اندرونی بنیاد تک پہنچ کر غرض شارع کا پتہ چلاتے ہیں۔ اسی باطنی غرض اور حکمت کے معیار سے روایت کے احکام کے درجات قائم کرتے ہیں اور ان میں تطبیق و توفیق دیتے چلے جاتے ہیں اسی لئے ان کے فقہ میں کلیات، تعمیمات اور ہمہ گیری بہت زیادہ ہے، دوسرے حضرات حکم دیکھتے ہیں اور اسی کو اصل قرار دے کر روایات پر نظر کرتے ہیں تو احکام میں تعداد اور تکثیر تو زیادہ ہوتی ہے مگر انضباط تسلسل اور ترتیب اس طرح کی نہیں آتی کہ ہر ہر جزئیہ کسی نہ کسی اصل اصل سے جڑا ہوا نظر آئے اور ہر ہر حکم کسی نہ کسی حکمت سے مربوط دکھائی دے۔

ظاہر ہے کہ تسلسل اور ترتیب میں انضباط ہوتا ہے اور دوسری صورت میں تکثیر احکام، اسی لئے فقہ حنفی میں ترتیب وتسلسل اور جامعیت واجتماعیت کا رنگ غالب ہے اور دوسری فقہیات میں تکثیر احکام اور تکثیر جزئیات کا رنگ غالب ہے اور کلیاتی دائرہ محدود ہے، ظاہر ہے کہ جب یہ مخصوص رنگ کے اصول اپنے اپنے فقہ کے تمام ابواب اور ساری ہی اجتہادی فروع میں رچے ہوئے ہوں گے گویا ایک فقہ کے سارے مسائل کی تشکیل یہ ایک ہی رنگ کے اصول کریں گے تو اس پوری فقہ کا ایک مزاج قائم ہو جائے گا جو اپنے امام کے ذہنی مزاج کے مطابق ہوگا۔ پھر وہی ذہنی مزاج ان کا بھی بنے گا۔ جو اس فقہ کی تقلید کریں گے، کیونکہ مربوب کی ذہنیت مربی ہی کی ذہنیت سے بنتی ہے۔ اس صورت میں دو فقہوں کی جزئیات خواہ کتنی ہی غیر متباین ہوں اور بظاہر سطح تناقض سے کتنی ہی بعید ہوں مگر یہ ذوقی الوان اور اصول استنباط کا تناقض ان میں رچ کر انہیں اصولی طور پر متضاد بنادے گا اور یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تقلید حقیقۃً جزئیات کے پردہ میں ان اصول کی ہوتی ہے جو ان جزئیات کو پردہ ظہور پر لاتے ہیں اور وہ متعارض ہیں تو وہی تضاد پھر باقی رہا، جزئیاتی نہ سہی کلیاتی سہی اور جبکہ یہ اصول وکلیات ہی اصل میں محل تقلید ہیں تو خاص کی نظر میں یہ تضاد اس سے اشد ہوگا جو جزئیاتی تھا کہ جزئیات تقلید کے بارہ میں اصل ہی نہ تھیں۔ یہ اصول ہی اصل تھے اور اصل کا فساد فروع کے فساد سے عقلاً وشرعاً مہلک تر ہوتا ہے۔

پس ایسے اصولی اختلاف کے ہوتے ہوئے دو فقہین کی بیک دم تقلید کیا جانا اور بالفاظ دیگر ایک فقہ کی تربیت کے ہوتے ہوئے دوسرے فقہ کی تربیت کا رنگ اس پر چڑھایا جانا علاوہ تربیت کی دو عملی اور تضاد حالی کے ہر مربی

امام کی تربیت کو ناقص اور نکما بنالینا ہے۔

مثلاً اگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان ہی اصول استخراج پر نماز کے ذریعہ سکون اور حج کے ذریعہ حرکت کا ذوق حال فقہ میں راسخ کرنا چاہتے ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے برعکس اور اس ہر جائی مقلد نے نماز حنفی اصول پر پڑھ کر حج شوافع کے طریق پر کرلیا تو ذوق حرکت اسے کسی طرف سے بھی نہ مل سکے گا کیونکہ اس کی نماز تو ساکن رہی حنفی اصول پر اور حج ساکن رہا شافعی اصول پر۔ حالانکہ جو امام اپنے ذوق اجتہاد سے اس میں نماز کا سکون پیدا کرنا چاہتا تھا وہ اسی ذوق سے اس میں حج کی حرکت بھی راسخ کرنا چاہتا تھا کہ اس مجموعہ ہی سے اس کے نزدیک مقلد کی ذہنیت میں صحیح توازن پیدا ہو سکتا تھا اور اسی میں اس کی روحانی فلاح تھی لیکن جبکہ اس مقلد نے آدھی تربیت ایک سے کرائی اور آدھی ایک سے اور وہ بھی دونوں جانبین کے سکون عبادت ہی کی جہت لے لی تو اول تو کسی امام کے رنگ پر بھی اس کی تربیت مکمل نہ ہوئی اور جتنی ناقص بھی ہوئی وہ بھی دورخی مقام کی طرح ایک ہی جانب پر مشتمل رہی گویا یہ مقلد ناقص بھی رہا اور ایک جہت بگھنے سے بھی خالی رہا اور اوپر سے کلیاتی تضاد حال کا شکار بھی ہو گیا، جو اس کے فساد مزاج کا پورا پورا سامان ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مریض، یونانی طبیب کا علاج کراتے ہوئے بعض ڈاکٹری ادویہ بھی استعمال کرنے لگے ظاہر ہے کہ ادویہ میں کوئی تعارض نہیں لیکن ادویہ کے مخفی سلسلہ میں جس کو روش علاج اور طریق تدبیر کہنا چاہئے اصولی تعارض ضرور موجود ہے جو مریض کے مزاج کو فاسد کر دینے کے لئے کافی ہے کیونکہ ڈاکٹر اپنے اصول اور روش علاج کے ماتحت مثلاً مریض کو۔ دودھ کی تاکید کرے گا اور طبیب اپنی روش فن کے لحاظ سے اس سے روکے گا، ڈاکٹر مثلاً پھلوں کا استعمال ضروری قرار دے گا طبیب اس سے مانع آئے گا ڈاکٹر ایک غذا تجویز کرے گا، طبیب اس کے خلاف دوسری، غرض ایک جزوی دوا کے استعمال میں تو بظاہر کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا تھا مگر یہ دوا جس مجموعی روش اور جس ڈاکٹری اصول کے نیچے آئی ہوئی ہے وہ یقیناً اس روش واصول کے معارض ہے جو طب یونانی کی ادویہ کی پشت پر ہیں اس ایک جزوی دوا کے راستہ سے یہ اصولی تعارض مریض پر متضاد آثار ڈالے گا اور مریض اس حالت میں زیادہ دن اپنی خیر نہیں منا سکے گا مگر اس مخفی مضرت کو عوام نہیں صرف اطباء ہی پہچان سکتے ہیں جن کے قول پر اعتماد کرنے کے سوا مضرت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

عدم تقلید یا تلفیقین میں دائر سائر رہنے کے چند واضح مفاسد..... ساتھ ہی اس پر غور کیجئے کہ اس ہر جائی پن اور تلفیقین میں دائر رہنے کی عادت کا طبعی اثر ایک دوسری نوعیت مفاسد کی یہ ہوگی یہ شخص کئی کئی ائمہ اور معتین کی طرف رجوع کرتے رہنے کی حالت میں اپنے نفس کے لئے سہولیات تلاش کرنے کا عادی ہو جائے گا جدھر سہولت دیکھی ادھر ہی سے فتویٰ لے لیا اور ادھر کا مقلد بن گیا، اس صورت میں گویا یہ تقلید غیر معین غلبہ ہوا و ہوس کے ماتحت اس کی مطلب برآری کا ایک آلہ اور حیلہ ہوگی اور ان کئی ائمہ کے پردہ میں درحقیقت مقلد اپنے نفس کا ہوگا، جس کے سامنے طاعت حق نہ ہوگی۔ بلکہ صرف اپنی راحت وسہولت ونفسانی شہوت ہوگی مثلاً ایک شخص نے وضو کیا اور پھر خون

نکلوایا جس پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضو ٹوٹ گیا تو اس نے کہا کہ: میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ لیتا ہوں کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کے بعد عورت کو شہوت سے ہاتھ لگایا جس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے تو اس نے کہا کہ: میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ لیتا ہوں کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور بلا تجدید وضو نماز پڑھ لی چونکہ اس شخص کا وضو بالا جماع ٹوٹ چکا ہے گو سبب مختلف ہوئے اس لئے اس کی نماز سب کے نزدیک باطل ہوئی مگر یہ اپنے نزدیک پھر بھی اپنے کو متوضی اور مصلی سمجھ رہا ہے جس سے علاوہ خرقِ اجماع کے مفسدہ کے اس شخص کی ساری تحقیق اور تقلید کا حاصل حظِ نفس اور مطلب برآری کے سوا کچھ نہ نکلا گویا اس کا دین اس کے ہوا کے تابع ہو گیا نہ کہ ہوائے نفس دین کے تابع ہوئی حالانکہ صریح ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: عَــنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ. ① ”عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے“۔ پھر فروع میں اس قسم کی آزادی کا خوگر ہو جانے سے اصول میں ایسی آزادی کا آجانا غیر مستبعد نہیں رہتا بلکہ عادۃً ایسا ہوتا ہے حالانکہ بعض حدیث شبہات میں پڑنے والا بالآخر حرام میں پڑ کر رہتا ہے۔

بہر حال ایسا مقلد عام جو بلا تعیین مختلف ائمہ کی تقلید کا خوگر ہے وہ یقیناً تلفیقین میں دائر سائر رہے گا خواہ وہ تلفیق جزیاتی ہو یا کلیاتی۔ ساتھ ہی ان متخالف اجتہادات کے آثار سے اس کا روحانی مزاج بھی فاسد ہوئے بغیر نہ رہے گا یا ہوائے نفس اس کے دین پر غالب آجائے گی یا وہ رضاءِ حق کا طالب نہ رہے گا یا اجماعِ امت کا ربقہ گلے سے نکال پھینکے گا اور نتیجۃً فروعات کی آزادی اصول تک پہنچ جائے گی اور اصول کو بھی حظِ نفس اور مطلب برآری ہی کا ذریعہ بنا کر بالآخر سرے سے دین کو کھو بیٹھے گا یہی وجہ ہے کہ روحانی تربیت اور نفسانی معالجہ کے سلسلے میں جس کے اطباء حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہیں ایک نبی کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے دوسری شریعت اور نبی کو حق جاننے کے باوجود اس پر عمل کرنے کی خاص طور سے ممانعت فرمائی گئی ہے اور ادب تو اتنا کہ ایک نبی اور اس کی شریعت کے انکار پر پورا دین حبط لیکن احتیاط اس پر یہ کہ اس سچے نبی کے ایک جزیہ پر بھی بلا اجازت نبی زمان عمل غیر جائز اور ممنوع جس کا راز یہی ہے کہ ہر شریعت کی تربیت کا رنگ جدا جدا ہے۔ نفس میں ان کے متضاد آثار پیوست ہونے سے اس نفس کی ہلاکت ہے نہ کہ تقویت، چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہود کی بعض باتیں ہمیں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں اگر اجازت ہو تو لکھ لیا کریں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَمُتَهَوِّكُوْنَ اَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى قَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا

① مشكاة، كتاب الايمان، باب الاعتصام، ج: ١ ص: ٣٦ رقم: ١٦٧۔ علامہ تبریزیؒ فرماتے ہیں: رواه في شرح السنة وقال النووي في اربعينه: هذا حديث صحيح رويناه في كتاب الحجة باسناد صحيح.

بَیْضَآءَ نَقِیَّةً وَلَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ. ① ''کیا تم اپنے احکام دین کے بارہ میں ابھی تک حیرت میں پڑے ہوئے ہو کہ دوسروں کی باتیں لکھنا چاہتے ہو؟ بلاشک میں تمہارے پاس ایک صاف اور روشن شریعت لے کر آیا ہوں اگر موسیٰ بھی آج زندہ ہوتے تو انہیں میرے اتباع کے سوا چارہ کار نہ تھا تو پھر تمہیں ان کا اور ان کی شریعت کا اتباع کب جائز ہے''؟

اس اصول پر مربیان باطن، حضرات صوفیا کرام قدس اللہ اسرارہم نے اپنے طریق تربیت کی بنیاد بھی توحید مطلب پر رکھی جس کا حاصل یہی ہے کہ ایک شیخ سے وابستہ ہو کر دوسرے کی طرف عملی رجوع کرنا باعث تباہی نفس ہے۔ادب و تعظیم بالاستثناء سب کا ضروری ہے لیکن اتباع صرف ایک کی کہ ہر مربی باطن کا رنگ ذات ہی الگ ہے۔اس سے پیدا شدہ اصولی تربیت کا رنگ بھی جدا جدا ہے اور اسی رنگ کے مطابق پروردوں کے نفوس پر احوال و کیفیات بھی اسی رنگ کے طاری ہونے ضروری ہیں۔پس اگر توحید مطلب باقی نہ رہے بلکہ طالب و سالک اپنے تلون کے تحت مختلف مشائخ میں دائر سائر پھرتا رہے تو اس میں یکسوئی، ایک رنگی اور دل جمعی کی دولت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو تمام کمالات باطن کی اساس ہے اور اس لئے اسے تمام عمر بھی بشاشت و تمکین میسر آسکتی جس کے لئے ساری ریاضات کی جاتی ہیں۔خلاصہ یہ کہ طریق نبوت ہو یا طریق ولایت دونوں میں توحید مطلب کے بغیر تربیت کا کام نہیں چل سکتا، پھر اسی طریق کی روشنی میں اطباء جسمانی کو بھی توحید مطلب بنام توحید مطب اختیار کرنی پڑی کہ اس کے بغیر مریض کی صحت ہی متوقع نہیں ہو سکتی۔

پس جو انتظام انبیاء علیہم السلام نے اپنی شان تربیت کو مؤثر بنانے کے لئے کیا، اولیاء نے اپنی شان معالجہ کو کامیاب بنانے کے لئے کیا۔اطباء نے اپنے طریق علاج کو نتیجہ خیز کرنے کے لئے کیا جس کا نام توحید مطلب یا توحید مطب ہے وہی انتظام بعینہ فقہاء ملت نے اپنی شرعی راہنمائی اور دینی تربیت کو پر اثر اور مثمر بنانے کے لئے فرمایا اور اپنی فقہی توحید مطلب کا نام تقلید شخصی یا تقلید معین رکھ کر یہ شرعی مطب کھول دیا تا کہ ایک ہی فقہ کو اپنا دستور زندگی ٹھیرا کر اور کئی کئی فقہیات اور فقہاء کے مخالف آثار تربیت کا شکار نہ بن کر اپنے دین پر یکسوئی اور طمانیت سے عمل پیرا رہے کہ اس کے بغیر تشویش و پراگندگی اور مذکورہ مفاسد کے بچاؤ کی کوئی دوسری صورت نہیں یہی وجہ ہے کہ قرون خیر گزر جانے کے بعد دانایان امت نے نظم ملت قائم رکھنے اور اسے تشتت و پراگندگی سے بچانے کے لئے اجتہاد و تقلید کا یہ ایک خاص نظام قائم کیا کہ نہ امت کو اجتہاد میں آزاد چھوڑا کہ ہر شخص مجتہد بن کر کتاب و سنت کو اپنی آراء و قیاسات کا کھلونا بنالے اور نہ تقلید میں آزاد چھوڑا کہ جس کی چاہے اور جتنوں کی چاہے تقلیدات میں چکر کھا کر اپنے نفوس کو تباہ کرلے بلکہ اجتہاد کا دائرہ بھی محدود رکھا جیسا کہ وہ تکوینا بھی محدود تھا اور تقلید کا دائرہ بھی تنگ کیا جیسا کہ وہ عقلاً تنگ ہی تھا کہ غیر معین نہ ہو اور معین ہو کر بھی ایسے فرد کی ہو جو علم و عمل، ورع و تقویٰ،

① شعب الایمان للبیهقی، ذکر حدیث جمع القرآن ج:۱ ص:۱۹۳۔

شعور تشریع علم لدنی، ادراک خواص و احکام، انکشاف اسرار و علل و جدان ظواہر و بواطن احساس و جزئیات و کلیات، شریعت میں یگانہ ہو، حاذق ہو اور اوپر سے اس کی یہ علمی و عملی قوت اسباب سے بالاتر ہو کر ایک موہبت الٰہی ہو جس کے ماتحت وہ اس آیت کا سچا مصداق ہو کہ ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾ ① ”اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے امر کی ہدایت کرتے ہیں جبکہ انہوں نے صبر اختیار کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں“۔ یہاں صبر کے لفظ سے قوت عملیہ کی طرف اشارہ ہے کہ تمام طاعات کا مبداء صبر ہے، یعنی وہ صبر علی الطاعات۔ اور صبر عن الشہوات میں راسخ القدم ہو جو مطلق عمل سے آگے کا مرتبہ ہے اور جس کو حدیث جبریل علیہ السلام میں احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے، ادھر ایقان سے قوت علمیہ کی طرف اشارہ ہے کہ علوم کی اساس یقین صادق ہی ہے، یعنی وہ پوری شریعت اور اس کے جزوی اور کلی مقاصد کے بارہ میں کمال یقین کے ساتھ درجہ معرفت پر آیا ہوا ہو جو ایمان سے آگے کا مرتبہ ہے جس کو قرآن نے اطمینان سے تعبیر کیا ہے۔

سلف میں تقلید معین عام تھی...... چناں چہ سلف سے لے کر خلف تک اخلاقی مسائل میں ایسے ہی جامع افراد کی تقلید معین بطور دستور العمل کے شائع ذائع رہی اور قرن صحابہ ہی سے اس کا وجود شروع ہو گیا تھا مثلاً حدیث حضرت حذیفہؓ جس کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: إِنِّي لَا أَدْرِي مَا قَدْرُ بَقَائِي فِيكُمْ فَاقْتَدُوا بِالَّذِينَ مِنْ بَعْدِي وَ أَشَارَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ وَّ عُمَرَ ② ”مجھے نہیں معلوم کہ میں تم لوگوں میں کب تک زندہ رہوں گا؟ سو تم لوگ ان دونوں کی اقتدا کیا کرنا اور اشارہ سے ابوبکرؓ و عمرؓ کو بتلایا“۔ ظاہر ہے کہ مِنْ بَعْدِي سے ان دونوں حضرات کی حالت خلافت مراد ہے کیونکہ بلا خلافت تو ہر دو حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی موجود تھے، مطلب یہ ہوا کہ ان کے خلیفہ ہونے کی حالت میں ان کی اتباع کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ خلیفہ ایک ہی ہوں گے نہ کہ دونوں اکٹھے۔

اس لئے حاصل یہ ہوا کہ صدیق اکبرؓ کی خلافت میں ان کی اور خلافت فاروقی میں ان کی اتباع کرنا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زمانہ خاص تک ایک معین شخص کے اتباع کا دین میں حکم فرمایا۔ یہ نہیں فرمایا کہ ان سے دلیل بھی ہر مسئلہ کی تحقیق کیا کرنا اور نہ یہ عادت مستمرہ تھی۔ یہی تقلید شخصی ہے کہ عملی مسئلہ پیش آنے پر کسی ایک عالم سے رجوع کر کے اس کے فتوی پر عمل کیا جائے لیکن دلائل کے پوچھنے کا کوئی التزام نہ تھا چناں چہ لوگوں کے سوال کرنے پر ان کے جو فتاوی روایات میں مذکور ہیں ان میں دلیل کا سوال ہے نہ دلیل کا اظہار۔ یہی تقلید شخصی تھی کہ ایک پر پورا ملک جمع ہو گیا اور بلا استفسار دلیل اس کے فتاوی پر عمل کرنے لگا، بخاری کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مسئلہ پوچھا۔ پھر وہی مسئلہ حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا۔ تو انہوں نے

① پارہ: ۲۱ سورۃ السجدۃ، الآیۃ: ۲۴۔

② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمر کلیھما ج: ۱۲ ص: ۱۲۲۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف بتایا جب حضرت ابوموسیٰ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ جب تک یہ حبر تم میں موجود ہے مجھ سے مسئلہ مت پوچھا کرو۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو تمام مسائل میں ایک طرف لگا دینا اور لوگوں کا اس پر عمل درآمد کرنا جس میں مطالبہ دلیل کا کوئی سوال نہیں، پس یہی تقلید شخصی ہے۔

اہل مدینہ عموماً حضرت زید بن ثابتؓ کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ عکرمہؒ کی روایت بخاری میں ہے کہ لوگوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ: ہم حضرت زید بن ثابتؓ کے قول کے خلاف آپ کے قول پر عمل نہیں کریں گے، جس سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کے امام و مفتی حضرت زید بن ثابت تھے اور لوگ ان کے فرمودہ کے مطابق عمل کرتے تھے خواہ وہ نص سے حکم دیں یا عدم نص کی صورت میں قیاس سے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن کے سبعۃ احرف کو حرف واحد پر منقصیر فرما دینا اور تمام محروسہ ہائے اسلامی میں صحابہؓ و تابعین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا اسی کو عملاً قبول کر لینا اتباع و تقلید معین نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح حکم حدیث تو موجود نہ تھا۔ ایک علت پر جس کو حضرت ذی النورین کے تفقہ نے ادراک کیا یہ حکم دائر تھا جبکہ ان کے نزدیک اس علت کا زمانہ ختم ہو گیا تو وہ حکم سبعۃ احرف بھی ختم ہو گیا۔ چنانچہ اس واقعہ کی روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس قیاسی حکم کو سب نے قبول کر لیا اور کسی نے بھی مطالبہ دلیل نہ کیا۔ اسی طرح اور قیاسی احکام میں بھی قرن صحابہؓ میں تقلید شخصی کی گئی ہے جیسا کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلہ اس شرط پر قرض دینے کو ناپسند کیا کہ وہ دوسرے شہر میں ادا کیا جائے اور فرمایا کہ کرایہ بار برداری آخر ادا کرنے والا کس سے لے گا؟ اس فتویٰ پر لوگوں نے عمل کیا۔ اور یہ قیاس سے فتویٰ دیا تھا۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں۔ پس تقلید بھی ہوئی اور ہوئی قیاسی حکم میں۔

بہرحال تقلید شخصی کا عمل قرون سلف میں رائج تھا آج چونکہ اس کے بغیر لوگ طرح طرح کے علمی و عملی مفاسد کا شکار ہیں جن کی تشریح ابھی عرض کی گئی کہ اجتہاد کی آزادی سے فتنۂ شبہات پھیلتا ہے اور تقلید کی آزادی سے فتنہ شہوات بڑھتا ہے۔ اس لئے قدرۃً اس میں وجوب کی شان پیدا ہو گئی کہ وہ واجب کا مقدمہ بن گئی اور اس کے بغیر اتباع ہواء سے محفوظ رہنا عادۃً محال ہو گیا، اس لئے تقلید شخصی بھی ضروری اور واجب ہو گئی ہے۔ مگر واجب بالغیر۔ قرون اولیٰ میں یہ غیر یعنی فتنۂ شبہات و شہوات شائع نہ تھا۔ اس لئے یہ تقلید معین جواز کے درجہ میں تھی۔ آج شائع ہے اس لئے واجب کے درجہ میں ہے، الحاصل مطلق تقلید و تقلید معین کتاب و سنت کی روشنی میں ایک ثابت شدہ اور معقول مسئلہ واضح ہوئی۔ مطلق تقلید تو بنص قرآنی ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ①

''علم والوں سے سوال کرو اگر تم علم نہیں رکھتے''

اور تقلید معین بوجہ مفاسد مذکورہ اصول کتاب و سنت، احادیث باب، تعامل سلف، اجماع امت اور بعض

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۷.

شناسانِ امت مرحومہ کے تجربات وغیرہ سے واجب ثابت ہوئی اور غیر مجتہد کے حق میں ضروری نکلی۔ مگر صرف مسائل اختلافیہ میں کہ انہیں مسائل میں کوئی نقیضین کا اجتماع یا نقیضین میں دائر سائر رہنے کی صورت پیدا ہوتی تھی جو دین کے نقطۂ نظر سے محال ہے کہ دین میں تناقض محال ہے۔ اسی لئے عامۂ تمام اکابر امت اور ہر قرن کے علماء فحول جو اجتہادی شان تک رکھتے تھے تقلید معین کے دائرے سے باہر نہیں ہوئے، بڑے بڑے حفاظ حدیث اور اکثر و بیشتر ارباب سنن و جوامع مقلد ہی ہوئے ہیں، ہندوستان کے عام محققین اور خصوصاً ولی اللہی خاندان اور سلسلہ کے تمام وہ اکابر جن کی تحقیقات اور لطائف و معارف ائمہ اجتہاد کا دوریہ دلاتی ہیں، خود اپنے لئے اور اپنے حلقۂ اثر کے لئے تقلید معین ہی کو ضروری سمجھتے رہے اور کبھی اس کے حلقہ سے باہر نہیں ہوئے۔

دین کے بارہ میں یہی وہ اسوہ ہے جو بطور توارث علماء دیو بند تک پہنچا اور اسی راہ پر امن پر دارالعلوم دیو بند نے راہ روی اختیار کی۔ حضرت حجۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم قدس سرہ، بانی و سرپرست اوّل دارالعلوم، حضرت مولانا محمد رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سرپرست ثانی دارالعلوم۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ صدر مدرس اول و سرپرست ثالث دارالعلوم، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ صدر مدرس ثانی و سرپرست رابع دارالعلوم، حضرت علامہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سرپرست خامس دارالعلوم، حضرت علامہ محمد انور شاہ قدس سرہ صدر رابع دارالعلوم وغیرہ وغیرہ جن کی تقاریر اور تحریرات دریائے اجتہاد کی نہریں معلوم ہوتی ہیں باایں تحقیق نظر و فکر تقلید معین کے دائرہ سے نہ کبھی خود باہر ہوئے نہ اپنے حلقہ ہائے اثر کو باہر ہونے دیا۔ پھر ان حضرات کے ہزار ہا تلامذہ اور شاگردان رشید۔ پھر دارالعلوم کے ہزار ہا فروعی مدارس جو ہندو بیرون ہند میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں، ان کے محقق علماء اور ان کے حلقہ ہائے اثر اسی پرانے مسلک پر جمے رہے اور لوگوں کو جماتے رہے۔

بالخصوص حضرت بانی دارالعلوم (قاسم العلوم والخیرات) نے اپنے مخصوص رنگ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ کی تقلید بھی کی اور ساتھ ہی محققانہ انداز سے تمام فقہ اور کلام کا اور اصولی فلسفہ بھی اسی انداز سے کھل کر دکھلایا کہ تقلید ایک مستقل تحقیق نظر آنے لگی اور جس کی بدولت دارالعلوم کے یہ ہزار ہا فضلاء اور شاگردان شاگرد مقلد بھی رہے اور محقق فی التقلید بھی ہوئے، اسی طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان حضرات نے اسی مسئلہ تقلید کے ذریعے سے لوگوں کے دین کی حفاظت کی۔ ورنہ ایک طرف سے ملک کا جاہل طبقہ جس کی ملک میں اکثریت تھی فکر و خیال پر اس درجہ قیود و بند عائد کر چکا تھا، کہ اپنی آبائی رسوم کو اسلام اور انہی کی کورانہ تقلید کو پیروی اسلام سمجھ کر ہر کس و ناکس کی تقلید میں گرفتار تھا جس سے ان میں طرح طرح کی بدعات و محدثات رچ گئی تھیں۔

اور دوسری طرف سن ۱۸۵۷ء کے بعد جدید تعلیم اور اس سے پیدہ شدہ آزاد خیالی کے سبب فکر و خیال کی وہ آزادی پھیل چکی تھی کہ ہر شخص مجتہد مطلق ہونے کا مدعی اور اسے اپنا جائز حق سمجھ رہا تھا۔ جزئی عقول دماغوں پر اس درجہ مسلط ہو چکی تھیں کہ مذہبی نقل و روایت کے رد و قبول کا معیار ہی یہ عقول رہ گئی تھیں۔ غرض ایک طبقہ تقلید جامد کا شکار

تھا اور ایک طبقہ اجتہاد مطلق کے خیال میں غرق تھا۔ ایک نے طبقہ تقلید بلکہ ربقہ تقلید ہی کو گلے سے اتار پھینکا تھا۔

ایک نے تقلیدی افراط میں گرفتار ہو کر ہر صاحب سجادہ ودلق بلکہ ہر ہر مدعی کی تقلید مطلق کرنے کا نام دین رکھ چھوڑا تھا۔ پس جامد مقلد یا بہت سوں کے سامنے جھکنے والے بہت سوں کے افعال کی اقتداء کرتے کرتے بدعات ومحدثات کا شکار ہوئے اور فتنہ شہوات میں جا گرے اور آزاد خیال کسی ایک کے بھی سامنے نہ جھکنے کی خو پیدا کر کے اپنی عقل کے بندے بن گئے تھے، جو ان کی عقل میں آیا مان گئے جو نہ آیا انکار کر بیٹھے اور اس طرح یہ لوگ فتنہ شبہات میں جا پھنسے تھے۔

اگر یہی لیل ونہار رہتے تو ہندوستان کی پوری دنیا شبہات وشہوات میں پھنس کر کلیۃً اپنا دین کھو چکی ہوتی۔ خدا رحمتیں نازل کرے ان اساطین امت اور مجددین دین پر کہ انہوں نے اجتہاد وتقلید کا وہی معتدل اور درمیانی نکتہ پکڑ کر جو حقیقۃً کتاب وسنت کی روح تھا اس امت کو سنبھالا اور ہند اور بیرون ہند میں حنفیت اور حنفیت کی جڑیں مضبوط کر دیں، وائرہ تقلید معین کو بھی نہ چھوڑا اور شان تحقیق کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور پھر ایک طرف کتاب وسنت کے علم وسیع کا روشن مینارہ دلیل راہ بنایا اور دوسری طرف ریاضت ومجاہدات کر کے معرفت نفس اور معرفت رب کی منازل طے کیں جس سے ان کا علم منقول سے معقول بنا اور پھر معقول سے محسوس ہو کر مشاہدہ میں آ گیا یعنی جو علم اوپر والوں سے سنا تھا پہلے اسے استدلال سے سمجھا اور پھر اس کے استعمال سے اسے اپنا حال بنا لیا جس سے پوری شریعت اپنے ظہر وبطن کے ساتھ ان پر منکشف بھی ہوئی اور ان کا حال ہو کر ان کی طبیعت بھی بن گئی۔

لیکن غور کیجئے کہ اس انکشاف تام اور کمالات ظاہر وباطن کے ہوتے ہوئے بھی جبکہ ان جیسے مانے ہوئے محققین اور عارفین نے بھی تقلید کا دامن دینی تحفظ کی خاطر کبھی نہ چھوڑا تو ایک ایسے دور میں جبکہ ہم لوگوں کا علم تو مضمحل ہو کر رمی سا رہ گیا ہے اور اسلام کمزور ہو کر اجنبی سا ہو گیا ہے، تقویٰ وطہارت اور عمل کے جذبات سرد پڑ چکے ہیں۔ فہم عالی گویا کہ دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ کام کا وجود نہیں ہے اور دعاوی بے شمار ہیں۔

حیرت ہے کہ آج کے بہت سے بزرگوار اس سیدھے سادھے محافظ دین طریق عمل یعنی تقلید معین سے جو سلف کے وقت سے اسی تحفظ دین کی خاطر معمول بہ ہے کس سہولت سے روگردانی فرما رہے ہیں؟۔ مناسب تو یہ تھا کہ خود بھی اس طریق عمل کو اختیار فرماتے کہ اس میں کوئی برائی نہ تھی لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا تو کم از کم اس راہ کے اختیار کرنے والوں پر ملامت نہ فرماتے کہ اختیار کرنے والوں نے بہر حال کسی بدعت یا شرعی مذموم کو اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ایک حجت کے ساتھ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اپنے دین کی حفاظت کر سکیں جیسا کہ سلف نے بھی اور بعد میں پوری امت نے بھی امن اسی میں دیکھا تھا۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس مسلک اور اس کے سالکین کو ہر طعن کا مخاطب بنایا گیا اور کسی قسم کے حملوں سے احتراز بھی نہیں کیا گیا۔

کہیں کہا گیا کہ مقلد جھگڑالو ہوتے ہیں اور لڑتے ہیں، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین نے غیر مسلک والوں پر

تعدیات کیں جس کے لئے تاریخی شواہد لائے جاتے ہیں تا کہ منافرت کا تخم کافی مضبوطی کے ساتھ دلوں میں جم جائے اور برگ لے آئے، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین یا احناف نے حکومت کے زور سے اپنے مسلک کو پھیلایا ہے گویا فقہ حنفی یا دوسرے فقہیات عیاذاً باللہ خرافات کا مجموعہ تھے جن میں نہ کوئی معقولیت تھی نہ کشش، اس لئے جبری اشاعتوں کی بدولت زور زبردستی سے دنیا میں پھیلائے گئے؟

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات ہیں جو مذاہب اربعہ اور ان کے ماننے والوں کی نسبت شائع کئے جاتے ہیں۔ مجھے ان خیالات کا اس تحریر میں جواب دینا نہیں ہے کیونکہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس تحریر کا موضوع کوئی رد وقدح یا مناظرہ نہیں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس قسم کے خیالات وافکار کم سے کم محقق علماء اور مربیانِ امت کے شایان شان نہیں۔ اگر کسی فرد یا جماعت میں شخصی یا جماعتی کمزوریاں ہوں تو اس میں مسلک یا مذہب کا کیا دخل ہے کہ وہ اس کی طرف منسوب کر دی جائیں؟ اگر آج مسلمان اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر آپس میں سر پھٹول روا رکھتے ہیں تو اس میں اسلام کا کیا دخل ہے اور کس طرح جائز ہوگا کہ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کو اسلام کا ثمرہ کہا جائے۔

بہر حال مقلد یا غیر مقلد کسی وقت بھی باہم غیر مناسب انداز سے باہم آویزش کرنے لگیں تو اس میں تقلید اور عدم تقلید کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ یہ محض ان کے جذبات ہیں جو اپنے ہی رنگ میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جذبات کا نہ کسی شرعی مسئلہ سے تعلق ہے نہ کسی شرعی مسلک سے اجتہاد وتقلید جیسے شرعی مسائل اپنی جگہ ہیں اور یہ کمزوریاں اپنی جگہ، ان کمزوریوں پر اعتراض اپنی جگہ کتنا ہی صحیح ہو مگر ان شرعی مسائل یا ان کے ماننے والوں پر کسی حالت میں بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ پر ہر وقت حاصل ہے لیکن اسی حد تک کہ محض متنبہ ہو جائے نہ اس حد تک کہ یہ امر بالمعروف ہی ایک مستقل نزاع بن کر محاذ قائم کر دے اور باہمی منافرات کی تخم ریزی اور آبیاری کرنے لگے۔

اس لئے میری دردمندانہ گذارش ہے کہ مسائل کو مسائل کے درجہ میں رکھ کر تمام حضرات خواہ وہ تقلید سے تعلق رکھتے ہوں یا ترک تقلید سے تعلق رکھتے ہوں۔ نفس دین کے تحفظ میں اجتماعی جدوجہد صرف کرنے کی فکر فرمائیں اور فروعی مسائل کے اختلافات میں جو آج سے مختلف فیہ نہیں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہی کے وقت سے مختلف فیہ چلے آرہے ہیں۔ ایک اختلافی جہت کے ماننے والوں کی طرف سے یہ حجت کافی خیال فرمالیں کہ فلاں طبقہ، فلاں فقیہ کے فتاویٰ پر عمل کر رہا ہے۔ مخترع اور مبتدع نہیں ہے یہ حجت ہر زمانے میں ایسے مسائل میں قاطع نزاع سمجھی گئی ہے نہ کہ مورث نزاع، اس لیے خدارا آج بھی اس حجت کو قاطع نزاع ہی بنایئے نہ کہ موجب نزاع۔ ضرورت ہے کہ سب حضرات باہمی اشتراک عمل سے پوری قوم کی تعمیر کی فکر فرمائیں اور یہ سب مل کر ایسے لائحہ عمل پر غور کریں جو مسلمانوں کو ایک سطح پر لا سکے اور معاندین اسلام کی مخفی ریشہ دوانیوں کا کسی حد تک سد باب کر سکے۔

حضرات! اپنے باہمی اتحاد میں کم سے کم حضرات صحابہؓ کے اس اُسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنالینا چاہئے کہ قرآن کریم کی بعض شاذ آیات جن کو صحابہؓ کے اجماع نے قرآن کریم کا جزو تسلیم نہیں کیا۔ بعض حضرات صحابہؓ کے پاس موجود تھیں جو انہیں خلاف اجماع قرآن کا جزو جانتے تھے لیکن کسی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ارباب اجماع نے مخالفین کے اجماع کے خلاف یا مخالفین اجماع نے ارباب اجماع کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو۔

پس حضرات مقلدین جبکہ ترک تقلید کو خلاف اجماع سمجھتے ہیں تو وہ تارکین تقلید کے بارہ میں ان حضرات صحابہؓ کا اُسوۂ اختیار فرمائیں۔ جنہوں نے اپنے اجماع کے باوجود مخالفین اجماع کے خلاف نہ کوئی محاذ قائم کیا اور نہ کسی جنگ کا آغاز کیا۔ بلکہ تفہیم کا حق ادا کردینے کے بعد ان کی تحقیق پر انہیں معذور سمجھ کر ہمیشہ چھوڑے رکھا۔ ادھر حضرت منکرین تقلید اگر تقلید کو باجود اجماع امت کے قابل قبول نہیں سمجھتے تو وہ ان حضرات صحابہؓ کا راستہ اختیار فرمائیں جنہوں نے شاذ آیات کے بارہ میں اپنی تحقیق نہیں چھوڑی تو اجماع کنندوں کے مقابلہ میں بھی نہیں آئے اور انہیں ان کے عمل کے لئے آزاد چھوڑا۔ تقلید کے فریقین بلکہ تمام فرق اسلامیہ جب تک حضرات صحابہؓ کی اس پر حوصلہ رواداری کا اسوہ اختیار نہیں فرمائیں گے۔ امت کے اجتماعی مسائل کا حل کبھی نہیں ہوسکتا۔

آج امت مسلمہ کو تعلیم عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ جہالت کے جراثیم نے اس کے قومی جسم کو مثل ایک بے جان لاشہ کے کردیا ہے۔ اسی طرح آج تبلیغ عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ مسائل سے عدم واقفیت نے انہیں اندھیرے میں ڈال رکھا ہے۔ اسی طرح امت کو اصلاح اخلاق کی قوی ترین ضرورت ہے کہ بداخلاقیاں ناسور ہوکر اس قوم کو لگ گئی ہیں۔ اسی طرح صفائی معاملات کی آج حد درجہ ضرورت ہے کہ بدمعاملگی نے قوم کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی ہے۔ اسی طرح سیاسی حقوق کے تحفظ کی بھی اشد ضرورت ہے کہ اس کے فقدان نے قوم کی شوکت وقوت کو قطعاً زائل کردیا ہے۔

لیکن سارے اجتماعی معاملات آپ حضرات جب ہی پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں جبکہ ان فروعی اختلافات کو نزاعات نہ بنائیں اور روات کے بادیانت اختلافات کو اس کی حدود میں قائم رکھ کر اسلام کی سرحدوں کو محفوظ کرنے کی فکر کریں اور امت کی اس اجتماعی ساکھ کو پھر از سر نو قائم کرنے کی کوشش کریں جو بہت حد تک پامال ہوچکی ہے اور ان نزاعات کے ذریعہ ہی روبزوال ہورہی ہے۔ میں اس کی امید رکھوں گا کہ "آل انڈیا احناف کانفرنس ان عمومی اور اجتماعی مہمات کو اپنے بنیادی مقاصد میں شامل کرکے انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے دائرہ عمل میں لے لے گی۔

مجھے آل انڈیا احناف کانفرنس کے دعوتی پوسٹر کو دیکھ کر جس میں غیر مسلک کے علماء کو بفراخ دلی وفراخ حوصلگی دعوت دی گئی ہے۔ یقین کامل ہے کہ اس کانفرنس کے مخلصانہ جذبات عمل انفرادیت سے بالاتر اجتماعی روح اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور اس کے مخلص کارکن اتحاد بین المسلمین کے زیادہ سے زیادہ خواہش مند ہیں۔ اس لئے اس کانفرنس سے یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ عرض کردہ مقاصد اس کے اساسی مقاصد قرار پاسکیں گے اور اس کے ہاتھوں

پھلیں پھولیں گے۔

آخر میں تمام ذمہ داران کانفرنس کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی فراخ دلی سے مجھ ناچیز کو اپنے کچھ خیالات کے اظہار کا موقع عنایت فرمایا اور میری انتہائی بے بضاعتی کے باوجود مجھے قبول فرما کر میری انتہائی عزت افزائی فرمائی۔ حق تعالیٰ شانہ، ذمہ داران کانفرنس، کارکنانِ جلسہ اور تمام حاضرین اجلاس کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق دے اور ہم سب کو حسنِ خاتمہ کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

پس منظر

اجلاس جمعیت العلماء صوبہ بمبئی

منعقدہ ۴، ۶، ۷ صفر المظفر ۱۳۶۴ ہجری

از فخر الاماثل حضرت الحاج مولانا قاری حافظ محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

جمعیت العلماء صوبہ بمبئی نے گزشتہ سال ۴۴ء میں اپنے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو منتخب کیا تھا۔ ممدوح نے اس اجلاس میں ارتجالاً زبانی جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اس نے اہل بمبئی کے مذہبی اور سیاسی احساس و شعور کو بیدار کرنے میں حیرت انگیز کام کیا۔ قبول و تاثر کی ایک رو تھی جو چالیس پچاس ہزار سامعین کے قلوب میں گھر کرتی چلی گئی تھی۔

مشرقی و مغربی تعلیم و نظریات دونوں کے حامل و دلدادہ اس خطبہ سے یکساں متاثر تھے۔ سیاسی و غیر سیاسی، سرکاری و غیر سرکاری، مذہبی اور غیر مذہبی مسلم اور غیر مسلم کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس پر حقائق و معارف کے اس آب حیات کا کوئی چھینٹا پڑ گیا ہو اور وہ خواب گراں سے ہوشیار نہ ہو گیا ہو۔ بمبئی کے کانوں نے پہلی مرتبہ ایک ایسا سیاسی پروگرام سنا جو قرآن و سنت اور صرف قرآن و سنت سے مرتب کیا گیا تھا۔ اور جس میں انسان کے لئے دنیا کے موجودہ حالات میں فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے سہل الحصول اور یقینی طریقے بھی موجود تھے اور آخرت کی نجات کا سامان بھی۔

بمبئی۔! جہاں کے باحوصلہ اور نیک دل مسلمانوں کو ایک خود غرض جماعت نے اپنی نفس پرستی اور جلب منفعت کے لئے مبتلائے فریب کر رکھا تھا اور مخلصانہ مذہبی جذبات کو غلط راستوں پر ڈال کر سچا دین پیش کرنے والوں اور کلمہ حق کہنے والوں سے اس درجہ متنفر اور متوحش کر دیا تھا کہ وہ ان کے قریب جانے یا ان کی کوئی بات سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے، انہوں نے جب جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے اس بیدار کن صدائے حق کو سنا تو وہ چونک اٹھے، انہوں نے محسوس کیا کہ ارباب غرض نے سالہا سال سے ان کے مذہبی جذبات کو جن راہوں پر ڈال کر علماء دیوبند کے خلاف جو اشتعال اور نفرت پیدا کر دی ہے وہ سراسر باطل ہے۔ حق یہی ہے کہ دین و دنیا کی خیر و فلاح اور تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح اسوہ اگر کسی کے پاس ہے تو انہیں علماء حق کے پاس ہے۔

اس احساس کا پیدا ہونا تھا کہ بمبئی جیسے عظیم الشان شہر کے گوشہ گوشہ سے طالبان حق گروہ در گروہ حضرت ممدوح کی خدمت میں یہ التجا لے کر حاضر ہونے لگے کہ ہمارے علاقے کے مسلمانوں کے کان بھی اس صدائے حق سے آشنا کئے جائیں جس سے وہ اب تک مختلف حیلوں، اور گمراہ کن تدبیروں سے محروم رکھے گئے ہیں، اہل بمبئی کی اس طلب صادق اور التجائے شدید نے حضرت مہتمم صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے پروگرام میں مخلصین وطالبین بمبئی کے لئے جتنا وقت نکال سکیں نکالیں۔ چناں چہ حضرت ممدوح نے جتنا ممکن ہو سکا بمبئی میں قیام فرمایا اور وہاں کے تقریباً ہر حصہ کے تشنگانِ حقیقت ومعرفت کو اپنے ارشادات عالیہ اور مواعظ حسنہ کے شیریں اور صاف وشفاف آب رواں سے سیراب کرنے کی کوشش کی۔ پیاسوں کی پیاس کا یہ عالم تھا کہ جام پر جام پیتے جاتے تھے اور "ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ" پکار رہے تھے۔ چونکہ مولانا ئے ممدوح کی ذات گرامی پر دار العلوم دیو بند جیسے عظیم الشان مرکزی ادارہ کی اہم ذمہ داریوں کا بار گراں بھی ہے اس لئے تقریباً تین ہفتہ سے زیادہ بمبئی میں قیام نہ فرما سکے اور بمشکل دیو بند واپس تشریف لائے۔

اس سال جمعیت کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ذمہ داران جمعیت نے پھر حضرت ممدوح سے صدارت اجلاس قبول کرنے کی باصرار درخواست کی اور اہل بمبئی کے والہانہ شوق کا شدومد کے ساتھ اظہار کیا چناں چہ مخلصین بمبئی کی دعوت کو قبول کرنا پڑا اور ممدوح نے بمبئی تشریف لے جا کر فرائض صدارت انجام دیے، اس سال مسلمانان بمبئی کا ذوق وشوق المضاعف تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حاضرین جلسہ کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہوتی تھی۔ اجلاس جمعیت کے ختم ہونے پر اہل شہر کی جانب سے علاقہ وار جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ان میں حضرت ممدوح نے انسان کی نجات اور اس کی زندگی کے مختلف گوشوں میں فلاح وخیر کا وہ پروگرام پیش فرمایا جو قرآن وسنت کا مرتب کردہ ہے۔ ان خطبات ومواعظ نے مسلمانان بمبئی کے ایمانوں میں جلا پیدا کردی۔ ارباب باطل نے تدلیس وتلبیس اور افتراء وبہتان پر جماعت دیو بند کے خلاف سالہا سال میں عناد وعداوت کی جو عمارت کھڑی کی تھی وہ تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ کر رہ گئی اور بمبئی کے سنجیدہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد میں دیو بند کی محبت وعقیدت کا گہرا نقش قائم ہو گیا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ.

۵ صفر ۱۳۶۲ھ کو جمعیت العلماء صوبہ بمبئی کے سالانہ اجلاس میں حضرت ممدوح نے جو خطبہ ارشاد فرمایا دیو بند سے بمبئی تشریف لے جاتے ہوئے راستہ میں قلم برداشتہ تحریر فرمالیا تھا، اتنا بھی موقع نہ مل سکا کہ مسودہ پر نظر ثانی کی جاسکتی۔ دراصل یہ خطبہ صدارت کے مضامین کا ایک اجمالی خاکہ تھا جو روا روی میں بطور یادداشت مرتب کرلیا گیا تھا۔ لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ سامعین کو طبعاً تحریر کے سننے میں الجھن اور ضیق ہوتی ہے۔ نیز تحریر کے ذریعہ مسائل کی تفہیم میں مختلف الخیال اور متفاوت الخیال حاضرین کی کما حقہ رعایت نہیں رکھی جاسکتی۔ اس لئے ممدوح نے اس مرتب کردہ تحریری خاکہ پر زبانی خطبہ ارشاد فرمانا زیادہ مناسب خیال فرمایا۔ اس زبانی خطبہ میں بہت سے مضامین تحریر کردہ خطبہ سے زائد بیان ہوئے اور مجمع پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ ممدوح کا خیال تھا کہ خطبہ پر نظر ثانی

کے وقت تقریر کے زائد نکات و مضامین کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ لیکن حضرت ممدوح نے جیسے ہی تقریر ختم فرمائی۔ مدیرانِ جرائد نے اصرار کیا کہ مسودہ جس حالت میں بھی ہے انہیں دے دیا جائے کہ انہوں نے تقریر کے جو نوٹ لئے ہیں یہ مسودہ یقیناً ان سے زیادہ مفصل ہوگا اس لئے مسودہ دے دیا گیا اور اسے بمبئی کے اردو، انگریزی، گجراتی اور مرہٹی وغیرہ اخبارات نے نمایاں طور پر اور بعض نے پورا اور بعض نے اس کے خاص خاص حصے شائع کئے بلکہ بعض اخبارات نے پبلک کے شدید مطالبہ کی بناء پر اس مکمل مسودہ کو ایک سے زائد مرتبہ شائع کیا۔

بمبئی سے واپسی پر اثناء سفر ممدوح نے اس مسودہ پر نظر ثانی کر کے اس میں ان مضامین کا اضافہ بھی فرما دیا جو تقریر میں خاص طور پر آ گئے تھے۔ اب حذف و ازدیاد، اور ترمیم و تنسیخ کے بعد یہ مسودہ اپنی مکمل صورت میں مرتب ہو گیا ہے۔ چونکہ اس خطبہ کی حیثیت عام رسمی خطبات صدارت سے مختلف ہے اور اس میں زمانہ حال کی ضروریات میں مسلمانوں کی بہترین مذہبی و سیاسی راہنمائی کی گئی ہے۔ اس لئے مدیر رسالہ دارالعلوم کی درخواست پر حضرت ممدوح نے ترمیم شدہ مسودہ دفتر رسالہ کو مرحمت فرما دیا جس کو بالاقساط رسالہ میں شائع کیا گیا۔

دارالعلوم کے جن نمبروں میں یہ خطبہ صدارت شائع کیا گیا ہے اور اطراف و اکناف ہند سے ان کی فرمائش اس کثرت سے آئیں کہ وہ نمبر بہت جلد ختم ہو گئے اور فرمائشات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اس لئے شائقین کے اصرار پر بہ منظوری حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ خطبہ صدارت کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ناظم کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند

اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ . ٥

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ٥ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ٥ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ ٥ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ٥ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ٥ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ٥ هٰرُوْنَ اَخِي ٥ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ٥ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ٥ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ٥ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ٥ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ٥ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ٥﴾ (اِلٰى اَنْ قَالَ تَعَالٰى) ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ٥ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ٥ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ٥ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ٥ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ٥ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ٥ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ٥ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ، قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ، وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ٥ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى .﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ .

ترجمہ: "اے موسیٰ تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے عرض کیا اے میرے رب! میرا حوصلہ فراخ کیجئے اور میرا کام آسان فرما دیجئے اور میری زبان پر سے بستگی ہٹا دیجئے تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ اور میرے واسطے میرے کنبہ میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو کہ میرے بھائی ہیں ان کے ذریعہ سے میری قوت مستحکم کر دیجئے اور ان کو میرے کام میں شریک کر دیجئے تا کہ ہم دونوں آپ کی خوب کثرت سے پاکی بیان کریں اور آپ کا خوب کثرت سے ذکر کریں بلاشبہ آپ ہم کو خوب دیکھ رہے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ تمہاری درخواست

---

① پارہ:۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ:۲۴-۴۸.

منظور کی گئی اے موسیٰ (پھر آگے حق تعالیٰ نے فرمایا) اور میں نے (اے موسیٰ) تم کو اپنے لئے منتخب کیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل چلا ہے۔ پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ دونوں نے عرض کی کہ اے ہمارے پروردگار: ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔ ارشاد ہوا کہ: تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا ہوں اور سب دیکھتا ہوں۔ سو تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔ سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور ایسے شخص کے لئے سلامتی ہے جو راہ پر چلے۔ ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلائے اور روگردانی کرے۔

میری سب سے بڑی عزت وسعادت ...... بزرگانِ محترم! آپ حضرت نے ایک سال بعد پھر مثل سابق میری عزت افزائی فرما کر مجھے اسی جگہ لا بٹھایا ہے جس جگہ گزشتہ سال مجھے بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس حوصلہ افزائی پر آپ سب بزرگوں کا شکریہ ادا کروں۔ فجزاکم اللہ عنی خیرا

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری سب سے بڑی عزت افزائی یہ ہے کہ خواہ میری ذات کو حقیر ترین سمجھا جائے جیسا کہ واقعہ میں وہ ہے لیکن اس پیام کو گوش ہوش سے سن کر دل کی گہرائیوں میں جگہ دی جائے جو میں اس کرسی پر بیٹھ کر دینا چاہتا ہوں تو یہی میری سب سے بڑی عزت وسعادت ہوگی۔ گو ذات کسی نگاہ سے بھی دیکھی جائے۔ سلاطین کا پیغام عام پبلک کے کانوں عموماً بھنگی کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے لیکن اس کے قبول کرنے میں بھنگی کی ذاتی حقارت کبھی مانع نہیں آتی۔

مجھے آپ ختمی مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کا ایک ادنیٰ بھنگی تصور کریں۔ بلکہ وہاں کے بھنگی کا مرتبہ بھی یہاں کے سلاطین سے بڑھ کر ہے۔ میں کیا چیز ہوں، تاہم ایک معمولی بھنگی کی بے حیثیتی اگر پیغام حکومت ماننے سے مانع نہیں ہوسکتی تو میری کم حیثیتی بھی پیغامِ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سننے اور ماننے سے مانع نہ ہونی چاہئے۔ میں اپنے لئے اس وقت وہی مثال دے سکتا ہوں جو ایک تبلیغ خاص کے موقع پر مولانا اسمٰعیل شہید کی ہوئی کہ وہ طوائفوں کو تبلیغ حق کرنے پہنچ گئے تو ان کے خدام ومتوسلین نے یہ کہہ کر روکا کہ حضرت: ایسے بدنام گروہ کے سامنے تبلیغ کے لئے جانا علم کی عزت کو گھٹاتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا تھا کہ: ''خدا کی قسم! اگر اسمٰعیل کو گدھے پر سوار کر کے اس کا منہ کالا کیا جائے اور جوتیوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا جائے اور اس کے پیچھے بچے ہر لود یتے ہوئے اسے شہر سے باہر نکال رہے ہوں اور اسمٰعیل قال اللہ وقال الرسول کہتا ہوا جا رہا ہو تو یہی اس کی انتہائی عزت وسربلندی ہے جس کے بعد اسے کسی عزت کی ضرورت نہیں''۔

تو میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ: آپ اگر کسی درجہ میں بھی میری کوئی توقیر نہ فرماتے اور اپنے اخلاق

کریمانہ کا کسی درجہ میں بھی ثبوت نہ دیتے مگر اس پیغام کی عظمت کرتے جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں تو بلاشبہ یہی میری ایک انتہائی عزت افزائی ہوتی کہ اس کے بعد مجھے کسی عزت کی ضرورت نہیں۔

تذکیرِ قدیم..... حضرات! مجھے جمعیت العلماء صوبہ بمبئی کے اس پلیٹ فارم سے کوئی نیا اور انوکھا پیغام دینا نہیں ہے جواب تک نہ دیا گیا ہو کیونکہ اول تو پیغام قرآنی ہے اور قرآن چودہ صدی کی پرانی کتاب ہے تو اس کا پیغام نیا کب ہوسکتا ہے؟ پھر قدامت کی یہ محدود مدت بھی قرآن کے کلام لفظی ہونے کے لحاظ سے ہے۔ جس کی عمر چودہ سو برس ہے۔ ورنہ کلام نفسی کے درجہ میں تو کلام اللہ اور اس کا پیغام ازلی اور قدیم مطلق ہے کہ صفت الٰہیہ ہے جس کی قدامت کی کوئی حد ونہایت ہی نہیں ہوسکتی کہ وہ سرتاپا قدیم اور ازلی محض ہے اس لئے میرے پیغام میں کوئی ادنیٰ جدت نہ ہوگی۔ اور پھر اس پرانے پیغام کو بھی دینے والے بار بار دے چکے ہیں کہ اس چودہ صدی میں قرآن اور اس کے ضمن میں یہ پیغام ہر عالم وعامی کی زبان پر ہزار بار آیا ہوا ہے۔ اس لئے بلحاظ تبلیغ بھی یہ پیغام نیا نہیں۔ ہاں صرف عنوان بیان اور طریق استدلال کے لحاظ سے شاید نیا ہو اور اس لحاظ سے بھی نیا نہ ہو تو نہ سہی۔ مقصود اصلی تو تذکیر ہے اور تذکیر ہمیشہ پرانی ہی بات کی ہوتی ہے۔

اجمالی پیغام...... یہ پیغام قرآن حکیم کی مرقومہ بالا آیتوں سے چند نمبروں میں پیش کرنا چاہتا ہوں جنہیں آیات مذکورہ کے الفاظ اور سیاق وسباق سے استنباط کر کے نمبروار مرتب کر دیا گیا ہے تفصیلات سے پہلے پیغام کا اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ ہم غلامی کے مصائب میں گرفتار ہیں۔ ہمیں مکمل آزادی کی نعمت حاصل کرنی چاہئے۔ اس لئے میری اس ساری عرضداشت کا حاصل غلامی اور آزادی کی شرعی بحث شرعی حیثیت سے غلامی اور آزادی کا مفہوم دونوں کے اثرات حصول آزادی کی ضرورت اور طریقہ حصول وغیرہ کی تفاصیل چند نمبروں میں عرض کرنا ہے۔

1 **پیغام اور اس کی نمبروار دفعات برطانیہ کی سرکشی**...... آیات مندرجہ عنوان کا ترجمہ آپ نے سمجھ لیا اب سلسلہ وار ان آیات کے مدلولات پر غور کیجئے۔ بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گزر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کہ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ ”اے موسیٰ! فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے۔

اس حد سے نکل جانے کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔ پس قرآن کا اس غلام سازی کو اور فرعون کے استعبادی جذبہ کو طغیان سے تعبیر کرنا اس کی واضح دلیل ہے کہ کسی قوم کا کسی قوم کو اپنا غلام بنانا خالق کائنات سے بغاوت اور سرکشی ہے جو مورد قہر وعتاب ہے کیونکہ طغیان مورد غضب ہی ہوسکتا ہے نہ کہ مورد رحمت وشفقت۔ اس سے یورپ کی ان اقوام کی پوزیشن سامنے آجاتی ہے جن کے شب وروز کا ذکر وفکر اور مشغلہ ہی دنیا کی اقوام کے گلے میں یورپ کی غلامی کے پھندے ڈالتے رہنے کی اسکیمیں سوچتے رہنا اور انہیں عمل میں لاتے رہنا ہے۔ جس میں برطانیہ کو بالخصوص یدطولیٰ حاصل ہے اسی کو قرآن نے فساد انگیزی سے تعبیر فرمایا ہے۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ﴾ ① ''فرعون سرزمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کرا تا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا واقعی وہ بڑا مفسد تھا''۔

2 اسباب غلامی......اسی سے دوسرا مسئلہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ عند اللہ خود غلامی بھی قابل نفرت چیز ہے کیونکہ جب اس کے برپا کرنے والے کو طاغی اور سرکش کہا گیا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس کی برپا کردہ چیز (غلامی) کسی درجہ میں بھی مستحسن اور پسندیدہ ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی غلامی قوموں کے لئے ہر ممکن بے عزتی کی جڑ اور ہر ممکن بے وقعتی کی بنیاد ہے کیونکہ دنیا میں ایک قوم کے لئے اسباب عزت چار ہوتے ہیں۔

1 ......ایک اس کا اپنا اساسی علم جس سے اس کی معنویت قائم ہوتی ہے۔

2 ......دوسرے اس کی اقتصادی اور مالی حیثیت جس سے اس کی مادیت بنتی ہے۔

3 ......تیسرے اس کی عرفی حیثیت جس سے اس کا وقار قائم ہوتا ہے۔

4 ......چوتھے اس کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کی نوعیت جس سے اس کے حلقہ اثر میں وسعت اور بنیادوں میں مضبوطی آتی ہے۔

ایک مسلط قوم جب کسی ملک یا قوم کو اپنا غلام بنا لیتی ہے تو غلام قوم کی عزت کے یہ چاروں سوت بند کر دیتی ہے جس سے اس قوم کی معنویت، مادیت، وقعت اور نیک شہرت سب ختم ہو جاتی ہے اور پھر نتیجہ کے طور پر اس محکوم قوم میں پستی اخلاق و کردار کے ایسے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ مخلوق ہی کی نہیں خالق کی نگاہوں سے بھی گر جاتی ہے۔ تا آنکہ غیرت خداوندی جوش میں آئے۔ اس کا حال زبوں اور بد سے بدتر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے اپنے قومی علم کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ جس سے نہ اسے اپنی قومی روایات یاد رہتی ہیں نہ قومی مذاق ملحوظ رہتا ہے اور نہ قومی مزاج ہی باقی رہتا ہے اور اگر اسے علم کی تلاش بھی ہوتی ہے تو فاتح قوم کا علم سیکھ لینا ہی اسکے نزدیک سب سے بڑا فخر بن جاتا ہے جس کے لئے وہ مجبور کر دی جاتی ہے۔ اور اب اگر اس جدید علم کی بناء پر اس کی کوئی رسمی عزت ہوتی ہے تو وہ درحقیقت خود اس کی قومی عزت نہیں بلکہ حکمران قوم ہی کی عزت کا ایک ظل ہوتی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اس کی مالی حیثیت کچل دینے کے لئے ایسے قوانین بنا دیے جاتے ہیں کہ روز بروز محکوم قوم افلاس کے گڑھے میں گرتی رہے اور اس کی سیر چشمی استغناء اور غیرت وحمیت کا خون اس گڑھے کے کناروں پر بہتا رہے تا آنکہ اس افلاس و بے مائیگی کی بے چارگیوں میں اس کا ایمان سستے داموں خرید لیا جائے اور انجام کار خودداری و استغناء کا اس میں تصور بھی باقی نہیں رہتا۔ جب تک کہ وہ خود مشکلات کا مقابلہ کر کے اسے باقی

① پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۴۔

رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ حیثیت عرفی اور ساکھ منانے کے لئے اسکے قوائے عمل کم مرتبہ امور اور رذیل پیشوں میں مصروف کر دیئے جاتے ہیں۔ ملک کی اونچی سوسائی اور بلند عہدوں میں نہ خود اس کی جگہ رہتی ہے نہ اس کا اپنا علمی و اخلاقی سرمایہ ہی کوئی اونچا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اور آخر کار اس غلامی کی پیدا کردہ جہالتوں اور بداخلاقیوں نیز حکمران قوم کی مخفی خواہش و مساعی کی بدولت محکوم قوم کے باہمی روابط بھی خراب ہو جاتے ہیں اور بیرونی تعلقات بھی مضمحل پڑ جاتے ہیں اسے اپنوں سے منقطع کر کے ایسا بے دست و پا کر دیا جاتا ہے کہ کوئی اس کا ہمنوا باقی نہیں رہتا اور اس کی ساری زندگی حکمران قوم کے رحم و کرم پر دائر ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کے داخلی اور خارجی وسائل منقطع ہو جائیں جس کی بقاء و ترقی کے مادی معنوی اسباب مفقود ہونے لگیں اس کے مریض جسم و روح کے مکمل کر قریب بہ مرگ ہو جانے میں تامل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

چونکہ غلامی یہ چار مہلک اسباب اپنے ساتھ لاتی ہے جس سے قوموں کے تختے الٹتے ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے غلامی کو بدترین عذاب فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کی اس غلامی کا جو فرعون اور قبطیوں کی آقائی سے پیدا ہوئی۔ قرآن نے ذیل کے الفاظ میں تذکرہ فرمایا ہے۔ ﴿وَإِذْ نَجَّيْنٰكُم مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ ① "وہ وقت یاد کرو (اے بنی اسرائیل) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی جو کہ تمہیں بدترین عذاب (غلامی) کا مزہ چکھاتے تھے۔"

علم کی تباہی ...... چناں چہ فرعونی قوم نے فاتح بن کر بنی اسرائیل کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کیا جو ہر آقا قوم اپنی غلام قوم کے ساتھ اختیار کرتی ہے۔ یعنی غلامی کے عناصر اربعہ پورے ہو کر رہے۔ سب سے اول بنی اسرائیل کا آبائی علم ختم ہوا۔

فرعون کو کیا ضرورت تھی کہ بنی اسرائیل کی روایتی تعلیم کو رواج دیتا۔ اس کی اشاعت کے لئے مدارس جاری کرتا یا ابراہیمی اور اسرائیلی طریق زندگی کے مطابق تربیت گاہیں قائم کرتا ورنہ اس کی خدائی کو کب فروغ حاصل ہوتا؟ اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہونا تھا کہ ان کے اسلاف اولین جب تک زندہ رہے پیغمبروں کی پند و نصائح بھی اسکے ذہنوں میں زندہ رہیں۔ جوں جوں وہ رخصت ہوتے گئے اسی حد تک وہ روایتیں بھی ختم ہوتی رہیں تا آنکہ بنی اسرائیل کے افق پر جہالت کی گھنگھور گھٹا چھا گئی جسے فرعون نے بڑھا چڑھا کر انتہاء تک پہنچا دیا تاکہ وہ اپنی خاندانی روایات کو سرے سے بھول جائیں اور ان میں قومی خود اختیاری کا احساس پیدا نہ ہو۔

یہی تو وجہ ہے کہ غلامی سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک قانون زندگی کے علم و عمل کی درخواست کی اور تورات لاکر دی گئی جس سے واضح ہے کہ ان کے پاس کوئی قانون اور اس کا علم باقی نہ تھا ورنہ اس درخواست کی ضرورت نہ ہوتی۔ چناں چہ بیس برس ہا برس کی جہالت اور مصری بت پرستوں کی صحبت جو زمانہ

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۵۰۔

غلامی کی یادگار تھیں۔ باوجود صحبت موسوی کے پھر بھی جاہلانہ حرکات پر انہیں گاہ بگاہ آمادہ کر دیتی تھی۔ اریحاء پر گزر ہوا اور گائے کی صورت کے پیتل کے بت جیتے ہوئے دیکھے تو جھٹ فرمائش کر دی کہ ﴿یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾ ① ”اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسا ہی خدا بنا دیجئے جیسے (ان اریحاء والوں) کے خدا ہیں“۔

جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی جہالت کا پردہ یہ کہہ کر فاش کیا کہ ﴿اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾ ”تم ایسی قوم ہو جو جہالت کی باتیں کرتے ہیں“۔

اس پر بھی جہالت کا یہ عالم تھا کہ جب سامری نے سونے چاندی کا بچھڑا بنایا تو قوم کا ایک بڑا حصہ اسی کی پوجا پاٹ میں مصروف ہوگیا۔ نہ انہیں موسیٰ علیہ السلام کی آنکھیں یاد رہیں نہ ان کے توحیدی پند و نصائح کا کوئی دھیان رہا۔ ایمان باللہ کے لئے کہا گیا تو کہنے لگے کہ ہم تو اس وقت تک ایمان نہیں لا سکتے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ کلام الٰہی کی خبر دی گئی تو بولے کہ: ہم کلام خداوندی کو کیسے مانیں جب تک کلام خود نہ سن لیں۔ تورات لا کر دی گئی تو عبادت کے لئے آمادہ نہ ہوئے حتیٰ کہ پہاڑ سروں پر لا کھڑا کیا گیا کہ مانو ورنہ کچل دیئے جاؤ گے۔ تب کہیں عمل پر آمادہ ہوئے۔

غرض برس ہا برس کی جہالت کا یہ اثر تھا جو زمانہ غلامی کی یادگار تھی کہ ان کا تصور جب بھی جاتا تو اللہ کی بجائے غیر اللہ ہی کی طرف جاتا تھا۔ معنویت کی بجائے صورت و حسیات کی طرف اور لطیف و خبیر خدا کی جگہ محسوس و مصور خداؤں کی طرف طبائع چلتی تھیں جو لاعلمی کا قدرتی نتیجہ ہے۔

حیثیت عرفی کی بربادی...... ادھر جب کہ اپنا علم نہ رہا اور ہوتا تو اس کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی جب کہ حکومت اس علم کی نہ تھی تو مالی حیثیت کیسے درست رہ سکتی تھی۔ مفلس و نادار ہوئے۔ احساس خودداری نہ رہا۔ اولاً تو مجبور ہو کر اور بعد میں خو و طبیعت کی جدید افتاد سے ذلیل خدمات سے پیٹ پالنا شروع کیا۔ یعنی چپراسی، خانساماں، بیرا، مزدور وغیرہ بن کر گزران کی اور اونچی سوسائٹی میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ رہی حتیٰ کہ وہ اسی کو بہت کچھ جانے لگے۔

فرعون کی سیاست نے صورت حال یہ کر دی کہ قبطیوں کے لئے تمام اونچے عہدے تھے بڑی بڑی تنخواہیں تھیں۔ زمینداریاں تھیں اور سبطیوں کے لئے یہ ذلیل خدمات تھیں۔ وہ مثل اچھوت کے تھے جیسا کہ آیت گزشتہ میں ﴿يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ﴾ کا یہی مفہوم سامنے آچکا ہے۔ ہاں سبطیوں میں سے اگر کوئی ترقی پا سکتا تھا تو نہ اپنے خدائی علم و روایات کے لحاظ سے بلکہ وہی فرعونی حکومت کے قانون کے علم سے۔ چنانچہ قارون بنی اسرائیل میں سے تھا اور ایک روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بنی اعمام میں سے تھا۔ فرعون کا پیش کار رہا۔ اس کا علم کوئی پیغمبری علم نہ تھا۔ ورنہ اس علم سے اسے یہ عہدہ فرعونی حکومت میں کیسے مل سکتا تھا بلکہ وہ علم وہی غیر سماوی علم تھا جو فرعونی ماحول کا نتیجہ تھا۔ قرآن نے اسی علم کی طرف قارون کے قول میں اشارہ فرمایا جب کہ اس نے کہا تھا ﴿اِنَّمَآ

① پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۸۔

﴿اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ﴾ ① " یہ مال و دولت مجھے میرے علم و ہنر کی بدولت دیا گیا ہے جو خود میرا اپنا ہے"۔

جو ظاہر ہے کہ فرعون کے عہد کے رائج شدہ رسمی علم کے خلاف کبھی نہیں ہوسکتا تھا اور نہ یہ عزت افزائی ممکن نہ تھی بلاشبہ اس کے لئے مال اور خزائن کے دروازے کھل گئے اور اس نے بے شمار مال سمیٹا جس کی قرآن نے شہادت دی ہے اس سے واضح ہے کہ متسلط طاقت چونکہ اپنا تمدن اپنا کلچر اور اپنا علمی سرمایہ پھیلاتی ہے، اس لئے مفتوح اقوام کے علوم کی حوصلہ افزائی کے دروازے بند کر کے اعزاز و تکریم سب اپنے ہی رائج کردہ علم کے لئے مختص کر دیتی ہے تا کہ اس کا کلمہ گھر گھر میں داخل ہو جائے اور محکوم قوم کی حیثیت عرفی ،حیثیت اقتصادی سب اس نئے علم کے تابع ہو جائے اور محکوم قوم اس علم سے عزت بھی پائے تو اپنی نہیں بلکہ فاتح کی عزت کا سایہ حاصل کرے۔

اقتصادی تباہی...... اور اسی غلامی کی بدولت بنی اسرائیل کی عام اقتصادی حالت بھی تباہ ہوئی۔ چناں چہ بنی اسرائیل جب مصر سے بھاگ کر نکلے تو اپنے قبطی محلہ داروں سے ہی ان کا زر و زیور لے کر باہر جانے کی ان میں ہمت ہوئی جو بنام قرض و عاریۃً لیا گیا ورنہ اگر خود اپنا مال و متاع کافی ہوتا تو انہیں اسے ہی منگوانے سے فرصت نہ ملتی ،اگر ان کی اپنی اقتصادی حالت اعلیٰ ہوتی تو کیا وہ اسی طرح مفلس و قلاش ہوتے جس کا انہوں نے مصر سے ہجرت کرتے ہوئے ثبوت دیا۔

خارجی تعلقات سے محرومی...... پھر بیرونی تعلقات بھی بنی اسرائیل کے منقطع تھے حتیٰ کہ خود ان کا اصل وطن اور ابراہیم علیہ السلام کا مدفن (شام اور بیت المقدس) تک ان کے لئے اجنبی ہو گیا تھا اگر وہ خود اپنے وطن جاسکتے اور وہاں کا رابطہ قائم رہتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ کے فرمان پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی بس نہ وہ جاسکتے تھے نہ عزت سے رہ سکتے تھے اور اسی لئے بعد نجات فتح بیت المقدس کے لئے انہیں مستقلاً ارض مقدس پہنچنے پر آمادہ کیا گیا اور کہا گیا ﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ② "اے قوم! ارض مقدس میں داخل ہو جسے اللہ نے تمہارے حصہ میں لگایا ہے"۔

بہر حال فرعون کی حکومت نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان کی علمی حیثیت اور تعلیمی منصب کو برباد کیا جس سے ان میں قومی روایات باقی نہ رہیں۔ ان کی منصبی حیثیت باطل کی جس سے اس میں احساس خودداری باقی نہ رہا۔ ان کی اقتصادی حالت برباد کی جس سے ان میں استغناء نہ رہا جو اخلاق فاضلہ کی اساس ہے۔ ان کے تعلقات ساری دنیا سے منقطع کئے رکھے حتیٰ کہ ان کے وطن اصلی سے بھی انہیں منقطع کر دیا جس سے ان میں غربت اور بے کسی قائم ہوگئی۔

برطانیہ کا طرز عمل...... اگر حقیقۃً یہ چار چیزیں غلامی کے عناصر اربعہ ہیں اور ضرور ہیں کہ قرآن حکیم نے ان کی طرف اشارے کئے ہیں تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ: کیا ہندوستان کے مسلمان غلام نہیں ہیں؟ اور کیا ان پر ایک اجنبی شہنشاہی مسلط نہیں؟ ضرور ہے اور جب ایسا ہے تو کیا فی الحقیقت مسلمان بلکہ تمام ہندوستانی باشندوں کے ہاتھ

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۲۱۔

چیزوں میں غلامی کے انہی ارکان اربعہ کی چار میخیں ٹھکی ہوئی نہیں ہیں؟ ضرور ہیں اور بلاشبہ خصوصیت سے مسلمانوں کو ان چار مقاصد کے لحاظ سے اس وجہ سے زیادہ کچلنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے چھینی گئی تھی۔

پس سب سے پہلے مسلمانوں کی روایتی تعلیم برباد کرنے کی کوشش کی گئی کہا گیا کہ جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ان کا مذہبی جنون کم نہیں ہو سکتا، جب تک اسلامی روایات ان کے ذہنوں میں زندہ ہیں یہ احساس خودداری سے بیگانہ نہیں ہو سکتے۔ چناں چہ ابتدائے عہد حکومت میں تو متسلط حکومت نے مسلمانوں ہی کے طرزِ تعلیم کو جاری رکھا لیکن رفتہ رفتہ جدید طریق تعلیم رائج کر کے قدیم تعلیم اور طرزِ تعلیم کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

مسلمانوں کا نظام تعلیم برباد کرنے کی برطانوی سازش...... اس سلسلہ میں خود انگریزوں کی شہادت زیادہ وقیع ہو سکتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور چہارگانہ شعبہ ہائے زندگی میں انہیں کس درجہ تک کچلا ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر آئی۔ سی۔ ایس بنگال نے ۱۸۷۱ء میں کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' لکھ کر اس سلسلہ کے بہت سے حقائق سرکاری کاغذات سے واشگاف کر دیئے ہیں۔ موصوف مسلمانوں کی تعلیمی سلسلہ کی بابت ایک جگہ لکھتا ہے۔

''ہم اپنے دورِ حکومت کے پچھلے ۷۵ سالوں میں انتظام ملک کی خاطر اسی طریقہ تعلیم (مسلمانوں کے طرز تعلیم) سے متواتر فائدہ اٹھاتے رہے۔ گو اس دوران ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جونہی ایک نسل اس نئے طریقہ کے ماتحت پیدا ہوگئی۔ ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیرباد کہہ دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری (سیاسی) زندگی کا دروازہ بند ہو گیا۔ ①

پھر اسی ہنٹر کی کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا دارومدار معافیات اور اوقاف پر تھا جو اسی مقصد تعلیم کے لئے مسلمان امراء اور حکام وقف کر جاتے تھے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ ''صوبہ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال (مسٹر جیمز گرانٹ) کا بیان ہے کہ اس وقت تخمیناً صوبہ کی آمدنی کا ایک چوتھائی حصہ (جو ان معافیات کے سلسلہ میں تھا) حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا ۱۷۷۲ء میں وارن ہسٹنگز نے ان علاقوں کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکام رہی ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس پر قابو نہ پا سکی۔ بیالیس برس بعد ۱۸۱۹ء میں حکومت نے پھر اس معاملہ کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرات نہ ہوئی۔ آخر کار ۱۸۲۸ء میں ۸ لاکھ پونڈ کے خرچ و مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف تعلیم پر حکومت نے قبضہ پا لیا اور صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ گویا تقریباً ۴۵ لاکھ روپے کا اضافہ ہو گیا۔

یہ آمدنی جب مسلمانوں کے قدیم صیغہ تعلیمات کے ہاتھ سے نکل گئی اور تعلیم قدیم کا اسٹاف اس سے محروم ہو گیا تو ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی

① ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ: ۲۴۷۔

نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا تہہ وبالا ہوگیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ ①

آگے چل کر لکھتا ہے "لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کے چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائیداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں ان کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔ ② اندازہ کیجئے کہ اسلامی حکومت میں جب ایک صوبہ میں تعلیمات پر ۴۵ لاکھ روپیہ صرف ہوتا تھا تو دوسرے صوبوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا اور جب ۴۵ لاکھ کی رقم ایک صوبہ سے اڑائی گئی تو دوسرے صوبوں سے آمدنی کیا کچھ ہوتی ہوگی اور اس سے جدید تعلیم کی ترویج میں کس درجہ مدد ملی ہوگی۔

پھر جدید تعلیم اور جدید طریقہ تعلیم رائج کیا گیا اس میں مسلمانوں کے رجحانات کی رعایت کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ انگریز اپنے رجحانات رائج کرتے یا مسلمانوں کے رجحانات کی پرواہ کرتے جن کے مٹانے ہی کے لئے قدیم تعلیم مٹائی گئی تھی۔ اس لئے مذہبی تعلیم کا کوئی جزو اس تعلیم میں نہیں رکھا گیا، ہنٹر ایک جگہ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبہ کی غیر معمولی قلت کی وجوہات گناتے ہوئے لکھتا ہے۔ "تیسرے ہمارے طریقہ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں"۔ ③

آگے چل کر اس سے زیادہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ "ایک اعلیٰ افسر لکھتا ہے: کیا اسکے بعد بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے پرہیز کر رہے ہیں جو ان کے طبعی رجحانات کے لئے کوئی رعایت نہیں رکھتا۔ نہ اس تعلیم کا کوئی انتظام کرتا ہے جس کو وہ اپنے لئے از حد ضروری سمجھتے ہوں بلکہ جو قطعی طور پر ان کے مفاد کے خلاف ہے اور ان کی جماعتی روایات کے بالکل برعکس ہے۔

بہر حال مسلمانوں کی قدیم تعلیم مٹا کر اور جدید تعلیم کو اسلامی رجحانات سے کلیۃً خالی رکھ کر مسلمانوں کو جس تعلیم میں لگایا گیا اس کا مقصد لارڈ میکالے کے مشہور الفاظ میں اس کے سوا کیا تھا کہ "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگریز ہوں"۔ چنانچہ یہ ثمرہ نمایاں ہوگیا آج اس تعلیم کے بعد کون سا ہندوستانی ہے جو شرقیت یا ایشیائیت کا دلدادہ ہو۔ تہذیب انگریزی، تمدن انگریزی، لباس انگریزی، خیالات انگریزی، عقائد انگریزی اور مذہب تک انگریزی ہے۔

برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ...... بہر حال مسلمان علم سے تو یوں گئے اب مالی حیثیت ہو سکتی تھی جس سے دنیا میں انہیں فارغ بالی ہو سکتی تو اس کو ختم کر ڈالنے کی انتہائی سعی یہ کی گئی کہ صوبہ بنگال کے متعلق ہنٹر کہتا ہے۔ "آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل

① ہمارے ہندوستانی مسلمان، صفحہ: ۱۵۷۔ ② ایضاً صفحہ: ۱۵۸۔ ③ ایضاً صفحہ: ۱۵۲۔

یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں"۔

آگے چل کر لکھتا ہے "گزشتہ پچھتر سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے (وسائل دولت منقطع کر دیئے جانے کے سبب) یا تو صفحۂ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے ہیں یا ان لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے (وسائل دولت سے) سربلند کیا ہے"۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۴۶ پر ۱۷۹۳ء کے دوامی بندوبست کے بارے میں جو اس وقت مسلمانوں کو کچلنے کے لئے حکومت کی ایک خاص پالیسی کے تحت کیا گیا لکھتا ہے۔" بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پر فریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو"۔

اس پر فریب پالیسی کا اثر کیا ہوا؟ خود کہتا ہے "اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے ان کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔

آگے آخری نتیجہ لکھتا ہے جو اس سارے تغیر و تبدل کا انتہائی مقصد تھا" مثلاً خود مختار تعلق داروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔

اس دور میں مسلمانوں کی آمدنی کے دو ہی بڑے ذرائع تھے محکمۂ فوج اور محکمۂ دیوانی دونوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کئے گئے تاکہ وہ مالی حیثیت سے انتہائی طور پر پست ہو جائیں۔ ہنٹر لکھتا ہے۔" ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت ان کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے ہم نے ان کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کر دیا کہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے از حد ضروری تھا۔

آگے ملازمتوں اور عہدوں کا ایک نقشہ دیا ہے جس میں مسلمانوں کو دوسری اقوام ہند کے مقابلہ میں صفر کے برابر کر دیا گیا۔ جب ان پر خود ان کے علم کے دروازے ہی بند کر دیئے گئے اور دولت بھی ان کی پر فریب طریقوں اور کھلے اندازوں سے چھین لی گئی تو ظاہر ہے کہ ان کا وقار منصب اور حیثیت عرفی کیا باقی رہ سکتی تھی۔

چناں چہ ہنٹر لکھتا ہے کہ" دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے یا قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں"۔

ہاں جوان کی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر دل و دماغ انہیں دینے پر پختہ ہو گیا اور اس نے حکومت کی ڈگریاں حاصل کر لیں وہ بلاشبہ ان کا منظور نظر ہوا۔ اس نے مالی حیثیت سے ترقی کی اور غلامی کے باوجود کچھ مناصب پائے، جیسا کہ قارون بھی فرعون کے دربار میں بار پا گیا تھا۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر کوئی کہہ سکتا ہے ہنٹر نے یہ احوال صوبہ بنگال کے متعلق پیش کئے ہیں۔ ہندوستان کے بقیہ خطوں کو ان پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ چونکہ اولاً صوبہ بنگال ہی کی سرداری انگریزوں کے قبضہ میں آئی، اس لئے انہوں نے سب سے اول صوبہ بنگال ہی کو تباہ و

پامال کیا اور غداری سے تباہ کیا۔ جس کا ہنٹر کو کھلا اقرار ہے۔ جب ان کی روش ایک صوبہ میں یہ رہی اور ایک مقرر شدہ پالیسی کے ماتحت یہ صورتیں عمل میں آئیں جو حکومت کی پالیسی تھی تو کیسے ممکن تھا کہ یہ پالیسی دوسری صوبوں میں بدل جاتی۔ لہٰذا جہاں بھی یہ حکومت پہنچی وہ ایسا ہی کرتی چناں چہ اس کا جواب ہنٹر ہی اپنے الفاظ میں دیتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''میں یہ بھی بتادوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے۔ پھر میں اگر دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہے کہ یہ بیانات تمام مسلمانانِ ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف کیا جائے''۔

اس سے واضح ہے کہ یہ حال صرف صوبہ بنگال ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا ہے۔ بنگال صرف نقش اولین کا محل رہا ہے۔ نقش ثانی اس سے بھی زیادہ مکمل ہو کر دوسرے صوبوں میں پڑا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کی حمایت سے محروم رکھنے کے لئے برطانیہ کا گھناؤنا کردار......
بہرحال ہندوستان کے مسلمانوں کی داخلی حالت تو علم، دین دیانت منصب اور دولت کے لحاظ سے اس طرح برباد کی گئی۔ مگر خارجہ پالیسی اس سے بھی زیادہ برباد کن رہی ہے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کے بیرونی تعلقات اس داخلی پالیسی پر کسی وقت اثر انداز ہوتے۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق بیرونی دنیائے اسلام سے بھی تھا اور افغانستان سے لے کر ترکی تک مسلمانوں کی حکومت کا ایک مستقل سلسلہ قائم تھا احتمال تھا کہ وہ باہر سے ان کے لئے کوئی وزن دار آواز اٹھاتے یا کسی قسم کی اخلاقی یا مادی مدد دیتے۔ اس لئے پوری دنیائے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے گئے اور ان کے لئے بہت سے ایسے غم مہیا کئے گئے جن میں وہ مبتلا رہیں۔

چناں چہ اختلافات وغیرہ کی جو خلیج داخل ملک میں حائل کی گئی وہی پوری دنیائے اسلام میں بھی رائج کی گئی۔ کہیں ایران و افغانستان کا مسئلہ، کہیں ایران و ترکی کا مسئلہ، کہیں ترکی و عربستان کا مسئلہ، کہیں شام و فلسطین کا مسئلہ، کہیں خلافت اسلامیہ کا مسئلہ۔ چناں چہ آس پاس کی آویزش سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف ترکی کے حصے بخرے ہوتے رہتے تھے۔ دوسری طرف خلافت اسلامیہ کے مٹانے کا مسئلہ چھڑا رہتا تھا۔ کہیں افغانستان پر دانت رہتا تھا۔ کہیں ایران جو بالآخر ہضم ہو کر رہا خلافت مٹ کر رہی۔ ایسے ایسے مسلمان کھڑے کئے گئے جو ان مسائل کو خود اٹھاتے اور آخر میں فیصلہ برطانیہ کے ہاتھ میں آجاتا۔ برطانوی شہنشاہی سے دوستی کے رنگ میں وہ احکام صادر ہوتے جس سے نہ مدعی باقی رہتا نہ مدعا علیہ بلکہ دونوں کی میراث جج کے ہاتھ میں آجاتی۔

آزادی پسند مسلمانوں کو بدنام کرنے کی اسکیم...... ادھر ہندوستان میں جن دردمندوں نے دین اور ملک کی آزادی کے لئے آواز اٹھائی اور کھڑے ہوئے تو ان کے تعلقات عام مسلمانوں سے منقطع کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی گئیں۔ سو وہ ہنٹر کے کتاب دیکھنے سے واضح ہوسکتی ہیں۔ ان میں سے اولین وجہ کی تدبیر یہ تھی کہ ان

آزادی پسند جماعتوں کو حسب بیان ہنٹر انگریزوں کی طرف سے باغی اور آخر میں وہابی کا لقب دے کر بدنام کرنے کی مہم جاری کی گئی جس کی تفصیلات اس کتاب کے پڑھنے سے واضح ہو سکتی ہے۔ یہ اسکیم عملاً آج تک جاری ہے۔ اب کیا کوئی اس کے خلاف بھی یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہند کی پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی حکومت، ثروت، شوکت، حشمت اور دولت اور دیانت و دین اندرون و بیرونی تعلقات میں جو گھن لگا اور وہ بالآخر ان تمام چیزوں کو کھا گیا وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کے نظام حکومت کے سوا کوئی اور چیز تھا؟

پس فرعون نے جو معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کہ انہیں ان کے علم سے بے بہرہ کیا پھر ان کی دولت کے چشمے خشک کئے پھر ان کی حیثیت عرفی زائل کر کے انہیں قلی، چپراسی، اور معمولی خدمت گاروں کے درجہ پر پہنچایا اور پھر ان کے تعلقات باہمی و بیرونی منقطع کئے وہی معاملہ برطانوی شہنشاہی نے مسلمانوں کے ساتھ کیا جس کی تفصیلات میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب سے خود انگریزوں کے مسلمات پیش کر چکا ہوں۔ غلامی کے ان اثرات کے بعد کون کہہ سکتا ہے؟ کہ غلامی پر کسی غلام قوم کا قناعت کئے رہنا موت کے مترادف نہیں ہے؟ اس لئے قرآن نے اسے بدترین عذاب اور اسے برپا کرنے والوں کو بدترین طاغی اور سرکش کا لقب دیا ہے۔ جیسا کہ آیت بالا کے ابتدائی کلمات ہی سے واضح ہو گیا۔

بنیادی مسئلہ...... ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہو گئی کہ مسلمانوں کے لئے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے نہ اقتصادیات کا نہ اپنے اور ابنائے وطن کے تعلقات کا نہ منصبی اور عرفی حیثیت کا بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سرا ہندوستان کے مسلمانوں کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا سرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔ آج ہندوستانی مسلمانوں اور پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر قانونی اور بین الاقوامی قوانین کی جکڑ بندیوں اور ساتھ ہی اندرونی ریشہ دوانیوں کی پھانسیاں لگی ہوئی ہیں جو دنیائے اسلام کو پنپنے نہیں دیتیں جس میں بلاشبہ ایک ہی ہاتھ کام کر رہا ہے اور وہ برطانوی شہنشاہی اور استبداد و استعباد ہے جس کی گرفت کھول دینے کی ضرورت ہے۔

اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے نہ اولاً تورات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف کچھ زیادہ توجہ فرمائی جس سے مالی حالت درست ہوتی نہ اور امور کی طرف زیادہ التفات فرمایا جن سے حیثیت و عزت کا تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ ① ”بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ بھیج“ تا کہ یہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں اور اپنی مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود کرنے پر قادر ہو جائیں۔

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۷۔

پس آج بھی ہندوستانیوں کے لئے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادیٔ دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند سے متعلق ہے تاکہ مسلمانانِ عالم اپنے دین و مذہب، اپنی سیاست اور اپنی اقتصادی و معاشرتی حالت کو اپنی مرضی کے مطابق درست کر سکیں۔ پس مسلمانوں کے لئے حصول آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے انہیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

[3] **جدوجہد آزادی ایک مذہبی فریضہ**...... ادھر جب کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جا کر کہو ﴿اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ ”کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے انہیں نجات دے“۔ تو آیت سے صراحتہً یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لئے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے مستقلاً ایک اولوالعزم پیغمبر علیہ السلام کی معیت عمل میں آئی۔ کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لئے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھہرتی؟ اگر اس وقت کی مصری اجنبی حکومت سے بنی اسرائیل کی آزادی تقریباً ضروری تھی تو آج ہندوستان کی اجنبی حکومت سے بھی مسلمانوں کی آزادی مذہباً ضروری ہے۔ بہرحال اس آیت ﴿اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ﴾ سے غلامی کا اپنی ذات اور آثار کے لحاظ سے امر قبیح ہونا بھی واضح ہوا اور ساتھ ہی اس کے دفعیہ کی جدوجہد کا مشروع اور وظیفۂ شرعی ہونا بھی نمایاں ہو گیا۔

[4] **حصول آزادی کا پروگرام**...... اس کے بعد حصول آزادی کے پروگرام کا سلسلہ رہ جاتا ہے تو قرآن نے انہی آیات میں اصولاً اس پر بھی روشنی ڈال دی ہے۔ چناں چہ اس خطاب خداوندی ﴿اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ﴾ سے جو بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ازالۂ غلامی کی تدبیر کے وقت اولاً غلام قوم کو اس مرض کے سرچشمہ کی طرف نظر دوڑانی چاہئے کہ یہ غلامی کے جراثیم چلتے کہاں سے ہیں؟

آیت نے واضح کیا کہ بنی اسرائیل کی غلامی کا سرچشمہ فرعون کا طغیان تھا۔ جس کے رکن تھے استبداد اور استعباد۔ استبداد کے ماتحت اس نے اپنی شخصی حاکمیت مطلقہ کا جال پھیلا رکھا تھا جس کا انتہائی ثمرہ اس کا دعوائے الوہیت تھا جس میں حاکمیت مطلقہ کے تمام حقوق اس نے اپنے لئے ثابت کئے اور کہا ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی﴾ ① ”میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں“۔ پھر اپنے سوا ہر ایک غیر سے اس منصب کی نفی کرتے ہوئے کہا ﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ﴾ ② ”میں اپنے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں سمجھتا ہوں“۔

پھر جس ذات بابرکات کا یہ واقعی تنہا حق تھا یعنی حق جل مجدہ، اس سے نہ صرف مقابلہ ہی کی ٹھانی بلکہ معاذ اللہ اس کی الوہیت کو بزعم خود مٹانے پر تل گیا اور اپنے وزیر ہامان سے کہا ﴿فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ

---

① پارہ: ۳۰ سورۃ النازعات، الآیۃ: ۲۴۔ ② پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸۔

③ پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸۔ ④ پارہ: ۱۹ سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۲۔

﴿فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ ① ”تو اے ہامان! تم ہمارے لئے مٹی کو آگ میں پکواؤ (یعنی پختہ اینٹیں بنواؤ) پھر میرے واسطے ایک عمارت بنواؤ تاکہ میں موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں“۔

اور استبداد کے ماتحت بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا جذبہ تھا جو فرعون میں کام کر رہا تھا۔ قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقولہ کے ضمن میں اس کی بھی حکایت فرمائی اور کہا ﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ② ”اور (مجھے پرورش کرنے کا احسان جتلانا“)

سو وہی یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ (اس کے بدلہ میں) تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا (حالانکہ وہ نعمت نہیں وہ بھی تیرے ظلم ہی کا نتیجہ تھا نہ تو بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرتا نہ میری ماں مجھے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہاتی نہ وہ تیرے محل میں پہنچتا اور نہ تو مجھے پرورش کرتا۔ پس میری پرورش کا منشا قتل اولاد بنی اسرائیل تھا جو تیرا انتہائی ظلم تھا۔

برطانیہ کا جمہوری استبداد...... ان آیات سے واضح ہے کہ استبداد (بنی اسرائیل کی غلام سازی کا) منشاء فرعون کا استبداد یعنی اس کی شہنشاہی تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ﴿اِنَّهٗ طَغٰى﴾ سے متنبہ فرمایا گیا۔

اسی طرح آج غلام ہندوستان کو محسوس کرنا چاہئے کہ اس کی غلامی کا منشاء برطانوی شہنشاہی اور اس کا استبداد ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں استبداد شخصی تھا یہاں قومی ہے۔ وہاں انفرادیت تھی یہاں اس پر جمہوریت کا پردہ پڑا ہوا ہے مگر استبداد و استعباد کا جذبہ وہی ہے جو فرعون میں کارفرما تھا۔ فرعون نے اگر ملک مصر کی سلطنت پر مغرور ہو کر خدائی کا دعویٰ اور خدائے برتر سے مقابلہ کی ٹھانی تو آج کی یورپین مغرور بدمست قومیں بھی اسی سر پرآرائی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر خدائے حقیقی کے مقابلہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ جو لشویک کے ہاتھ میں طاقت آئی تو انہوں نے بالفاظ خود اپنی سلطنت میں خدا کا داخلہ ممنوع قرار دیئے جانے کا اعلان کیا۔ جرمنوں کے ہاتھ میں خدا کی بخشی ہوئی حکومت آئی تو انہوں نے وطنی تعصب کے جذبہ سے کہا کہ: اگر خدا جرمن ہوتا تو جرمن قوم اسے مان سکتی تھی۔ برطانیہ کے ہاتھ میں وسیع ملک آیا تو اس کے بعض ذمہ داروں نے اپنی سلطنت کے طول عرض کو دیکھ کر کہا تھا کہ: اگر آسمان بھی ہمارے ملک پر گرنا چاہے گا تو ہم اپنی سنگینوں کی نوک پر اسے رکھ لیں گے۔

غرض یہ استبدادی دعوے وہی ہیں جو فرعون نے کئے تھے۔ ادھر جو استعبادی جذبہ اس کا تھا وہی آج کی بدمست اقوام کا بھی ہے جس کے ماتحت آج دنیا کی اقوام کو غلام بنائے رکھنے اور بنائے جانے کے منصوبے گانٹھے جاتے رہتے ہیں اور اس معاملہ میں آپس میں سودا بھی ہوتا رہتا ہے جو کہیں کھلے قبضہ کی صورت میں کہیں انتداب کی صورت میں اور کہیں مداخلت اور داخلی اثرات کی صورت میں نمایاں ہے اور ﴿يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ﴾

① پارہ: ۱۹ سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۴۔

④ کا وہی ظہور ہو رہا ہے جو فرعون کے وقت میں ہوا تھا۔ غرض سرچشمہ غلامی یہاں سے متعین ہو جاتا ہے۔

⑤ پیغمبرانہ قیادت کی ضرورت...... بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب اور مبعوث من اللہ ہونا اور انہیں ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ﴾ کا حکم دیا جانا اس کی صاف دلیل ہے کہ آزادی کی جدوجہد کے لیے پیغمبری سے مدد لیا جانا ضروری ہے، یعنی پیغمبر کی قیادت میں حصول آزادی کا راستہ طے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر علیہ السلام اختراعی راستے نہیں بتاتا بلکہ وحی الٰہی سے پیش کرتا ہے جس سے خدا کا بتلایا ہوا پروگرام سامنے آتا ہے۔ اس نکتہ کے ماتحت حصول آزادی کے تمام سیاسی نظریات وفکریات جو اختراع محض سے منصۂ ظہور پر آتے ہیں اور آرہے ہیں۔ ختم ہو جاتے ہیں اور منشاء خداوندی یہ نکلتا ہے کہ اس سلسلہ کی لیڈر شپ کسی فلسفی یا طبیعی یا معاشی عالم کے ہاتھ میں ہونے کے بجائے ربانی اور حقانی فرد کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو وحی الٰہی کی مدد سے پروگرام بناتا ہو تاکہ وہ قوم کو نجات دلانے کے ساتھ ساتھ اس کی اصلاح بھی کر سکے جس کے فساد ہی سے یہ غلامی کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں ورنہ بلا اصلاح نفوس نجات کے بعد اس مرض کے عود کر آنے کا خطرہ پھر قریب ہی رہتا ہے۔

پس جو شخص بھی قرآن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے حصول آزادی کی تدبیر کی پہلی کڑی صرف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نبوت وقت یعنی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی قیادت میں گامزن ہو۔ جس کا واضح ترین پروگرام یہ قرآن اور اس کی مدونہ شریعت ہے۔ جس کا ایک بازو اس کی اولین تفسیر یہ حدیث رسول اور دوسرا بازو اس کی فقہی تشریحات ہیں۔ لہٰذا مسلمان کسی ایسی قیادت کو تسلیم نہیں کر سکتے جو کتاب وسنت سے الگ کوئی نیا راستہ بتاتی ہو۔ ہاں کتاب وسنت کے معیار پر پرکھ کر بلاشبہ اس کے رد وقبول کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ:۔

⑥ غاصب قوم سے حکم جہاد...... اب حصول آزادی کے لئے نبوت کا لایا ہوا پروگرام ظاہر ہے کہ اصولاً دو ہی نوعوں میں منقسم ہو سکتا ہے۔ تشدد اور عدم تشدد۔ سو اس کے مواقع اور محل میں تفصیل ہے اگر فاتح قوم نے مفتوح قوم کو اس کے وطن سے نکال باہر کیا ہو اور اس کے ملک ہی نہیں املاک پر بھی قبضہ کر لیا ہو جس سے وہ بے یار ومددگار ہو کر وطن سے بے وطن ہو کر در بدر بھٹکتی پھر رہی ہو تو اس صورت میں استخلاص وطن کی صورت بقیادت پیغمبری تشدد ہے کہ قتال وجہاد کے ذریعہ اس ظالم اور غاصب قوم سے نبرد آزما ہوا جائے اور اپنا وطن واپس لیا جائے۔

چناں چہ ارض مقدس (بیت المقدس) کے استخلاص کے لئے (جس پر عمالقہ نے قابض ہو کر بنی اسرائیل کو بے وطن بنا دیا تھا) جہاد کا حکم ملا مگر بنی اسرائیل نے اس کی تعمیل نہ کی اور چالیس برس تک میدان تیہ میں سرگردانی اور حیرانی کی زندگی بسر کرنے کی سزا بھگتی جیسا کہ قرآن پاک نے چھٹے پارہ میں اس کی پوری تفصیلات بیان فرما دی ہیں یا جیسے حضرت سموئیل کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے وطن پر جب جالوت نے قابض ہو کر انہیں ان کے دیار سے نکال باہر کیا تو بحکم پیغمبر طالوت کی قیادت میں انہیں استخلاص وطن کے لئے قتال وجہاد کا حکم ملا ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى

الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی، اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ، قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا، قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا﴾ ① ”(اے مخاطب) تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا؟ جب ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ: ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔ ان پیغمبر نے فرمایا کہ: کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کون سا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں۔ حالانکہ اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیے گئے ہیں“۔

یا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن خیر میں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکالا گیا اور آپ وطن سے ہجرت پر مجبور ہو گئے تو مدینہ سے قوت فراہم کر کے استخلاص وطن کے لئے قتال کا حکم ملا تا کہ مکہ کو کفار سے آزاد کرایا جائے۔ ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ، وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ o نِالَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ ② ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے“۔ بہرحال بے وطنی کی صورت میں استخلاص وطن کی صورت بعد فراہمی قوت تشدد ہے جو پیغمبر علیہ السلام یا مورثین پیغمبر علیہ السلام کی قیادت میں کیا جائے۔

عدم تشدد کے ذریعہ احتجاج..... لیکن اگر فاتح قوم نے محض سلطنت وحکومت چھینی ہے محکوم قوم کو ان کے گھروں سے نہیں نکالا وہ بدستور اپنے وطن میں آباد ہیں مگر غلام بن کر نہ انہیں بااختیار خود باہر جانے دیا جاتا ہے اور نہ داخلی آزادی سے انہیں زندگی بسر کرنے دی جاتی ہے تو اس کا حل بقیادت پیغمبر عدم تشدد ہے یعنی پرامن رہ کر حصول آزادی کی جدوجہد کی جائے۔

فرعون کی شہنشاہی میں بنی اسرائیل کی یہی نوعیت تھی کہ نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت سے حکومت مصر ان کی تھی۔ مصر ان کا تھا جس پر فرعون نے قبضہ پایا اور بنی اسرائیل کو غلام بنالیا۔ انہیں مصر سے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام یہ خواہش کیوں کرتے کہ ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ ③ ”(اے فرعون بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے)“ اور مصر میں امن وراحت سے رہنے کی بھی اجازت نہ تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام کیوں فرماتے کہ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (اور بنی اسرائیل کو ستامت)۔ بس ایسے ہی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۴۶۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۹، ۴۰۔

③ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۷۔

برطانوی شہنشاہی میں بھی مسلمانوں کے لئے نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن، تو استخلاص وطن کے لئے بھی موسوی طریقہ عدم تشدد اختیار کرنا پڑے گا اور حکومت سے احتجاج کیا جائے گا کہ انہیں آزاد کر دو۔

(۲) عدم تشدد کے پانچ ہتھیار..... مگر جس طرح تشدد کے اسلحہ تیر و تفنگ اور توپ و بندوق ہیں ایسے ہی عدم تشدد کے بھی کچھ اسلحہ ہیں۔ جو اس جنگ آزادی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ جل ذکرہ سے طلب فرمائے اور ﴿اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ﴾ کی تعمیل کے لئے جواب میں عرض کیا کہ مجھے چند اسلحے درکار ہیں۔ جو اس جابر بادشاہ کے مقابلہ کے لئے ناگزیر ہیں جن کو ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾ سے شروع فرمایا۔

یہاں صرف ان معنوی اور اخلاقی اسلحہ کی تفصیل پر نظر ڈالئے جو آیت عنوان میں موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب فرمائے ہیں۔ یہ عدم تشدد کے پانچ ہتھیار ہیں جو مانگے گئے۔

پہلی چیز شرح صدر ہے کیونکہ جب تک کسی مقصد کے لئے سینہ نہ کھل جائے اور وہ مقصد دل کے اندرونی داعیہ اور جذبہ سے نہ ابھرے حوصلہ بلند نہ ہو آدمی زور قوت اور وزن دار آواز سے اسے پیش نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز تیسیر امر ہے کیونکہ اگر باوجود انشراح صدر کے ادھر سے اعانت و توفیق اور مہیا اسباب و وسائل نہ ہو تو محض جذبہ اندرون کام نہیں دے سکتا۔

تیسری چیز حل عقدہ لسان ہے کہ اگر بلیغ انداز میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت نہ ہو کلام میں فصاحت اور شیرینی نہ ہو تو مخاطب پر مقصد کا اثر نہیں پڑ سکتا اور اس اجتماعی مقصد میں نہ اپنوں کی جمعیت بن سکتی ہے نہ دشمن کی سوسائٹی ٹوٹ سکتی ہے بلکہ وہ تصدیق کی بجائے اور تکذیب پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

چوتھی چیز اعانت کار اور اشتراک عمل ہے کہ اگر کام میں اشتراک عمل نہ ہو اور کوئی بھروسہ کا معین و یاور ساتھ نہ ہو تو انفرادیت کے ساتھ یہ اجتماعی کام نہیں چل سکتا۔ نیز طبع بشری تنہائی کے ساتھ جب کہ وہ بے معین و مددگار ہو قرار بھی نہیں پکڑ سکتی۔ ساتھ ہی قلبی و باطنی مقاصد میں انشراح و استقلال بھی میسر نہیں آ سکتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عمرین میں سے ایک عمر کے اسلام کی دعا فرمائی تھی جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، کے حق میں مقبول ہوئی کہ انہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وزارت کا قلمدان مکمل ہونے والا تھا۔

اور پانچویں چیز جو ان سب کی روح اور معنوی قوت ہے وہ ذکر اللہ اور ذات بابرکات حق کی تسبیح و تقدیس ہے کیونکہ اگر توجہ الی اللہ نہ ہو تو نہ شرح صدر ہو، نہ تیسیر امر نہ حل عقدہ ہو نہ اشتراک عمل کی توفیق و تاثیر۔

یورپ کی غلامی سے نجات کا راستہ...... (الف) اس سے صاف ظاہر ہے کہ استخلاص وطن کی مساعی کا آغاز ذکر اللہ، دعا، یاد حق اور توجہ الی اللہ سے ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ کے اجتماعات کی تقریریں مکالمے وغیرہ سب میں ذکر حق کی روح دوڑی ہوئی ہونی چاہئے اور ساری جدوجہد کا رجوع اور رخ بالآخر ذات حق کی طرف ہونا چاہئے تاکہ اس اخلاص کی بدولت یہ کام نتیجہ خیز بھی ہو اور ظاہر و باطن کی صلاح و فلاح کی راہیں خدا کی طرف سے کھلی رہیں۔

خلاصہ یہ کہ استخلاص وطن کی مہم دینی رنگ اور اسلامی ڈھنگ سے شروع کی جائے نہ کہ یورپ کی نقالی اور نمائشی مظاہروں سے، کام ٹھوس ہونا چاہئے نہ کہ رسمی۔ ورنہ جس غلامی سے گلوخلاصی کے لئے حرکت کی جائے گی وہی غلامی اور گلوگیر ہو جائے گی۔ گویا یورپ سے بچنے کے لئے یورپیت کا پھندا گلے میں آ پڑے گا جو بچنا نہیں کہلائے گا بلکہ اور پھنسنا کہلائے گا اور ثمرہ یہ ہوگا کہ ظاہری غلامی کے ساتھ باطن کی غلامی بھی سر پر پڑ جائے گی۔

اشتراک عمل کی ضرورت...... ان مرادوں میں کچھ چیزیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کے لئے طلب کیں جیسے شرح صدر، تیسیر امر، حل عقدہ لسان۔ لیکن جو چیز سب سے اہم طلب کی وہ ﴿وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي﴾ ① ہے یعنی میرے اس کام میں میرے بھائی کو شریک کر دیا جائے جس سے واضح ہے کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں اشتراک عمل اولین منزل ہے اور وہ بھی اپنوں کے ساتھ۔ اس سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ آج مسلمانوں کو باہمی اشتراک عمل کی اشد ضرورت ہے۔ غیروں سے پہلے انہیں اپنوں کو اپنانا چاہئے۔ جمعیت العلماء سے زیادہ کون اس کا حق دار ہے کہ وہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی طرف وداد ومحبت کا ہاتھ بڑھائے اور درمیانی رکاوٹوں کو آئینی اور رسمی انداز سے نہیں بلکہ واقعاتی انداز سے دور کر کے ٹوٹے ہوؤں کو ملانے کے لئے خود اقدام کرے۔ معاذیر نہ پیش کرے۔ بلکہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اجتماعیت کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دے اور خود جھک کر دوسروں کو اپنے سامنے جھکادے۔ خواہ وہ لیگی ہوں یا احراری۔ حق تعالیٰ نے یہ تمام باطنی اسلحہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرما دیئے اور ارشاد ہوا۔ ﴿قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَى﴾ ② ''فرمایا بلا شبہ تمہاری مراد تمہیں دی گئی اے موسیٰ۔

اور اس کے بعد تسلی آمیز کلمات فرما کر پھر اس ابتدائی حکم کو اس طرح دہرایا گیا ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۝ اذْهَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ بِآيَاتِي وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي ۝ اذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۝﴾ ③ ''اور میں نے تم کو (اے موسیٰ) اپنے لئے منتخب کر لیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کے جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت چل نکلا ہے''۔

⑧ **معیار قیادت**...... اس سے واضح ہوا کہ اس اجتماعی کام کے شرکاء اور وہ بھی منصب داران قیادت ذاکرین کی جماعت ہو، غافلین کی نہ ہو جنہیں نہ اللہ کی معرفت ہو نہ اس کی محبت ہو اور نہ اس کے طریق اور راہ سے واقفیت ہو کہ وہ مسلمانوں کے کام اسلامی حیثیت سے کبھی نہیں بنا سکتے۔ مگر ساتھ ہی اسے فراموش بھی نہ کرنا چاہئے کہ قوم میں جو لوگ کسی نہ کسی حیثیت سے بڑائی پیدا کر چکے ہیں اور مخلص بھی ہوں ان کی ادنیٰ توہین یا بے وقعتی بھی گوارا نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ اجتماعی کام میں افراد ہی کا نہیں اجتماعات کا وابستہ رکھا جانا بھی ناگزیر چیز ہے۔ ورنہ اجتماعیت عامہ پیدا نہیں ہو سکتی جو قومی حریت کے لئے اولین زینہ ہے۔ ہاں ان کی تقویم اور غلط روش کی اصلاح، شفقت و

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۳۲. ② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۳۶. ③ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۱، ۴۳.

محبت اور خلوص کے ساتھ ضروری ہے تاکہ وہ بھی بلا کسی جھجک کے امر حق کی طرف جھک آئیں اور لاعلمی کے سبب ان میں جو بعد سوء اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا وہ مبدل بہ قرب ہو جائے۔ غرض اس طرح سے دو پیغمبروں کو قائد بنا کر فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا۔

⑨ مذاکرات کی بنیاد...... یہیں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حکمران کے پاس جانے والے (جو آزادی مانگنے کے لئے جا رہے ہوں) بحیثیت فرستادہ خدا جائیں نہ کہ ذاتی تقاضے سے روانہ ہوں جیسے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام از خود نہیں گئے، بھیجے ہوئے گئے۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکومت الٰہی پر عائد ہو جائے گی۔ قوم پر کوئی برائی اور آنچ نہیں آئے گی۔ غرض ان تمام کیفیات کے ساتھ ارشاد ہوا کہ فرعون کے پاس پہنچو۔ اسی موقع کے لئے دوسری جگہ قرآن میں یوں ارشاد ہے۔ ﴿وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ أَلَا يَتَّقُونَ﴾ ① ”اور جب آپ کے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ تم ان ظالم لوگوں یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ۔ کیا یہ لوگ نہیں ڈرتے“۔

⑩ حکومت اور قوم سے افہام و تفہیم کی ضرورت...... اس سے واضح ہوا کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں نہ صرف حکمران ہی کے پاس جانے کی ضرورت ہے بلکہ حکمران قوم کے پاس بھی جانے اور ان سے مل کر گفت و شنید کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ حکومت اپنے غرور میں مدعا پر کان نہیں دھرتی مگر حکومت کی قوم سمجھ جاتی ہے اور کبھی برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ بہر حال حکومت اور قوم دونوں سے اس بارے میں گفت و شنید ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان دونوں احکام سے دو خطرے لاحق ہوئے جن کو انہوں نے صفائی سے عرض کر دیا۔ حکومت سے تو زیادتی اور تعدی کا کہ فرعون کوئی جابرانہ کارروائی نہ کر بیٹھے کیونکہ اس کے ہاتھ میں طاقت تھی تو عرض کیا ﴿قَالَا رَبَّنَا إِنَّنَا نَخَافُ أَن يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَن يَطْغَىٰ﴾ ”دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔

اور قوم سے خطرہ ہوا تعصب اور ہٹ دھرمی کا کہ بات نہ مانے اور مجھے جھٹلا دے کیونکہ وہ مستغنی تھی تو عرض کیا: ﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ﴾ ② ”کہا اے میرے پروردگار مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلانے لگیں حق تعالیٰ نے جواب میں تسلی دیتے ہوئے فرمایا ﴿قَالَ لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ﴾ ③ ”اور ارشاد ہوا تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ﴿كَلَّا فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا إِنَّا مَعَكُم مُّسْتَمِعُونَ﴾ ④ ”کیا مجال ہے سو تم دونوں ہمارے احکام لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ اگر فرستادہ خدا ہونے کی حیثیت سے احکام اور حکمران قوم سے ملا جائے گا تو حضرت کی

① پارہ: ۱۹ سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۰، ۱۱۔ ② پارہ: ۱۹ سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۲۔

③ پارہ: ۱۶ سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۶۔ ④ پارہ: ۱۹ سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۵۔

ذمہ داری اللہ پر ہوگی۔ یعنی کام خدا کے نام اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام پر شروع کیا جائے تو پھر اس کے اثرات ونتائج دوسرے ہوں گے۔ اگر ہم اپنے اختراعی پروگراموں اور خود اپنی ذوات کے بل بوتہ پر کام شروع کریں تو اس کے نتائج اور ہیں۔ ان میں وہ قوت نہیں آ سکتی جو پہلی صورت میں ممکن ہے۔

۴۹ **شعارِ قیادت** ...... اس لئے آیت بالا میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو نہ صرف یہی حکم دیا گیا کہ بحیثیت فرستادۂ خدا ہونے کے دربار فرعونی میں جاؤ۔ اپنی طرف سے مت جاؤ اور نہ صرف یہی کہ ہمارا ہی پیغام پہنچاؤ اپنی طرف سے کچھ نہ کہو یعنی اختراعی پروگرام مت اختیار کرو بلکہ یہ بھی ارشاد ہے کہ انداز پیام رسانی بھی ہمارا ہی متعین کردہ اختیار کرو بطور خود طریق ابلاغ بھی متعین نہ کرو اور وہ یہ کہ ﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ ① ''پھر اس (فرعون) سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

یعنی مکالمہ میں بھی تشدد کا پیرایہ نہ آنے پائے۔ جبکہ یہ جنگ عدم تشدد کی جنگ ہے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو اس جنگ آزادی کے قائد اعظم تھے طبعاً تیز مزاج تھے اور ان کی شان جلالی واقع ہوئی تھی۔ افتاد طبع میں حدت اور شدت تھی۔

چناں چہ اس تشدد پسندی کے چند واقعات بھی ان سے ظاہر ہو چکے تھے، قبطی کو جوش میں تھپڑ مارا تو اس کی گردن الگ جا پڑی اور مر گیا، بچپن میں فرعون کا دعوائے الوہیت سن کر ایک دو چپت اسے بھی رسید کئے اس کی داڑھی پکڑلی وغیرہ تو اندیشہ تھا کہ فرعون کے بے باکانہ اور گستاخانہ جوابات سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی طبعی رفتار پر کہیں اکھاڑ پچھاڑ کرنے نہ چلے آئیں اور نصیحت وشفقت یا اتمام حجت کا معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے، اس لئے بہ تاکید دونوں حضرات کو شیریں زبانی اور نرم گوئی کا حکم دیا گیا تاکہ یا دشمن اس خوش اخلاقی سے مسخر ہو جائے اور یا پھر برملا اس کی تعدی واضح ہو کر کھلے بندوں اس پر حجت تمام ہو جائے۔

کون نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ جوش وخروش عیاذاً باللہ نفسانی نہ تھا کہ نبوت کی بارگاہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ بغض فی اللہ تھا جو شرعاً مطلوب ہے لیکن موقعہ کی نزاکت اور اجتماعیات کی تکمیل کے سلسلہ میں ضروری تھا کہ اس جذبہ کو اگر چہ وہ دینی تھا مستور کر کے دوسرے دینی جذبہ رافت فی اللہ اور صبر وتحمل کو بروئے کار لایا جائے کیونکہ مقصود اصلی صرف اتنا ہی نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام تبلیغ کر کے اپنا ذمہ بری کر لیں اور فرعون کو کہہ سن کر فارغ ہو جائیں بس فرض تبلیغ ادا ہو جائے، آگے فرعون اور فرعونی جنت میں جائیں یا جہنم میں، نہیں بلکہ مقصود اصلاح اور تکمیل کار تھی اور فرعون کے پاس اس جذبہ کے ساتھ جانا تھا کہ وہ کسی طرح راہ راست پر آ جائے نہ یہ کہ ہم پیام پہنچا کر بری الذمہ ہو جائیں۔

اور ظاہر ہے کہ قصدِ اصلاح وتربیت کے ساتھ مخاطب کے احوال کی رعایت کی جاتی ہے نہ کہ اپنے احوال

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۴۔

کی۔اس صورت حال سے یہ مسئلہ نمایاں ہوتا ہے کہ آج بھی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے قائدین اور زعماء کا خواہ وہ کسی اجتماعی ادارہ کے ذمہ دار ہوں یا خود اپنے کام کے، شعار رافت و رحمت ہونا چاہیے، قول لین اور نرم گوئی ان کی شان غالب ہو تا کہ اپنے ٹوٹنے نہ پائیں اور غیر بیگانے نہ رہیں، غلظت قلب اور شدت ہمیشہ قطع کا باعث ہوتی ہے اور رافت و لینت ہمیشہ وصل و ملاپ کا سبب بنتی ہے بشرطیکہ اس میں مداہنت اور استرضاء غیر اللہ نہ ہو۔ پس زعماء مسلمین زیادہ احق ہیں کہ ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ① کے مصداق بنیں اور ﴿أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ ہو کر حکمت اور رافت اور نصیحت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اقتدار کے فرعون سے طرزِ گفتگو......اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں حکومت متسلطہ کے مظالم اور آئینی انداز کی چیرہ دستیاں مسلمانوں کی شوکت کو تباہ کرنے کی وسیع کاریاں، بلاد اسلامیہ کو چن چن کا پامال کرنا اور اسلامی شوکت کو مٹا کر نصرانی عظمت و استبداد کو قائم کرنا، مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کرنا۔ ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدوں کو پس پشت ڈال کر ان کی صریح خلاف ورزی کرنا، ہندوستانی اقوام سے جھوٹے وعدے کر کے انہیں احمق بنانا اور اپنا الو سیدھا کرتے رہنا، انہیں لڑا لڑا کر حکومت کی بنیادیں استوار کرنا وغیرہ وہ امور ہیں کہ حمیت اسلامی کے ماتحت ان پر مسلمانوں اور ان کے زعماء کو جس قدر بھی جوش ہو کم ہے اور جس قدر بھی وہ غیظ و غضب کا اظہار کریں انہیں حق ہے۔ فان لصاحب الحق مقالا لیکن ساتھ ہی یہ پہلو بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مقصود اصلی جوش کا مظاہرہ کر لینا نہیں بلکہ اپنی آزادی اور مقابل قوم کو حق سے متاثر کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطب میں تاثر اور سیلان اظہار غضب سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ رقت و لین سے، موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ ہم بغض فی اللہ کے حامل نہیں ہو سکتے لیکن انہیں بھی عدم تشدد کی جنگ کی صورت میں قول لین کا حکم دیا گیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون بغض فی اللہ سے متحقق ہو سکتا ہے اور وہ بھی بمقابلہ مشرکین مکہ جنہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا میں پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی حتیٰ کہ آخر کار وطن اور گھر بار تک سے محروم کر دیا لیکن مکہ کی زندگی میں جو عدم تشدد کی زندگی ہے، خود حضور کو بار بار حکم ملتا رہا کہ صبر سے کام لو، تحمل سے کام لو، کسی جذبہ کا اظہار نہ کرو۔ شفقت و خیر خواہی خلق اللہ کو ہاتھ سے رہاں مالیاں کھا کے بے مزہ مت ہو۔ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ﴾ ② ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ﴾ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ○ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِءِينَ﴾ ③ ”سو آپ صبر کیجئے جیسے اُولو العزم انبیاء نے صبر سے کام لیا اور جلدی نہ کیجئے۔ سو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کیجئے۔ غرض آپ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کو صاف صاف سنا دیجئے اور ان مشرکین کی پرواہ نہ کیجئے یہ لوگ جو ہنستے ہیں۔

---

① پارہ: ۲۶ سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔ ② پارہ: ۲۶ سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۳۵۔ ③ پارہ: ۱۴ سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۴۔

④ شعب الایمان للبیہقی، فصل فی اسمائہ صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۳ ص: ۱۴۱ (قال البیہقی رحمہ اللہ: ھذا مرسل)

چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب ہی رحمۃ اللعالمین ہوا۔ آپ کا لقب ہی رَحْمَۃٌ مُّھْدَاۃٌ ② ہوا اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور خیر خواہی خلق اللہ کا یہ عالم ہوا کہ حق تعالیٰ کو اس غیر معمولی شفقت سے روک کر اس کی تعدیل فرمانی پڑی کہ: ﴿لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ.﴾ ① ”شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے۔

بہر حال یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اس عدم تشدد کی جنگ میں دشمنوں اور فرعون صفت دشمنوں کے سامنے قول لین کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار غیظ وغضب کی اور خود انہیں بھی ہدایت کرنے کی ضرورت ہے نہ تنہا اپنی گلوخلاصی کی، اس پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خطرہ ظاہر کیا کہ فرعون ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یعنی باوجود اس نرمی اور لینت کے بھی اس سے مان جانے کی توقع نہیں۔ بلکہ تمرد اور ذعنائی کا ہی خطرہ ہے گویا ایسے سرکش کے ملئے پھر نرمی کی کیا ضرورت ہے؟ مگر پھر بھی ارشاد ہوا کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں کہ تم پر اس کی کوئی زیادتی اثر انداز نہ ہوگی۔ ہم دیکھتے سنتے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔ تم تو ناصحانہ اور مشفقانہ انداز ہی سے بات کرو۔ مصلحت اور حکمت یہی ہے۔

⑫ **بلند بانگ دعوؤں کی ممانعت**...... اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جنگ آزادی کے سلسلہ کے قائدین متواضع اور بے تکلف ہونے چاہئیں جو اپنے دل کی ہر کھٹک کا بے تکلف اظہار کر سکیں حتیٰ کہ اپنی کمزوری صاف صاف کہہ سکیں اور کوئی رسمی وقار انہیں اظہار حال سے مانع نہ ہو نہ کہ فخرو شیخی خورے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باایں قوت نبوت اپنے خوف کا اور دشمن کی طرف سے متوقع زیادتیوں کا جو خطرہ دل میں گزرا اس کا برملا اور بے تکلف اظہار فرمادیا کہ مجھے فرعون سے زیادتی کا خطرہ ہے اور اس کی قوم سے تکذیب اور ہٹ دھرمی کا۔

اس لئے آج ہمارے لئے بھی جبکہ ایک جابر حکومت کے سامنے مطالبے لے کر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں اِدعاء اور یہ فخریہ لب ولہجہ یا شیخی کے کلمات کا اظہار کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا، ہمارے لئے یہ دعوے بھی زیب نہیں دیں گے کہ نہ ہم حکومت سے ڈرتے ہیں نہ ہم پھانسی سے خوف کھاتے ہیں نہ ہمیں جیل کا ڈر ہے، ہم یہ کر ڈالیں گے اور وہ کچھ کر گزریں گے۔ خدا کرے ہمارے قلوب غیر اللہ سے ایسے ہی نڈر اور بے باک ہوں لیکن ادعاء تو پھر بھی ممنوع ہے جب تک کہ ادعا کی کوئی شرعی ضرورت ہی پیش نہ آجائے۔ ہمیں عموماً ہر حالت میں اور بالخصوص قوی دشمن کے سامنے پڑ کر اللہ کے لئے اعلانِ تواضع اور اعتراف ناتوانی میں ہرگز کوئی ادبی باک نہ کرنا چاہئے اور پروردگار کے سامنے بلا ریب وشک اپنی صحیح حالت کا نقشہ رکھ کر ادھر سے امداد کی استدعاء کرنی چاہئے، کیونکہ تصنع کی بہادری کار آمد ہے نہ تصنع کا مظاہرہ ہمارا راستہ حقیقت واقعہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ آیت بالا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ سے واضح ہے تاکہ ساری ذمہ داری حکومت حق پر رہے اور ہم محض خدا کے ایک کارندے اور کارگزار کی حیثیت سے حکومت متقابل کے سامنے پیش ہوں۔

---

① پارہ: ۱۹ ، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۳۔

(۱۵) مسلم قیادت کا اولین فرض ......ان ابتدائی معاملات کے طے ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ہوا: ﴿فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ﴾ ① ''سو تم دونوں (فرعون) کے پاس جاؤں اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں''۔

اس سے واضح ہوا کہ قائدوں کی جماعت دربار حکومت اور حکمران قوم کے ایوانوں میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنی پوزیشن صاف صاف واضح کر دے کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں؟ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم ہوا کہ جاتے ہی پہلے فرعون کو یہ بتلا دو تم کون ہو؟ یعنی صاف صاف کہہ دو کہ ہم رسول ہیں اور فرستادۂ خدا ہو کر آئے ہیں یعنی ہم خود نہیں آئے بھیجے ہوئے آئے ہیں ہم مذہبی پیغام لے کر آئے ہیں۔ اپنی کوئی رائے یا اپنی جماعت کی کوئی پاس کردہ تجویز پیش کرنے نہیں آئے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان قائدوں کا جو اوصاف مذکورہ سے متصف ہوں اولین فرض یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت اور حکمران قوم سے ملتے وقت صفائی سے اپنی پوزیشن واضح کر دیں کہ ہم مسلمان ہیں یعنی ہم بحیثیت ہندوستانی کے وطنی جذبہ سے نہیں آئے بلکہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی جذبات سے آئے ہیں ہم اول و آخر مسلمان ہیں نہ کہ اول مسلمان اور پھر ہندوستانی۔ ہم مذہبی اشارات پر آئے ہیں نہ کہ آراء و اختراعات پر۔ ہم ذاتی افکار و قیاسات سے کوئی پاس کردہ رزیولیشن لے کر نہیں آئے بلکہ اس مذہب کی دفعات لے کر آئے ہیں جو خدائے حاکم اور ملک الملوک کا بھیجا ہوا ہے اور جس کو آزاد رکھنے کے تم بھی اپنی زبان سے مدعی ہو۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا استفادہ تو یہ ہوگا کہ ہماری پوزیشن وزنی اور موثر ہو جائے گی کیونکہ ترجمانی حق کی پوزیشن کا جو اثر مخاطبوں پر پڑ سکتا ہے وہ خود ہماری اپنی بنائی ہوئی رکی پوزیشن کا خواہ وہ انفرادی یا اجتماعی ہو نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ اسلامی پوزیشن بے ساختہ اور قدرتی ہے اور غیر اسلامی پوزیشن بہر حال بنائی ہوئی ہے اور بہ تکلف اپنے اندر پیدا کی جاتی ہے اور وہ بھی انہی غیروں کی نقالی سے جن کے سامنے ہم احتجاج کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ مخاطب اس سے کسی عظمت و میلان کا اثر نہیں لے سکتے۔ بلکہ تضحیک کا جو ہمارے لئے مفید ہونے کی بجائے مضر اور سخت خطرناک ہے کہ اس میں ہوا خیزی ہے، کا اثر لے لیں گے۔

قیادت علماء کے لئے کیوں ناگزیر ہے...... نیز اسلامی اور خالص دینی پوزیشن لے کر جانے اور اسے صاف لفظوں میں پہلے ہی واضح کر دینے کا دوسرا استفادہ یہ بھی ہوگا کہ قیادت عامہ مخلوط نہ رہے گی بلکہ نکھر جائے گی اور قدرتی طور پر اس نوع کی قیادت اور دعوت لے کر وہی اٹھ سکیں گے جو حقیقۃً اس پوزیشن کے اعلان کی قوت اور اہلیت رکھتے ہوں گے، ہر کس و ناکس کو اس کی جرأت نہ ہوگی کہ وہ پیغام بردار الٰہی بن کر اپنے یا اغیار کے پلیٹ فارم پر پیش ہو اور اس قیادت کی اہلیت صرف انہی افراد میں پائی جا سکے گی جو دینی اور روحانی رنگ میں اس پیغام کے

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۷۔

اثبات وایضاح اور اس کی طرف سے دفاع کی قدرت اور عملی ہمت رکھتے ہوں گے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ایک طالب علم یا علماء کا نام لیوا ہونے کی حیثیت سے کسی جماعتی تعصب سے کام لے رہا ہوں اور خواہ مخواہ علماء کی قیادت اور مطاعیت کا پروپیگنڈہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ الزام اس وقت صحیح ہوسکتا ہے کہ میں امت کو علماء کی ذوات کا پابند ہو جانے کی دعوت دوں۔ حالانکہ میری غرض علماء کی ذوات کی اطاعت پر مجبور کرنا نہیں اور نہ مجھے اس کا حق ہے بلکہ میں علماء حق کی زبان پر جاری شدہ قانون الٰہی کی اطاعت پر مجبور ہو جانے کی دعوت دے رہا ہوں، اس صورت میں قیادت قانونِ الٰہی کی آنکلتی ہے نہ کہ علماء کی۔ مگر چونکہ قانونِ علماء کی ہی زبان سے مسموع ہوتا ہے اور کتاب الٰہی کی صحیح ترجمانی وہی کر سکتے ہیں اس لئے ضمناً ان کی اطاعت وقیادت بھی نکل آتی ہیں مگر بالذات نہیں بلکہ بالغیر۔

ساتھ ہی تعصب کا الزام دینے والے اس پر بھی غور کریں کہ علماء کا کوئی مخصوص خاندان یا قبیلہ نہیں کہ دوسرے قبائل کو ان کی طرف جھکنے پر مجبور کیا جائے۔ علم الٰہی کا دروازہ ہر مسلمان کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر مسلمان ہر وقت عالم دین بن سکتا ہے پس اگر کسی غیر عالم کو کسی عالم کی اطاعت سے عار آئے تو اس کا علاج یہ نہیں کہ قانون الٰہی کو رد کرنے لگے بلکہ یہ ہے کہ خود عالم بن کر قائدوں کی جماعت میں شامل ہو جائے اور قانونِ حق کی اطاعت کر کے دوسروں سے اطاعت کرائے مگر بہر صورت مسلمان رہتے ہوئے قوانین الٰہی کی اطاعت کرنا ناگزیر ہے۔ خواہ عالم ہو یا غیر عالم۔ پس جہاں میں غیر علماء کو پابندی قانون الٰہی کی دعوت دے رہا ہوں وہیں وہ دعوت علماء کے لئے بھی ہے، اس لئے تعصب کا الزام بے معنی ہوگا۔

[۱۴] ترجمانِ رسالت حاملِ معرفت ہونا چاہئے...... یہاں سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ ہارون علیہما السلام بفحوائے: اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ ''ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں''۔

فرعون کے سامنے بحیثیت رسول کے پیش ہوئے نہ کہ بحیثیت اسرائیلی ہونے کے اور رسول مربی مخاطبین اور ناصح اقوام ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اپنی قوم کی گلوخلاصی چاہتا ہے، اسی طرح مخاطب اقوام کی بہبود وفلاح کی فکر بھی ہمدردانہ کرتا ہے۔ چناں چہ موسیٰ علیہ اسلام جس طرح بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے چھڑانے کے لئے فرعون کے پاس گئے اسی طرح خود فرعون اور فرعونیوں کی اصلاح و بہبود بھی ان کے پیش نظر تھی کیونکہ رسول کے معنی ہی مربی خلائق اور ناصح مشفق کے ہیں تو اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوا کہ مسلمانوں کے جو قائد بحیثیت ترجمان رسالت حکومت کے سامنے پہنچیں وہ صرف اپنی قوم کی گلوخلاصی پیش نظر نہ رکھیں بلکہ حکمران اقوام کی اصلاح و بہبود بھی ان کے سامنے رہے اور وہ جس طرح پیغام الٰہی کے واسطے سے وہاں پہنچیں اسی طرح اس پیغام الٰہی سے خود اس قوم کو بھی آشنا اور متاثر بنانے کی فکر کریں وہ صفائی سے مگر بحکمت یہ کہیں کہ ہم جس اسلام کو اور اس کے واسطہ سے مسلم قوم کو آزاد کرانے آئے ہیں، اسی اسلام کا تحفہ خود تمہارے لئے بھی لے کر آئے ہیں۔ مغلوب کا محارب کی صورت سے

سامنے آتا اور اثر رکھتا ہے اور اپنی خیر جوئی کے ساتھ مقابل کی اصلاح کا پرواز اختیار کرنا اور اثر رکھتا ہے۔

آج کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ حکمران قوم تک محکوم قوم کے پیغامات اور مطالبے یا پہنچتے ہی نہیں یا پہنچتے ہیں تو کورے سیاسی رنگ میں پہنچتے ہیں اور وہ سیاسی رنگ بھی خود حکمران قوم کا ہوتا ہے جس سے حکمرانوں پر ان مطالبات کی اصل دینی حیثیت واضح ہی نہیں ہوتی اور کسی درجہ میں ہوتی بھی ہے تو صرف اِدّعاء کے رنگ میں نہ کہ کیفیت اور حال کے درجہ میں یا کم ازکم استدلال کے درجہ میں جو انہیں اس حیثیت میں متاثر کر سکے، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مطالبات پہنچانے والے جو مسلمانوں کی نمائندگی کا فخر اپنے قلوب میں محسوس کرتے ہیں، نہ خود دین سے واقف ہوتے ہیں نہ دین کا کوئی رنگ اور حال وکیفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے مسلم قوم کے اصلی مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق وہ پیغام پہنچانے پر قادر ہی نہیں ہوتے بلکہ جیسے اور مختلف اقوام کی سیاسی پارٹیوں کے مطالبات رسمی طور پر حکومت کے کانوں تک پہنچتے رہتے ہیں اس طرح مسلمانوں کے مطالبات بھی قومی اور سیاسی رنگ میں انگریزیت کے ساتھ انگریز کے سامنے آجاتے ہیں جن میں کوئی حقیقی اسلامی روح نہیں ہوتی جو دوسروں کو متاثر کرے۔

پس جو لوگ حکومت کے کانوں تک قوم کا پیغام لے کر جاتے ہیں وہ دین سے ناآشنا اور انگریز سے اس کی زبان میں بات چیت کرنے کے عادی اور ادھر جو لوگ دین سے واقف اور اس کا رنگ ڈھنگ لئے ہوئے ہیں وہ انگریز کی زبان اور اس کی ذہنیت سے ناواقف پھر اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے بعید اور الگ تھلگ جن میں باہم کوئی سنگم نہیں بلکہ ہے تو بے اعتمادی باہمی ہے اور اسے بھی بڑھاتے رہنے کی کوششیں اپنوں اور اغیار کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں نہ کہ کم کرنے کی۔ ادھر ایسے جامع افراد مفقود ہیں جو دونوں رُخوں کی پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اس لئے نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا صحیح پیغام اپنے اصلی رنگ میں مدعیانِ حکومت کے سامنے نہیں پہنچتا۔

طرزِ نبوت اپنانے کی ضرورت...... ہاں ان سب کا نعم البدل یہ ہے کہ علماء میں سے صرف وہ افراد جو عالم باللہ اور عالم بامر اللہ یعنی عارف ہوں روحانیت سے بھرپور ہوں، باخدا ہوں۔ اس پیغام کو لے کر اٹھیں اور اپنے مخلصانہ اور بے غرضانہ رنگ میں بطرزِ انبیاء اس پیغام کو اپنوں اور مسلط اقوام کے دلوں میں اتارنے کا عزم باندھ لیں اور عامۂ علماء ان کے نقشِ قدم پر چلیں تو پھر وہ جس زبان میں بھی کہیں گے تاثیر نمایاں ہوگی۔ دل معترف ہوں گے۔ خواہ زبانیں اعتراف کریں یا نہ کریں۔

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است | عشق راخود صد زبان دیگر است
بوئے او دلبر چو پراں می شود | ایں زبان ہا جملہ حیران می شود

پس اگر صحابہؓ کی طرح عرفاء اس میدان میں آجائیں اور استدلال کے بجائے حال سے کام لیں رسمیات کی بجائے حقائق استعمال میں آنے لگیں اور رسمی لوگ ان کی پیروی کریں۔ تو زبانوں اور ذہنیتوں کی بحثیں ہی درمیان

سے اٹھ جائیں گی، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس صورت میں تحریکات کا قالب اور ڈھانچہ کچھ بدل جائے گا اور روح بھی اس میں اسی کی مناسب پیدا ہو جائے گی اور پھر انداز حضرات صحابہؓ کی مساعی کا ہو جائے گا جس میں جذب و کشش باہمی بھی پیدا ہوگی اور دشمنوں پر ہیبت بھی پڑے گی۔

بہر حال جب تک اسلامی تحریک میں تبلیغی رنگ اور ناصحانہ ورحیمانہ انداز نہ ہو اور دین کو آگے بڑھا کر سیاسہ انداز مغلوب نہ کیا جائے، اسلامی رنگ کا نتیجہ نہیں نکل سکتا مگر صد حسرت کہ یا اب ایسے افراد عنقاء ہیں یا سامنے نہیں ہیں یا ان کی پرسش نہیں ہے۔

قوت کے گھمنڈ میں جائز مطالبات تسلیم نہ کرنے والوں کا انجام......۱۶۔ پھر اس پیغام اور مطالبہ کا ابلاغ کیا ایک آدھ دفعہ کافی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس تبلیغ میں برسہا برس گزارے اور مختلف اندازوں سے مدعا سمجھایا اور واضح کیا۔ اسے ثابت کر کے خدا کی طرف سے اتمام حجت کیا اس مستمر اور مسلسل مطالبہ وتبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ حق مختلف جہتوں سے واضح ہو گیا۔ منکر فرعون اور فرعونیوں پر خدا کی حجت تمام ہوگئی اور بالاخر پھر بھی اس کے انکار وجحو د پر خدا کی طرف سے تنبیہات اور عذابوں کا سلسلہ شروع ہوا، قحط سالیاں اور مال و دولت وغیرہ کی تباہیوں نے فرعون پر یہ واضح بھی کر دیا کہ یہ ساری بلائیں ان شرعی اور خدائی مطالبات نہ ماننے ہی سے نازل ہو رہی ہیں۔

چناں چہ موسیٰ علیہ السلام سے وقتاً فوقتاً اعتراف قصور کر کے فرعون دعا اور معافی کا طالب بھی ہوا مگر ساتھ ہی جوچل کی پالیسی پر جما رہا اور سارے ہی مطالبے ٹھکرا دیے جس سے موسیٰ اور موسویوں کے صبر و استقلال میں کوئی فرق نہ پڑا اور ان کی مظلومیت سورج سے زیادہ نمایاں ہوگئی۔ آخر کار قبطیوں اور سبطیوں دونوں کے اعمال کے مطابق نتائج دونوں کے سامنے آگئے ضعیف قوم غلامی سے رہا ہو کر برسر اقتدار آئی اور قوی قوم غلامی نفس میں گرفتار ہو کر دنیا و آخرت کے مصائب کا شکار ہوئی۔ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کے واقعات کا جو جامع نقشہ کھینچا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے اور ترجمہ غور سے دیکھئے جو درحقیقت حاصل مطلب اور مختصری تفسیر ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ① ”اور ہم نے فرعون والوں کو مبتلا کیا قحط سالی میں اور پھلوں کی کم پیداواری میں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔ سو جب ان پر خوشحالی آجاتی تو کہتے یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے، یاد رکھو ان کی نحوست اللہ کے علم میں ہے لیکن ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ ہم پر جادو چلاؤ، جب بھی ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں“۔

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۰، ۱۳۱۔

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ.﴾ ① ”تو پھر ہم نے (کثرت بارش کا) طوفان بھیجا (اس سے گھبرا کے موسیٰ سے فرعونیوں نے عہد و پیمان کیا مگر طوفان کھلنے پر پھر اسی انکار پر اڑے رہے تو ہم نے ان پر) ٹڈیاں مسلط کیں (جو کھیتوں کو چاٹ گئیں پھر عہد و پیمان کئے مگر یہ بلا دور ہونے پر پھر بدستور اسی سرکشی پر جمے رہے تو ہم نے لائے ہوئے غلہ میں) گھن کا کیڑا پیدا کر دیا (پھر موسیٰ سے دعا کرائی اور یہ بلا دور ہو کر جب مطمئن ہوئے کہ اب غلہ پیس کر کھائیں گے تو ہم نے ان پر) مینڈک مسلط کئے (جو ہجوم کر کے کھانے اور برتنوں میں گرنا شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہونے لگا اور گھروں میں رہنا بھی مشکل ہو گیا، پھر پینا یوں مشکل ہو گیا کہ) ان کا پانی خون ہو جاتا یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے سو وہ تکبر کرتے رہتے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ“۔

﴿وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ.﴾ ② ”اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ! ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے اگر آپ اس عذاب کو ہم سے اٹھا دیں تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) آپ کے ساتھ کر دیں گے۔ ﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ.﴾ ③ ”پھر جب ان سے اس عذاب کو ایک وقتِ خاص تک (کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا) اٹھا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے۔

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا، وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا، وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ.﴾ ④ ”پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کر دیا اس سبب سے کہ وہ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اس زمین کے پورب پچھم کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر (یعنی مصائب سے نہ گھبرانے اور احکامِ نبوت پر جمے رہنے) کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا“۔

فرعون اور بنی اسرائیل کے معاملات کا یہ قرآنی نقشہ سامنے رکھئے اور پھر برطانیہ اور ہندوستان کے کمزور

---

① پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۳۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۴۔

③ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۵۔ ④ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۷۔

غلاموں کے باہمی معاملات پر غور کیجئے۔ جس درجہ میں انہوں نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالنے میں مطالبات اور احتجاج سے کام لیا گو کہ وہ عشر عشیر بھی ابھی تک زیر عمل نہیں آیا اور نہ کچھ پورے صحیح اُسلوب پر پیش کیا گیا تاہم جس حد تک بھی کیا اور اس میں قید وبند کے مصائب کو جھیل کر صبر واستقلال سے کام لیا گیا۔ اسی حد تک ظالم قوم پر حجت قائم ہو کر خدا کی طرف سے تنبیہات اور ظالم قوم کی طرف سے تھوڑا بہت مڑ مڑ کر دیکھنے اور کبھی کبھی جھک جانے کا ظہور ہوتا رہا، گو ساتھ میں انکار وجحود بھی بدستور قائم رہا۔

گذشتہ جنگ عظیم اور موجودہ جنگ اعظم تنبیہات کا ایک سلسلہ اپنے اندر رکھتی ہیں۔ موجودہ جنگ کے ذریعہ فرعونی دور کی طرح حکمران قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں اور صنعت گاہوں کو وقتاً وفوقتاً تباہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی اونچی اونچی سر بفلک عمارتیں زمین بوس بھی کی گئی ہیں۔

ان کے لاکھوں بڑوں اور چھوٹوں کو دریا برد بھی کیا گیا، اس سلسلہ میں جب کبھی شکست کا رخ سامنے آتا ہے تو یہ قوم فوراً مڑ کر غلام ہندوستان کی طرف دیکھنے بھی لگتی ہے اور دفع الوقتی کے طور پر کچھ پارلیمنٹری پارٹیاں آزادی ہند کا مسئلہ بھی چھیڑ دیتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی ہمدردی بھی حاصل کی جانے لگتی ہے۔ کبھی کرپس صاحب نمائشی آزادی کا کھلونا لے کر ہندوستان کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ کبھی سیاسی اسیروں کی رہائی کا مسئلہ بھی زیر غور آجاتا ہے۔ کبھی ہندوستان کو طفل تسلی دینے کے لئے انہیں اختتام جنگ پر کسی حد تک نام کی آزادی کے وعدے دے دیئے جاتے ہیں، لیکن جوں ہی شکست کا پہلو کمزور ہو کر فتح مندی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو پھر وہ سارے عہد و پیان سارے رجوع ایسے کافور ہو جاتے ہیں کہ گویا کسی زبان وقلم پر کبھی آئے ہی نہ تھے، وہی ایک چرچلی رٹ اور ہٹ سامنے رہ جاتی ہے، یعنی جب عذاب سامنے آتا ہے تو فرعونیوں کی طرح مظلوموں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ: وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ ''ہم عنقریب آزادی دینے والے ہیں''۔

اور جب وہ ایک تھوڑی سی مدت کے لئے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور یہ قوم اطمینان کا سانس لیتی ہے تو ﴿إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ﴾ ① پھر وہی عہد شکنی اور الغاءِ مواعید۔ لیکن اس لَيْتَ ولَعَلَّ اور ان حقیقت پوشیوں سے خدا کا آخری انتقام ٹلنے والا نہیں ہے۔ ضرور بالضرور یہ ہوکر رہے گا کہ جو لوگ کمزور شمار کئے جارہے ہیں انہی کو اس زمین کے پورب اور پچھم کا مالک بنایا جائے گا مکمل آزادی ظاہر ہوکر رہے گی اور جو قوت پر گھمنڈ کر کے کسی مطالبہ پر غور نہیں کرتے ان کے ساختہ پرداختہ کارخانے کلیۃً درہم برہم ہوں گے۔ ان کی اونچی اونچی بلڈنگیں سرنگوں ہو کر رہیں گی اور خدا کا نیک وعدہ کمزور اقوام کے حق میں پورا ہو کر رہے گا۔ ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ﴾ بشرطیکہ ان اقوام نے اُسوۂ موسوی اور اُسوۂ محمدی علیہما الصلوٰۃ والسلام سے روگردانی نہ کی۔

جُہدِ مسلسل سے ہی نتائج یقینی بنتے ہیں...... اور وہ بھی کہ خدا کے بھروسہ پر اور اس کے بتائے ہوئے رنگ

① پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۳۵.

ڈھنگ پر تبلیغ اور اظہار مطالبات میں ایک آدھ دفعہ پر قناعت نہ کی جائے بلکہ موسوی انداز پر تسلسل کے ساتھ یہ مسائی زور اور ہمت باطنی کے ساتھ جاری رکھی جائیں۔ غرض تبلیغ پیغام میں اگر تسلسل اور دوام پیدا ہو جائے اور مطالبات کا زور بندھا رہے ادھر اپنی قوم کی تعمیر بھی ممکنہ حد تک ہوتی رہے تو قدرتی طور پر اتمامِ حجت اور فیصلہ کن نتائج کی ایسی صورتیں سامنے آجائیں گی جن کا فی الحال بظاہر اسباب تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ ① میں یہ نہیں کہتا کہ علماء حقانی کے بتائے ہوئے قرآنی پروگرام پر چلنے سے پہلے ہی دن میں کامیابی سامنے جائے گی یا ساری مشکلات اگلے ہی دن ختم ہو جائیں گی یا مشق و تعب سے دو چار نہ ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس پر صبر و استقلال کے ساتھ جم جانے سے غیبی امداد ساتھ ہوگی اور نتائج یقینی اور قطعی ہوں گے۔ اُسوۂ موسوی میں اس حقیقت کو بھی دیکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ② ”موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ: خدا کا سہارا رکھو اور مستقل رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہیں مالک بنادیں اپنے بندوں میں سے اور اخیر کامیابی انہی کو ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں“۔

اس پر قوم موسیٰ علیہ السلام نے ذرا گھبرا کر بے صبری سے کہا جیسے آج بھی کمزور دل کے انسان لگتے ہیں: ﴿قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا﴾ ③ ”قوم کے لوگ کہنے لگے کہ: ہم تو ہمیشہ مصیبت میں ہی رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (یعنی آپ کی پیروی سے آخر نتیجہ کیا نکلا؟ غلامی بھی بدستور باقی ہے اور فرعونی چیرہ دستیاں بھی“)۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ ④ ”موسیٰ نے فرمایا: بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کریں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنادیں گے۔ پھر تمہارا طرزِ عمل دیکھیں گے یعنی ایسے کاموں میں جلد بازی نہیں چاہیے کام کئے جاؤ اور غیبی لطائف کے منتظر رہو“۔

پس آج بھی بنی اسرائیل کی طرح پیروی نبوت کے سلسلہ میں ابلاغ عام اور مسلسل مطالبات اور ضروری جدوجہد کی طویل مدت سے نہ گھبرانا مناسب ہے نہ تبلیغ کے تسلسل میں سستی دکھانا مفید وعدہ الٰہی پر بھروسہ اور اس کے جوارح کی حیثیت سے جنگ آزادی میں حصہ لینا اور لپٹے رہنا اور دلی انداز میں آگے بڑھنا اپنی قوم کی مخلصی کے ساتھ مقابل قوم کو خدا کا سچا پیغام موثر پیرایوں میں پہنچاتے رہنا ہی اصل مشن ہے، جس پر وعدہ الٰہی کے

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲، ۳۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۸۔
③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۹۔ ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۹۔

مطابق کامیابی یقینی ہے۔

دینی پیشواؤں کی قیادت میں آکر اگلے ہی دن کہنے لگا کہ: ﴿ أُوذِينَا مِن قَبْلِ أَن تَأْتِيَنَا وَمِن بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ﴾ ⓷ ’’آپ کی رہنمائی سے قبل بھی یہی مصائب تھے۔اور آپ کی رہنمائی کے بعد بھی ان میں کچھ فرق نہ پڑا‘‘۔منشاءِ نبوت کے بھی خلاف ہے اور فطری اُسوۂ حسنہ (صبر و استقلال) کے بھی خلاف ہے پس خدا پر بھروسہ کر کے اور رسیات سے گزر کر حقائق کا دامن سنبھالتے ہوئے احتجاجی تبلیغی اُسوۂ اور تسلسل تبلیغ کی ضرورت ہے تاکہ اُمتِ اسلامیہ کا پیغام ہر کان میں گونج اٹھے اور گونجتا رہے۔

مطالبۂ آزادی کے ساتھ تبلیغ کی ضرورت......آج ہم تبلیغی سلسلوں میں اگر سوچتے بھی ہیں تو صرف اسی حد تک کہ اپنی قوم کو تبلیغ مسائل کر کے اس کی اصلاح کی فکر کریں اور بلاشبہ یہ بھی اہم فرائض میں سے ہے یا کوئی اونچا قدم اٹھاتے ہیں تو یہ کہ یورپ وامریکہ میں ہمارے مبلغ پہنچ جائیں اور کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بھی مضائقہ نہیں لیکن کیا ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ سارے یورپ وامریکہ کا خلاصہ جو ہندوستان اور اس کی اقوام کو جونک بن کر چوس رہا ہے اور دیمک کی طرح چاٹ گیا ہے۔ ہماری بدبختی سے ہندوستان ہی کے تخت پر جمع ہے کیا وہ اس کا مستحق نہیں کہ اس کے کان حقیقی انسانیت کے پیغام سے آشنا کیے جائیں تاکہ وہ خود بھی اس انسان نما حیوانیت کی دلدل سے باہر آئے اور اسی کے واسطے سے پھر پورا یورپ وامریکہ بھی متاثر ہو؟ کیا آج ہمیں ضرورت نہیں کہ جس اسلام کو ہم دنیا کا جامع ترین قانون سمجھتے ہیں،اور جسے ہم محض دیانتی ہی نہیں بلکہ سیاسی دین بھی جانتے ہیں ہم اسی شدومد سے اس کو آج کی سیاست کے بنانے ہوئے اڈوں تک بھی پہنچائیں اور ڈپلومیٹک دماغوں میں بھی اسے اتارنے کی کوشش کریں جنہوں نے دنیا کو فطری سیاست سے ہٹا کر عیاری اور فریب بازیوں کی مصنوعی اور مہلک سیاست کے کیچڑ میں پھانس دیا ہے؟

ضرورت ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں جہاں اپنی قوم کو سیاسی ابھار ادیں اور سیاسی جمود وتعطل کو دور کرنے کی فکر کریں وہیں ایک مستقل مشن اور مقصد کی حیثیت سے ان کا دائرۂ عمل یہ بھی ہو کہ قوم کے قابل افراد کرسی حکومت پر بیٹھنے والوں کے کانوں کو نہ صرف مطالبہ آزادی ہی سے بلکہ اس خدائی قانون سے بھی آشنا کرتے رہیں۔یعنی تبلیغ دین بھی کریں۔اور نہ صرف دس بیس دن بلکہ مطالبہ آزادی اور احتجاج کے تسلسل کے ساتھ یہ پیغام رسانی بھی اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ ان مطالبوں کے نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہو جائیں۔

مثلاً اگر دس پانچ برس مسلسل طریق پر اسلام کے قانونی اور سیاسی پہلو اس کے ساتھ دینی وروحانی پیغام اخلاقی رنگ میں ان کے ذہنوں میں ڈالے جاتے رہیں اور اس تسلسل تبلیغ کے طبعی اثر سے دیانتدارانہ طور پر یہ سمجھ جائیں کہ امن عالم کا راز اسی قانون الٰہی کے اجراء میں مخفی ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خود حکمران قوم کے بہت سے

⓷ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف،الآیۃ: ۱۲۹.

فہیم افراد دل سے ہمارے ہمنوا بن جائیں؟

اور پھر وہ کام جو حکومت سے باہر رہ کر ہم انجام دے رہے تھے خود حکومت کے دفتروں سے انجام پانے لگے اور جو امور قومی پلیٹ فارم سے ہم بمشکل حکومت کے دل میں اتار سکتے تھے وہ حکومت ہی کے اپنے امور بن جائیں۔ ہاں اگر اپنی ان تھک مساعی کے باوجود پھر بھی ایسا نہ ہو یعنی فرعونی حکومت کی طرح موجودہ حکومت کا انحراف واستکبار ہی بڑھتا رہے تو پھر یہ ہو کہ اس تسلسل پیغام رسانی سے من اللہ اتمام حجت ہو کر ایسی غیبی صورتیں نمودار ہوں کہ یہ قوم یا جھک جائے یا اس کا کروفر یک لخت خاک میں مل جائے اور وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جائے اور اس وعدہ الٰہی کا ظہور ہو جائے کہ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ① ''سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکب جرائم ہوئے تھے اور ایمان والوں کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا''۔

لیکن یہ منصوبہ صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ترجمانِ ملت خود دینی اور اخلاقی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے کردار اور رفتار و گفتار نیز وضع و قطع وغیرہ سے بندگی کے آثار نمایاں ہوں۔ چہروں پر قلبی صداقت چمک رہی ہو اور زبان پر کلماتِ حق وحکمت جاری ہوں۔ وہ اپنے ظاہر سے فرشی ہوں اور باطن سے عرشی ہوں اور پھر ان کا دیا ہوا پیام سیاسی اتار چڑھاؤ ڈپلومیسی اور قول کے خلاف قلب کے مخفی اغراض لئے ہوئے ہونے کے بجائے واضح صداقت وحقانیت اور دیانت وللہیت کا نشان لئے ہوئے ہو جس میں واقعی طور پر اپنی اور ساری اقوامِ عالم کی سچی خیر خواہی ملحوظِ خاطر ہو جیسا کہ اسوۂ موسوی سے ابھی واضح ہو چکا ہے کہ فرعون اور فرعونیوں کے پاس حصولِ آزادی کے لئے بھی جا رہے ہیں اور ساتھ ہی کمال روحانیت وتقدس کے ساتھ پیغامِ الٰہی خود فرعون کو بھی پہنچا رہے ہیں اور اسے ربوبیتِ الٰہی سے آشنا بنا رہے ہیں اس کے دلائل ذکر فرما رہے ہیں کہ: ﴿رَبُّنَا الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ ② رسالت کی حقیقت سمجھا رہے ہیں، پھر فرعون سے شفقت فرما رہے ہیں اور دلی خیر خواہی سے فرماتے رہے ہیں جس میں کسی رسمیت اور ضابطہ پرستی کا ادنیٰ شائبہ نہیں۔

فرعونانِ وقت کو قیادتِ موسوی ہی شکست دے سکتی ہے..... پھر عنوانِ بیان میں کوئی ادنیٰ جابرانہ یا تحکمانہ انداز نہیں کہ: ﴿هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى﴾ ③ ''کیا تجھے اس کی خواہش ہے کہ تو درست ہو جائے اور میں تجھ کو تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تو تو ڈرنے لگے؟'' ظاہر ہے کہ اس صاف وصریح اور مقدس طریقِ خطاب کا جو اسوۂ موسوی اسوۂ محمدی اور اسوۂ جمیع انبیاء و نایانِ نبوت ہے جو قدرتی اثر عام صلاحیت مند قلوب پر پڑ سکتا ہے وہ ہمارے سیاسی اتار چڑھاؤ کا کبھی نہیں پڑ سکتا ہے کہ ان رسمی طریقوں میں دشمن ہم سے زیادہ ماہر اور زیادہ سے زیادہ چالاک واقع ہوا ہے چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

---

① پارہ: ۲۱ سورۃ الروم، الآیۃ: ۴۷۔ ② پارہ: ۱۶ سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۰۔

③ پارہ: ۳۰ سورۃ النازعات، الآیۃ: ۱۸، ۱۹۔

ہے ﴿اِنَّكُمْ لَنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَخْلَاقِكُمْ﴾ ۔ ''تم اقوام دنیا پر اپنے مالوں (یعنی مادی وسائل) سے غالب نہیں آسکتے البتہ اپنے خلق (یعنی معنویت) سے غالب آسکتے ہو۔ پس ایک شخص کی رائے یا ایک جماعت کی پاس کردہ تجویز پھر انفرادی واجتماعی ذیلچسی زیر بحث لائی جاسکتی ہے، لیکن خدائی پیغام میں جو صاف وصریح ہو آسانی اور معقولیت سے کوئی بحث نہیں کی جاسکتی، آراء وقیاسات کے اختراعات کردہ پروگراموں کے سلسلہ میں ایسے سرکاری افراد کھڑے کئے جاسکتے ہیں جو ان تجاویز میں بحثیں اٹھانے، انہیں رلانے کے لیے اپنی دماغی قابلیتیں جو انہی دن کے لئے ان میں پیدا کی جاتی ہیں صرف کریں یا ان کے خلاف مطالبات لے آئیں تاکہ حکومت کو گریز کے لئے سہارا مل جائے لیکن مذہب کے صاف وصریح پیغام کا جب کہ وہ ہمہ گیر اصلاحی رنگ اور روحانیت لئے ہوئے ہو، ان رسمی افراد سے معارضہ کرایا جانا آسانی سے ممکن نہیں۔

پس اس صورت میں یہ ضرور ممکن ہے کہ استبدادی شان سے سرے سے پیغام ہی رد کردیا جائے اور فرعون کی طرح موسیٰ صفت افراد کو یہ کہہ کر سامنے سے ہٹادیا جائے کہ: ﴿وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ ① ''میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یا فرعون کی طرح یہ کہہ کر آزادی خواہوں کو دھمکادیا جائے کہ: ﴿لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ﴾ ② ''ہم تمہیں جیل بھیج دیں گے۔ یا یوں کہہ دیا جائے کہ ﴿وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ﴾ ''تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر پھانسی لگوادیں گے''۔ یا یہ دھمکی دی جائے کہ ﴿سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ﴾ ③ ''ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کردیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے کیونکہ ہم کو ہر طرح کا غلبہ حاصل ہے''۔

یہ سب کہا جاسکتا ہے اور کہا گیا اور کیا گیا لیکن حقیقی حجت کو حجت سے رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس صورت سے پیغام کی جڑیں اور مضبوط ہوتی ہیں اور مخاطب قوم کی جڑیں غیر محسوس طریق پر کھوکھلی ہوتی رہتی ہیں۔

چنانچہ فرعون نے اگر مذکورہ دھمکیاں دیں تو اس سے خدائی پیغام یا پیغام لے جانے والے کا سر کب نیچا ہوا؟ بلکہ یہ ساری شکست ومغلوبیت آخرکار اس فرعون کے حصہ میں آئی جو قہر وغلبہ کا دعوے دار تھا۔

پس اگر آج بھی امت اسلامیہ کا پیغام اس کے قائد موسیٰ صفت بن کر فرعونانِ وقت کے پاس لے جائیں اور لے جاتے رہیں تو یہ ممکن ہے کہ انہیں جیل، پھانسی، قتل وغیرہ کی دھمکیاں دی جائیں لیکن اس سے خدائی پیغام اور پیغام بروں کا سر نہیں نیچا ہوسکتا اور نہ پیغام میں کوئی معقول حجت نکالی جاسکتی ہے بلکہ یہ امت کی جیت اور انکے دشمنوں کی کھلی ہار ہوگی جس سے غیبی نتائج کا برملا ظہور ہوگا اور یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ﴾ ④ ''پس حق ظاہر ہوگیا اور انہوں نے جو کچھ بنایا تھا

---

① پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۸۔ ② پارہ: ۱۹ سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۹۔
③ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۷۔ ④ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۱۸، ۱۱۹۔

سب اکارت گیا پس وہ لوگ ہار گئے اور خوب ذلیل ہوئے“۔

خلاصہ یہ کہ عدم تشدد کی جنگ کے سلسلہ میں سب سے بڑا ہتھیار مطالبہ آزادی کے ساتھ مخاطب قوم کو پیغام حق مسلسل طریق پر پہنچاتے رہنا اور مقابل کی بھبکیوں سے اور ہم چشموں کے استہزاء و تمسخر سے بے نیاز ہو کر نبوی رنگ میں ہدایت دیتے رہنا ہے جس کے نتائج قطعی موعود حق ہیں اور ساتھ ہی نصرت غیبی یقینی ہے۔

اسلام میں آزادی کی غرض وغایت...... بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو رسول الٰہی جتلا کر تعارف کرانے اور اپنی پوزیشن واضح کر دینے کے بعد فرعون کو اولین پیغام یہ پہنچایا کہ ﴿فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ﴾ ① ”(اے فرعون) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ کر دے یا انہیں آزاد کر دے اور انہیں مت ستا“۔

[13]...... اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام میں محکوم قوم کو حکمران قوم کے سامنے مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کرنا اور غلامی کے بدترین عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا فرض ہے۔ چناں چہ بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کے لئے ہی اللہ نے ایک اولوالعزم پیغمبر کو مبعوث فرمایا۔ جنہوں نے فرعون کے بھرے دربار میں کھل کر یہ مطالبہ صریح الفاظ میں پیش کیا جیسا اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔

[14]...... اس موقع پر ایک نکتہ اور سمجھ لینا چاہئے اور وہ یہ کہ اس قومی استخلاص یعنی بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کی غرض کوئی وطنی یا قومیت کی آزادی نہ تھی بلکہ مذہب کی آزادی تھی قوم کو بھی آزاد کرانا تھا تو مذہب ہی کی آزادی کے لئے بالفاظ دیگر اس آزادی سے کوئی دنیوی ترفہ یا لذائذ دنیا کی تحصیل وتکمیل یا کسی قسم کا رسمی جاہ ومنصب مقصود نہ تھا کیونکہ اول تو حصول آزادی کے لئے پیغمبر کا انتخاب کیا گیا اور ظاہر ہے کہ پیغمبر سرتاپا دین ہوتا ہے اس کے افعال بھی دین اور ان کی غرض وغایت بھی دین۔ اس لئے پیغمبر کا آزادی مانگنا دنیوی اغراض کی خاطر قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اس کو عنوان آیت سے یوں سمجھئے کہ ﴿إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ﴾ ② اس آیت میں ارسال بنی اسرائیل کو دعوائے رسالت پر بذریعہ فا کے متفرع فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ میں پیغمبر ہوں اس لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتا ہوں اس سے واضح ہوا کہ مطالبہ آزادی کا منشاء پیغمبری ہے اور ظاہر ہے کہ دنیوی آزادی یعنی آزاد ہو کر متاع دنیا سے آزادانہ انتفاع حظوظ دنیا کی ہوسناکیاں عیش اور ترفہ وغیرہ کی آزادی پیغمبری کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اس لئے پیغمبر ایسی آزادی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔

اس سے یہ مسئلہ صاف نکل آتا ہے کہ اسلام میں حصول آزادی کی غرض وغایت نہ روٹی ہے نہ مال ومنال۔ اگر آج ہم اپنے اسٹیجوں سے روٹی اور معاشی رفاہیت کی خسیس اغراض لے کر اٹھیں اور انہی فانی اور چند روزہ بہاروں کی کمزور بنیادوں پر اپنی مساعی کی عمارتیں کھڑی کرنے لگیں تو وہ دن دور نہیں ہے کہ ہمیں اس بے جا تعبیر سے نادم ہونا پڑے گا اور ہم عیاذاً باللہ ان کے مصداق ٹھہریں گے کہ ﴿ٱلَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي ٱلْحَيَوٰةِ

① پارہ: ۹، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۷. ② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۷. ③ پارہ: ۱۶، سورۃ الکہف، الآیۃ: ۱۰۴.

الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴾ ۞ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے استخلاص قوم کی مساعی کا آغاز تبلیغ دین سے شروع کیا۔ ربوبیت ورسالت کو بیچ میں لا کر آزادی کا مطالبہ کیا گویا غم وغصہ اس کا نہ تھا کہ ہماری دنیا آزاد نہیں بلکہ اس کا تھا کہ دین آزاد نہیں، ربوبیت ورسالت کے شعائر بلند نہیں ہیں۔ ربوبیت و رسالت کے منکر دنیا پر غالب آ گئے۔ انہوں نے لادینیت کا فساد دنیا میں برپا کر دیا کہ جس سے دنیا مادیت کی خسیس اغراض میں پڑ کر سرکشی اور بغاوت حق میں مبتلا ہو گئی۔ ادھر ان دونوں دینی بنیادوں کے ماننے والے مغلوب ہو گئے، جس سے دیانت وامانت بے کس ہو گئی اور وہ دیانت کے احکام کو دنیا میں پھیلانے سے عاجز رہ گئے اور دین کے اجراء میں دست و پابستہ ہو گئے ہیں۔ پس یہ شکایت نہ تھی کہ ہماری دنیوی راحت وآرام یا روٹی اور رہائش میں فرق پڑ گیا ہے۔

ہمیں کوٹھی اور بنگلے میسر نہیں رہے۔ ہمارے گھروں پر موٹر کاریں کھڑی ہوئی دکھلائی نہیں دیتیں یا ہم اقلیت میں ہیں اور اکثریت ہمیں فنا کر دے گی۔ یا ہماری توہین ہو رہی ہے اور عزت وجاہ دوسروں کے حصہ میں آ گئی ہے بلکہ شکایت فی الحقیقت صرف دیانت کے مغلوب ہو جانے اور آزاد نہ رہنے کی تھی اور جس حد تک اکثریت کی طلب یا عزت و جاہ کی طلب یا غلبہ واقتدار کی طلب تھی وہ بھی صرف غلبہ دین کی خاطر تھی ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو تو مشاغل دنیا کے انہماک کی وجہ سے عذاب خداوندی سے ڈراتے اور پھر خود ہی اپنے مطالبہ آزادی کی غرض وغایت وہی شغل دنیا قرار دیتے عیاذاً باللہ۔

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ آزادی کا حاصل یہ ہوا کہ اوفرعون! چونکہ تو خدا پرست نہیں اس لئے تیری ماتحتی میں بنی اسرائیل بھی خدا پرست نہیں رہ سکتے نہ ان کا شرعی علم باقی رہ سکتا ہے نہ ان کی روایات مذہب قائم رہ سکتی ہیں نہ ان کے عملی شعائر بلند ہو سکتے ہیں نہ ان کے مادی وسائل باقی رہ سکتے ہیں جو تقویت دین میں استعمال ہوں۔ اس لئے بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں خدا پرستی کی راہ پر پختہ کر سکوں اور تو بھی اپنے رب اور اس کے فرستادہ رسول کو پہچان اور مان۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ مسلمانوں کے مطالبہ آزادی میں شکایت دنیا یا مصائب دنیا یا اقلیت واکثریت کی بحثیں یا روٹی اور بوٹی کے مقاصد کا دخل نہ آنا چاہئے اگر یہ باتیں آئیں بھی تو غلبہ دین کے وسائل کی حیثیت سے نہ کہ مقاصد کے درجہ میں۔

مطالبۂ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر ہونا چاہئے...... پس مسلمانان ہندوستان کو صاف وصریح الفاظ میں مطالبہ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر کرنا چاہئے ان کے نزدیک مصائب دین اہم ہونے چاہئیں نہ کہ مصائب دنیا کہ وہ دینی مصائب زائل ہونے پر خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اغیار کے تسلط واقتدار کو اگر ہولناک باور کرایا ہے تو وہ دینی مصائب کی وجہ سے نہ کہ دنیوی مصائب کی بناء پر۔ چنانچہ ذیل کی دعاء نبوی میں گو قلت واکثریت، اکرام وتوہین اور غلبہ ومغلوبیت کا ذکر ہے مگر مقصود اولین مصائب دین کے

ازالہ کو قرار دیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ ان سارے دنیوی مصائب کو بھی اگر تکلیف دہ سمجھا ہے تو دین کی خاطر نہ کہ دنیا کی خاطر۔ ارشادِ نبوی ہے ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا.﴾ ① ''اے پروردگار! ہمارے دین میں مصیبت نہ ڈال اور دنیا کو ہمارا اہم مقصود نہ بنا اور نہ اسے ہمارا مبلغِ علم بنا (کہ اس کے مادی اکتشافات واختراعات اور دنیوی زندگی کے جوڑ توڑ ہی کو سب سے بڑا علم سمجھنے لگیں) اور نہ ہماری رغبتوں کی آخری حد دنیا کو کر اور ہم پر کسی ایسے کو مسلط نہ فرما جو ہم پر رحم نہ کھائے''۔ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَأَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَآثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا. ② ''اے اللہ ہماری تعداد زیادہ کر کم نہ کر ہمیں آرام نصیب فرما تو ہین سے بچا ہمیں غالب کر مغلوب نہ کر''۔

ذیل کی حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ روٹی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور فقر وفاقہ کوئی بنیادی مصیبت نہیں اصلی مصیبت یہ ہے کہ دنیا کے دروازے کھل کر دین ضائع ہو جائے ارشادِ نبوی ہے: وَاللّٰهِ مَا أَخْشٰى عَلَيْكُمُ الْفَقْرَ وَلٰكِنْ مِمَّا أَخْشٰى عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِيْ زَهْرَةُ الدُّنْيَا تُفْتَحُ عَلَيْكُمْ فَتُهْلِكُكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ ③ ''خدا کی قسم مجھے تمہارے فقر وفاقہ کا کوئی ڈر نہیں لیکن جو چیز مجھے اپنے بعد خائف بنا رہی ہے وہ ہے دنیا کی سرسبزیاں جو تم پر کھلیں گی اور تمہیں اس طرح ہلاک کریں گی جس طرح پچھلی اقوام کو انہوں نے ہلاک کیا (اور جیسے آج کی قوموں کو برباد کر رہی ہے'')۔

اس حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ظاہر فرمایا جبکہ ایلاء کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماہ تک خانہ نشین رہے ہیں اور حضرت عمرؓ نے حاضر ہو کر دیکھا کہ بیت نبوت میں کل سامان ایک چمڑے کا مشکیزہ ہے جس میں کچھ شہد ہے اور ایک چٹائی ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں اور اس کی تیلیاں بدن مبارک پر ابھر آئی ہیں تو آزردہ ہو کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یہ قیصر وکسریٰ دشمنانِ حق تو نرم نرم گدیلوں پر آرام کریں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چارپائی بھی میسر نہ ہو۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر کشائش فرمائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو خطاب فرماتے ہوئے تنبیہ کے طور پر فرمایا أَفِيْ شَكٍّ أَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ (أَوْ كَمَا قَالَ) ④ ''اے خطاب کے بیٹے! کیا تو ابھی تک شک میں پڑا ہوا ہے (یہ قیصر وکسریٰ) تو وہ لوگ ہیں جن کی نعمتیں دنیا ہی میں دے کر ختم کر دی گئی ہیں اور آخرت میں ان

① السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة المؤمنون ج: ۱۰ ص: ۴۵۲.

② السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة المؤمنون، ج: ۱۰، ص: ۴۵۲.

③ السنن لابن ماجه، کتاب الفتن، باب فتنة المال، ج: ۱۱، ص: ۴۹۹. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج: ۸ ص: ۴۹۵ رقم: ۳۹۹۵. ④ الصحیح لمسلم، کتاب الطلاق، باب فی الایلاء، ج: ۷، ص: ۴۴۳.

کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے (کیا یہ بھی اس قابل ہیں کہ ان پر رشک کیا جائے)"۔

اہل اللہ چونکہ وارثان نبوت ہوتے ہیں اس لئے ان پر بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کی یہ شان غالب ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو جب مکہ کے حرم محترم میں برطانیہ کے کارندوں نے اسیر کیا اور گرفتاری کا پروانہ دیا گیا تو فرمایا کہ الحمدللہ۔

بہ مصیبتے گرفتار آمدم نہ بہ معصیتے "خدا کا شکر ہے کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوا نہ کہ معصیت میں"۔

جس سے واضح ہے کہ معصیت دینی مصیبت ہے اس لئے اس میں مبتلا نہ ہونے پر شکر الٰہی ادا فرمایا۔ اس سے نمایاں ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دنیا کی مصیبت کوئی چیز نہیں نہ وہ کوئی قابل شکایت امر ہے کہ تغیرات دنیا ہیں اور منجانب اللہ بنی آدم کے ہی مصالح کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ کبھی ان سے کفارہ سیأت مقصود ہوتا ہے اور کبھی ترقی درجات۔

اہم مصیبت دینی مصیبت ہے اور دینی مصیبتوں کا انتہائی اور جامع درجہ یہ ہے کہ دین آزاد نہ رہے اور دین دار غلامی میں مبتلا ہو کر شعائر دین کو آزادانہ برپا نہ کر سکیں۔ پس آج بھی جبکہ ہندوستان میں دین آزاد نہیں۔ اس کے شعائر کو مسلمان خاطر خواہ قائم نہیں کر سکتے نہ اپنے اختیار سے شعائر دین کو بلند کر سکتے ہیں۔ تو آیت بالا کی رو سے حسب اسوہ موسوی ان کا اسلامی فرض ہے کہ مکمل آزادی کی جدوجہد کریں دین کے نام پر کریں۔ دینی رنگ میں کریں، دینی افراد کے ذریعہ کریں، عام افراد میں دین اور دین کی اہمیت کے جذبات پیدا کریں کہ مطالبہ آزادی کی غرض وغایت ہی اسلام میں دین کی آزادی ہے۔ جس پر دنیا کی آزادی بطور خاصیت کے خود بخود مترتب ہوتی ہے۔

اسلامی آزادی کے دو راستے...... چناں چہ اسلام میں حصول آزادی کے دو ہی راستے ہیں۔ جہاد اور ہجرت پھر ان دونوں کے دو دو فرد ہیں۔ جہاد بالسنان یعنی اسلحہ سے جنگ کرنا اور جہاد باللسان یعنی کلمہ حق ظالم بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دینا۔ ایسے ہی ہجرت کے بھی دو ہی فرد ہیں۔ ایک ہجرت مکانی یعنی دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہو جانا اور دوسرے ہجرت ارکانی یعنی معاصی چھوڑنا اور موطن طبیعت سے منتقل ہو کر موطن شریعت میں جانا ظاہر ہے کہ ان دونوں امور جہاد اور ہجرت میں سے کسی ایک کی غرض وغایت بھی روٹی یا لذائذ دنیا یا رفاہیت و تنعم یا حظوظ عاجلہ نہیں بلکہ صرف دین کی آزادی و برتری کا قیام ہے۔ جہاد کی غرض تو واضح ہی ہے کہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہے جیسا کہ کتاب وسنت کی سینکڑوں تصریحات اس بارے میں موجود ہیں۔ ہجرت بھی اس لئے نہیں کرائی گئی کہ لوگوں پر وسائل معاش تنگ ہو گئے تھے اور ان کی روٹیوں میں گھاٹا آنے لگا تھا تو انہیں دارالکفر ترک کر دینے کا حکم ملا ہو بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے دین پر مصیبت آنے لگی تھی۔

چناں چہ اوائل اسلام میں دو ہی ہجرتیں ہوئی ہیں۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ۔ مگر دونوں کی غرض مشترک تحفظ دین تھی نہ کہ تحفظ معاش۔

چناں چہ ہجرت مدینہ میں چونکہ یہ غرض زیادہ علو مرتبہ کے ساتھ نمایاں ہوئی اس لئے ہجرت مدینہ، ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہجرت حبشہ میں تو مہاجرین کو صرف اپنا دین محفوظ کرنا تھا اور اس کی صورت فرار من الفتن کی تھی یعنی دین میں فتنہ مخل ہوتا تھا تو جائے فتنہ کو چھوڑ دیا گیا تا کہ دین محفوظ رہ جائے اور ہجرت مدینہ میں نصرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین کی شوکت کا مقصد سامنے تھا یعنی محض اپنا دین بچا لے جانا مقصود نہ تھا بلکہ شوکت کے ساتھ دوسروں تک دین کی منادی اور تبلیغ کر دینا بھی مقصود تھا بلحاظ مقصد دونوں ہجرتیں محمود و مستحسن تھیں کہ محض اپنا دین محفوظ رکھ لینے کی خاطر دارالکفر کو چھوڑ نا بھی عین دین ہے اور دین کو سر بلند کرنا بھی دین ہے۔ لیکن پہلی صورت میں ایک حد تک اپنے ضعف اور کمزوری کا اعلان بھی ہے جس کو براہ راست اعلاءِ کلمۃ اللہ نہیں کہہ سکتے اور دوسری صورت میں نصرت نبی کی خاطر گھر بار چھوڑنا ہے۔ جو بلا واسطہ اعلاء دین ہے۔ اس لئے یقیناً ہجرت مدینہ ہجرت حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت کا لفظ بول کر متبادر کے ساتھ علی الاطلاق ہجرت مدینہ ہی سمجھی جاتی ہے کہ وہی ہجرت کا فرد کامل ہے۔ غرض کوئی سی بھی ہجرت لے لی جائے کسی ایک کا مقصد بھی تنگی معاش سے بچنا یا مصائب دنیا سے تنگ آ کر گھر چھوڑنا نہ تھا اور کسی حد تک یہ چیزیں اگر پیش نظر بھی ہوئیں تو صرف دین کی غرض سے ہوئیں اس لئے ہجرتین کا مقصد بھی آخر کار وہی اعلاء کلمۃ اللہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرماتے ہوئے اس کا کوئی افسوس ظاہر نہیں فرمایا کہ میرا آبائی وطن اور جدی گھر مجھ سے چھوٹ رہا ہے، عزیز و اقرباء چھوٹ رہے ہیں، مانوس سرزمین چھوٹ رہی ہے بلکہ بیت اللہ کو حسرت سے دیکھ کر یہ فرمایا کہ ''اگر میری قوم مجھے وطن سے نہ نکال دیتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا''۔

جس سے واضح ہے کہ ہجرت کے سلسلہ میں نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن پیش نظر تھا نہ قبیلہ و خاندان بلکہ اللہ اور بیت اللہ مکہ کا شہر یا ملک حجاز اور قوم بھی اگر کسی درجہ میں نگاہوں کے سامنے تھی تو وہ اللہ اور ذکر اللہ یعنی دین اور اعلاءِ دین کے لئے تھی نہ کہ براہ راست اور بالذات۔

خلاصہ یہ کہ جہاد اور ہجرت حسی ہوں یا معنوی اور ان کا کوئی سا فرد ہو صرف اس بناء پر عمل میں آتے ہیں کہ لا دینی قومیں جمعہ و جماعات، تبلیغ و موعظت، اقامت حدود اور سد ثغور وغیرہ میں حارج ہوئیں اور دین کے سر بلند ہونے میں آڑے آئیں نہ اس لئے کہ وسائل معاشی کی تنگی روٹی اور کپڑے کی گرانی۔ عیش و لذت، راحت کی کمی اور اس کی تحصیل و تکمیل میں فرق آ گیا تھا اور اس سے بچنا مقصود تھا۔ اگر اس سے بچنا مقصود ہوتا تو اسلام میں فقر و فاقہ اور خشونت عیش کے فضائل ہی کیوں بیان کئے جاتے۔ اس لئے آج جو جہاد اکبر یعنی اعلاء کلمہ حق عند سلطان جائر کا مقصد لے کر مسلمان کھڑے ہوں اور کھڑے ہیں تو اس میں بھی ایک لمحہ کے لئے ان کے قلوب میں شکایت معاش یا شکایت ترفہ و تنعم پیش نظر نہ رہے۔ صرف تحفظ دین اور اعلاء کلمہ حق ملحوظ رہنا چاہئے اور وہی ساری جدوجہد

کی غرض وغایت ہو جسے غیر مشتبہ الفاظ میں بھی واضح کر دیا جائے۔ پھر ایسے ہی تدابیر کے سلسلہ میں اقلیت و اکثریت یا اہانت وتکریم کا سوال پیدا نہ ہونا چاہئے یعنی ان رسمیات سے مغلوب نہ ہونا چاہئے بلکہ ان پر غالب آنا چاہئے جس انداز سے بھی ممکن ہو جیسا کہ آیت بالا کے اشارہ اور نصوص وحدیث سے واضح کر دیا گیا ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی دربار میں جو کچھ نیابت الٰہی میں ارشاد فرمایا وہ حجت ودلیل سے فرمایا: اور اپنی رسالت پر خدا کی آیات پیش کیں یعنی معجزے دکھلائے۔ عصاء موسوی دکھلائی جو لاٹھی سے سانپ اور سانپ سے لاٹھی بن جاتی تھی۔ ید بیضا دکھلایا جو گریبان میں ڈالنے سے سورج کی طرح روشن ہو جاتا تھا اور پھر اصلی حالت پر لوٹ آتا تھا جس کی جواب دہی سے فرعون عاجز ہوا اور اس کے سوا اسے کچھ بھی جواب نہ بن پڑا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جادوگری کا الزام لگائے۔ چناں چہ یہی کیا اور ملک کے جادوگر جمع کر کے مقابلہ کرایا۔

اور انہوں نے بھی اس لاٹھی کے سانپ کی شکل کے ہزار ہا سانپ جادو کے زور سے بنائے مگر چوں کہ ان میں حقیقت کچھ نہ تھی اس لئے جادوگر سب کے سب عاجز ہو گئے اور انہیں تسلیم ورضا کے سوا چارہ نہ رہا۔

⑰ **مطالبۂ آزادی میں اعجازی حجت کی ضرورت** ...... اس سے صاف ظاہر اور واضح ہوا کہ آج بھی جبکہ استخلاص قوم کے لئے مسلط اقوام کے حلقوں میں قائدین اسلام جائیں، تو ہر دعوے کے ساتھ حجت بھی پیش کریں اور وہ بھی معجزہ کی تا کہ مخاطب قومیں اس کے ماننے پر عقلاً مجبور ہو جائیں اور جواب نہ لا سکیں۔ فرق اتنا ہے کہ فرعون کے سامنے معجزہ موسوی پیش کیا گیا تھا جو لاٹھی کا تھا اور فرعونان وقت کے سامنے معجزہ محمدی پیش کرنا چاہئے جو کہ قرآن کریم ہے اور تمام دلائل وبراہین کا مجموعہ۔ ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً﴾ کیونکہ فرعون کا رنگ حاکمانہ تھا تو وہ لاٹھی ہی سے قائل ہو سکتا تھا اور فرعونان وقت کا رنگ حکیمانہ ہے تو علم وحکمت سے ہی قائل ہو سکتے ہیں۔

فرعون نے اپنے ملکی جادوگروں کو تقرب درباری، کرسی اور انعام واکرام کے وعدوں کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ڈال کر عصاء موسوی کے سانپ کے ہم شبیہ لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنوائے مگر وہ محض "تخیلاتی تھے۔ ﴿فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ﴾ ① "بس یکا یک ان جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں (جو سانپوں کی صورت میں ان کی نظر بندی سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے چلتی دوڑتی ہوں"۔ اس لئے یہ سب کید ومکر ختم ہو گیا اور سارے سانپوں کو موسوی اژدھا نگل گیا۔ معجزہ کے سامنے سب جادوگروں نے سپریں ڈال دیں۔

بعینہ آج بھی یہی صورت ہوگی کہ جب فرعونان وقت کے سامنے معجزہ محمدی (قرآن) کے دلائل وبراہین پیش کئے جائیں گے یا پیش کئے گئے ہیں تو انہوں نے اسی ملک کے جاہل مولویوں مگر جادو بیان لیکچراروں کو کھڑا کر دیا کہ وہ مضامین قرآن ہی کے ہم شبیہ مضامین اور اسی کے استنباطات کے مشابہ وجوہ مستنبط پیش کر کے تلبیس

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۶۶.

اپلیں کریں جس پر ان کے لئے انعام واکرام اور ہر قسم کی سرکاری رعایتوں کے وعدے ہوتے ہیں۔ مخفی نالیوں سے اس روپیہ کا یہ گندہ پانی ان کے گھروں میں بہتا ہوا پہنچ رہا ہے۔ ان ائمہ معطلین سے فرقے بنتے ہیں وہ کتاب و سنت ہی کے نام پر اہل حق کے مقابلہ پر آتے ہیں اور عصاء قرآنی کے مشابہ ہزار ہا عصی (لاٹھیاں) تخیلاتی بنا بنا کر میدان میں پھینکتے ہیں۔ ہزاروں ٹریکٹ رسالے اور تفسیریں، قرآنی تفسیروں اور فقہیات کے مشابہ سامنے آتی ہیں۔ حتی کہ نبی قرآن کی طرح انبیاء بھی کھڑے کردیئے جاتے ہیں جو اہل حق کو کذاب و مبطل کہہ کر اپنی گورنمنٹ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری بعثت ہی اس حکومت کی حمایت کے لئے ہوئی ہے۔ ہم اگر اس کے فضائل بیان کریں تو پچاس الماریاں بھر جائیں۔

کوئی کہتا ہے کہ: قرآن میں مومن قانت، متقی وغیرہ کے الفاظ کا مصداق ہی موجودہ گورنمنٹ کے افراد واجزاء ہیں۔ ان جادوگروں اور ان کی میدان میں ڈالی ہوئی ان لاٹھیوں اور سانپوں سے جو اہل حق کے خیال میں کبھی کبھی چلی دوڑتی دکھلائی دینے لگتی ہیں۔ مسلمانوں میں خیالات کا تشتت اور تفرق پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دل جمعی خاک میں مل کر قوت منتشر ہوجاتی ہے اور حکمرانوں کو اطمینان ہوجاتا ہے کہ حکومت کے قدم کچھ اور جم گئے۔ لیکن جب یہ ثعبان قرآنی اپنی پوری شان کے ساتھ کسی موسیٰ صفت عالم کے ہاتھ پر نمایاں ہوتا ہے تو یہ اژدہان سارے سانپوں کو نگل لیتا ہے اور ﴿ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ کا ظہور ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی یہ جادو بیان لیکچرار گورنمنٹ سے کٹ کر حق کے سامنے سر بھی جھکا دیتے ہیں اور اعلان کردیتے ہیں کہ ہم اب تک غلطی اور تلبیس میں پھنسے ہوئے تھے ﴿ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴾ جس سے اس قسم کی تلبیسات کا آئے دن پردہ چاک ہوتا رہتا ہے۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ آزادی خواہ طبقہ جو مطالبہ اور جو نصیحت بھی فرعونی درباروں میں پیش کرے، حجت و برہان یعنی احادیث اور آیات قرآن سے پیش کرے، دینی رنگ میں پیش کرے، سلف کے انداز میں پیش کرے۔ اس تمسک واستدلال کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہونی چاہئے کہ اس کے ہر ہر جملہ کی دلیل کتاب وسنت ہوتا کہ اس کا منجانب سرکار الٰہی ہونا ظاہر ہوجائے اور اس کی بات نہ ہی سمجھی جائے جس کا کسی سے بھی جواب نہ بن پڑے اور جواب دیا تو جواب کی جادوگری کا پردہ اسی آیت الٰہی سے چاک ہوجائے۔

پس ہمارے لئے اس میں کوئی فخر نہ ہونا چاہئے کہ ہم نے اپنی تقریر وتحریر کو عین اس سیاسی اور معاشی انداز میں پیش کیا جس انداز سے عصری سیاست کے وکلاء اپنے مقالے پیش کرتے ہیں۔ جن کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان میں قرآن وحدیث کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہوتا نہ صراحتاً نہ استنباطاً اور محسوس ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ مقالہ کسی طالب علم اور منہمک کتاب وسنت کا ہے کیونکہ اس کا آغاز وانجام قومیت محضہ، معاش، خالص ملکی مفاد اور صرف رکی تعاون سے ہوتا ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے اول وآخر اور ظاہر وباطن کی ہر ایک جنبش صرف کتاب وسنت اور اس کے صحیح استنباط سے ہو اور یہی رنگ ہماری طرف خواص وعوام میں منسوب ہوجائے

کیونکہ ان کے ہر خطاب وابلاغ ہر پیام اصلاح وتہذیب اور ہر ایک مطالبہ واحتجاج کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ: ﴿قَدْ جِئْنٰکَ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکَ وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی.﴾ ”ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور سلامتی ایسے شخص کے لئے ہے جو راہ پر چلے“۔

یعنی نہ خود آئے نہ کوئی اختراعی حجت لے کر آئے بلکہ دونوں چیزیں من اللہ ہیں اور اسی لئے صحیح وسالم وہی رہے گا جو اس رسالت الٰہی کی پیروی کرے گا ورنہ ہمارے ہی ہاتھ پر اس کی جاہی من اللہ نمایاں ہوگی کیونکہ ﴿اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی.﴾ ① ”ہمارے پاس خدا کی طرف سے یہ حکم پہنچا ہے کہ (قہر خداوندی) کا عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلاوے اور روگردانی کرے“۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ساری پیغام رسانی میں جو منجانب اللہ اور بامر اللہ تھی، اولین مقصد فرعون سے یہ بھی ظاہر فرمایا کہ ﴿اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ﴾ (بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج۔ اور اپنے پنجہ ظلم سے انہیں رہا کر کے انہیں آزادی دے) ظاہر ہے کہ اس ارسال بنی اسرائیل اور انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھیج دینے کا یہ مطلب نہ تھا کہ انہیں مصر سے شام بھیج دے یا ہم ملک مصر چھوڑنے کے لئے بنی اسرائیل کو تجھ سے لینے آئے ہیں بلکہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنا پابند اور غلام رکھنے کی بجائے میرے ساتھ ہونے دے تا کہ وہ میرے ساتھ ہو کر جس طرح چاہیں آزادی سے زندگی بسر کر سکیں۔

⑱ **انتخاب امیر اور تشکیل مرکزیت**...... اس سے واضح ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم بنی اسرائیل کے اوپر سے فرعون کی امامت ہٹا کر رسول خدا کی امامت وامارات قائم فرمانا چاہتے تھے کیونکہ فرعونی امارت سے ان میں غیر اللہ کی پرستش کے مہلک جراثیم سرایت کر جاتے اور موسوی امامت سے ان میں صرف خدائے واحد کی اطاعت وعبادت کے پاک جذبات گھر کرتے۔ تو کیا اس سے یہ مسئلہ واضح نہیں ہوتا کہ حصول آزادی کے سلسلہ میں مسلمان اپنا ایک امام اور امیر منتخب کریں جو ایک طرف تو حسب استطاعت اطاعت شریعت کے ساتھ ان کی دینی تربیت کرے ان کی اسلامی تنظیم کرے ان کے معاملات ومحاکمات کو شرعی دائرہ میں رکھے اور ایک طرف دشمنان دین سے جائز مطالبات بھی کرے اور نہ صرف اپنے ماموریں بلکہ ان ناجائز آمرین کو بھی راہِ حق دکھلائے۔ رب اعلیٰ اور اس کی رسالت حقہ سے انہیں بھی آشنا بنائے۔ اگر مسلمان فوضویت اور لامرکزیت کی زندگی بسر کرتے رہے تو نہ ان کا دینی تشتت زائل ہو سکے گا نہ دنیوی تفرق۔ یہ غرض نہیں کہ مسلمان اس مغلوبیت کے عالم میں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بنائیں کہ اس کے لئے طاقت اور قہر غلبہ شرط ہے بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ ایک مرجع الامر تسلیم کر لیں جو ان میں دینی تشتت اور افتراق نہ ہونے دے اور حتی الامکان ان کو اخلاقی قوت سے معاملات شرعیہ پر جمائے رکھے تا کہ وہ جب بھی غلبہ پائیں تو انہیں اس انقلاب کے تشویش ناک دور میں از

---

① پارہ: ۱۶ سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۸۔

سرِ نو کسی نظام اور مرکزیت کی تشکیل کرنی نہ پڑے بلکہ پہلے ہی سے ان کا ایک قائم شدہ نظام کا ڈھانچہ بنا بنایا موجود ہو اور وہ اسی میں حسبِ غلبہ وطاقت، طاقت کی روح پھونک دیں۔ چناں چہ آزادی کے سلسلہ میں چونکہ خدا کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کو مصر چھوڑنا پڑا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زیرِ قیادت ان کے نظام کی تشکیل ایسی قائم شدہ موجود تھی کہ ایک اشارۂ موسوی پر چھ سات لاکھ بنی اسرائیل نے راتوں رات مصر چھوڑ دیا اور صبح ہوتے ہوتے وہ بحرِ قلزم کے کنارے پر تھے۔

پھر فرعون اور فرعونیوں کی غرقابی کی بعد جب کہ بنی اسرائیل کی طاقت کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ انہیں کوئی نیا نظام بنانا نہ پڑا تھا۔ امام حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے جن سے قوم میں مرکزیت قائم تھی اور مقتدی سارے بنی اسرائیل تھے جس سے سمع وطاعت کا نظام قائم تھا، ڈھانچہ موجود تھا۔ روح آتے ہی وہ زندہ ہو گیا اور پھر جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں موجود ہے۔ اسی طرح آج کے دورِ غلامی میں اشد ترین ضرورت ہے کہ حسبِ طاقت مسلمان بھی اپنے لئے کسی ایک شخصیت کو پہلے ہی سے امیر تسلیم کئے رہیں اور اس کے ذریعہ اپنی شرعی تنظیم کئے رہیں۔ آج وہ اخلاقی ہے کل کو وہ رسمی ہو جائے گا جس میں قہر وغلبہ پیدا ہو جائے۔

19 صفاتِ قیادت...... مگر ہاں اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ امیر موسیٰ صفت ہونا چاہئے یعنی دورِ نبی کے بعد امیر وامام نائب نبی اور وارث نبی ہونا چاہئے جس میں اوصافِ نبوت کا پورا پورا عکس ہو اور ظاہر ہے کہ نبی کے بے شمار اوصافِ کمال کا خلاصہ دو چیزیں ہوتی ہیں۔

ایک علم لدنی جس پر نبوت کا مدار ہے یعنی وہ علم اکتسابی اور کتابی نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے بلا توسط اسباب القاءِ خداوندی ہوتا ہے جس کا چشمہ نبی کے قلب سے پھوٹتا ہے جو محسوساتی علوم کے اوہام وظنون اور شبہات سے پاک ہوتا ہے اور قطعیت ویقین کی ٹھنڈک لئے ہوئے ہوتا ہے جس سے سینے معمور ہو جاتے ہیں اور سکون و طمانیت قبول کرتے ہیں۔

دوسرے معصومیت کہ نبی کی ہر نقل وحرکت حظِ نفس سے پاک ہوتی ہے ہر چیز اللہ کے لئے کی جاتی ہے جس میں غیر اللہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ گمراہی کا شائبہ ہوتا ہے نہ ضلالت کا۔ غرض علم خدائی ہو جو اسی کے مخفی راستوں سے آیا ہو اور عمل عبدیت خالصہ کا ہو جس میں ضلالت نہ ہو تو یہی کمالاتِ نبوت کا سرِ منشاء ہے جس سے آگے تمام کمالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے پس حقیقی ورثاءِ انبیاء بنصِ حدیث اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ. ① "علماء وارثانِ نبی ہیں"۔

علماء ہیں تو ان سے اس قیادت وامارات کے سلسلے میں وہی علماء مراد ہو سکتے ہیں جن میں یہ دونوں باتیں حسبِ درجہ واستعداد پائی جاتی ہوں جن کا علم لدنی ہو، جن میں علم کے ساتھ معرفت بھی ہو، جن کا قلب موردِ علمِ خفی ہو، وہ اسرارِ تشریع کے مفکر اور مبصر ہوں اور علومِ ظاہری کے ساتھ انہیں علومِ باطنی سے بھی کافی مناسبت ہو، وحی کی

① السنن للترمذي، كتاب العلم، باب ماجاء في فضل الفقه على العبادة ج: ٩ ص: ٢٩٢.

بجائے القائے ربانی اور الہام باطنی ان کا مربی ہو اور ساتھ ہی نبض شناس امت بھی ہو۔ حوادث و وقائع اور مخاطبین کی ذہنیتوں پر انہیں عبور حاصل ہو اور جو مصداق ہوں حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کے ۔

بینی اندر خود علوم انبیاء　　　　　بے کتاب و بے معید و استاد

گویا مطلقاً عالم ہونا یا کتابوں کے درس و تدریس پر قادر ہونا کافی نہیں بلکہ بہ ین معنی ان میں وراثت نبوت کی شان ہونی چاہئے کہ ان کا علم خود بینی اور تردداتے سے بالاتر ہو۔

ادھر ان علماء میں عصمت کی شان بصورت محفوظیت پائی جاتی ہو۔ تقویٰ وطہارت اور احتیاط وحزم کی وجہ سے ان کا رویہ نہ ذاتی گمراہی کا ہو نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا وہ ضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا دونوں قسم کی ناپاکیوں سے پاک ہوں۔ پھر جبکہ ان دونوں اوصاف انکشاف باطن اور محفوظیت کے علماء کوئی اجتماعی شان بھی پیدا کرلیں تو ان میں فی الجملہ عصمت کی شان بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ کیونکہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ" لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ "۔ ① " میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی (یعنی ساری امت کامل کر کسی گمراہی پر اجماع کر لینا ناممکن ہے بلکہ ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی وہی جماعت منصور ہوگی)"۔

جس سے واضح ہے کہ اہل حق اور ان میں بھی علمائے حق کہ جن کی بدولت لوگ اہل حق بنتے ہیں اور ان میں بھی پھر جماعت علماء جبکہ خود ایک اجتماعی شان بھی پیدا کرلے یعنی جمعیت بنالے وہ انشاء اللہ سب کے سب مل کر امت کو گمراہی کی لائن پر نہیں ڈال سکتے۔

پس اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ حقیقی معنی میں نبی کا صحیح قائم مقام پوری امت اجابت اور اس امت میں بھی اس کی بقاء کی اصلی روح علماء ربانی کی جماعت ہوتی ہے اور اسی کو امت کا امام یا امیر کہنا چاہئے لیکن مرکزیت قائم کرنے کے لئے اگر یہی جماعت اپنے میں سے کسی ممتاز شخصیت کو امیر بنالے اور خود اپنے اسی محفوظا بلکہ ایک حد تک معصوم اجتماعی علم وفہم سے اس کی مشیر و معین ہو جانے تو صحیح معنی میں یہی امیر بواسطہ جماعت نائب اور وارث رسول ہی کہلوائے گا، جو ماتحت جماعت، اجتماعی نصرت، وتعلیمات کے سبب کمالات جماعت کا مجموعہ اور اس جامعیت کمالات کے سبب نبی کے ان دونوں اوصاف کمال باطن اور عصمت کا وارث ہوگا۔ اسے حق ہوگا کہ امت کی قیادت اور شرعی تربیت کرے اور ان کا امیر کہلائے۔ پس امت کے لئے سہل علاج یہی ہے کہ مبصر اور مظہر اور تقویٰ وطہارت کے پیکر علماء ربانی کی قیادت میں رہے اور ان کے زیر سایہ اپنی شرعی زندگی بسر کرے۔

صالح قیادت سے روگردانی کی پاداش۔۔۔۔ یہ جماعت اگرچہ نبوت کی سی معصومیت نہیں رکھے گی چہ جائیکہ ان میں کوئی ایک شخصیت، البتہ اس کی شان محفوظیت کا یہ ثمرہ قدرتی ہوگا کہ وہ جو امر بھی طے کرے حظ نفس اور ذاتیاتی مفادات کے لئے نہ کرے بلکہ لوجہ اللہ اور مفاد مسلمین کے لئے کرے پھر بھی اگر اس کے فیصلوں میں کوئی

① تخریج گذر چکی ہے۔

گوشہ خطاء فکری کا نکل آئے تو مسلمانوں کے لئے کسی حالت میں بھی یہ زیبا نہ ہوگا کہ وہ اس خطاء کے سبب اس کے سارے صوابات سے محرومی اختیار کرلیں اور اصل جماعت ہی کو غیر معتبر ٹھہرا کر سرے سے اس کی قیادت ہی سے باہر آ جائیں بلکہ مزید برآں وقار کوزائل کرنے کے منصوبے باندھنے لگیں اور اگر چند نااہلوں میں اس بے توقیری کی مقبولیت ہو جائے تو اس پر فخر کرنے لگیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔

اگر وہ ایسا کر کے جماعت علماء یا ان کے منتخب کردہ صدر و امیر کی قیادت سے باہر ہوں گے تو اس کی پاداش میں ان کے لئے ناگزیر ہوگا کہ وہ جماعت جہلاء یا فساق و فجار کی امارت کے تحت میں آ جائیں اور اپنا رہا سہا دین بھی کھو بیٹھیں۔ پس یہ کیا کم حیرت کی بات ہوگی کہ جو لوگ کسی ایک آدھ جزئیہ کی مزعومہ خطا تک کو معاف نہیں کر سکتے تھے اب انہیں اپنی خوشی سے کلیاتی خطاؤں اور عمومی فسق و فجور کی حکومت و قیادت کو بطوع و رغبت قبول کر لینا پڑے گا اور اب وہ اسی کے زیر سایہ ساری زندگی غیر شرعی طور پر بسر کرنے لگے۔

میرے خیال میں علماء و صالحین کے برملا تخطیہ کی ایک کھلی سزا ہے کہ ایک ایک جزئیہ میں تقویٰ و طہارت کے طالب کلی طور پر فسق و فجور کی امامت کے نیچے آ جائیں اور پھر انہیں خطاء و صواب کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ اصول دانش کی رو سے ایسی جزئیاتی خطا بہتر ہے کہ جس کو ترک کرنے سے کلیاتی معاصی میں ابتلاء ہوتا ہو۔

پس ضروری ہے کہ امت اسلامیہ زیر قیادت صلحائے امت و جماعت (جس کا رسمی نام جمعیت العلماء رکھ لیا جانا کوئی مذموم بات نہیں ہے) شرعی زندگی گزارے منہیات شرع سے ہجرت کر کے ماموراتِ شرعیہ کی حدود میں رہے۔ جہالت رفع کرے تفقہ فی الدین پیدا کرے۔ اپنے سیاسی مستقر اور حقیقی امارت کو جو علماء حقانی کا جامع ہو جس میں دینی رنگ کا غلبہ قوی اور وسیع سے وسیع تر کرے، جزئیات مسائل پر لڑنا جھگڑنا ترک کر کے بنیادی مقاصد میں خلل نہ ڈالے۔ عمل میں رواداری قائم کرے تو پھر حقیقی امارت و امامت قائم ہو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔

مخلوط معاشرہ میں جمعیت مسلمہ کے دو اصول...... اس جامع علم و تقویٰ جماعت کے اصولاً دو کام سب سے بڑے اور سب سے اہم ہو جانے چاہئیں ایک یہ کہ کسی جماعت میں مدغم ہوئے بغیر جب مسلمانوں کے حقوق کا سوال آئے خواہ کسی بھی پلیٹ فارم سے اٹھے تو وہ ان کی غیر مشروط حمایت کرے اور نصرت کے لئے اپنی پوری قوت عمل سے کھڑی ہو جائے اور جب آزادی ملک کا سوال اٹھے خواہ کسی غیر مسلم پلیٹ فارم ہی سے اٹھے تو اس کی غیر مشروط حمایت کرے اور اپنی پوری قوت اور اک و عمل سے اس کو آگے بڑھائے کہ اس ملک کے تمام مادی و نفسانی امراض کی اصلی جڑ صرف غلامی ہے اور اس کی حقیقی بہبود و فلاح صرف آزادی ہے۔

اس طرز عمل سے اس جنگ آزادی کے سلسلہ میں تو باہم ربط و اتحاد قائم رہ سکتا ہے جو حصول آزادی کے لئے رکن اولین ہے اور غیر مسلم جماعتوں سے تصادم و نزاع قائم نہیں ہو سکتا جو حصول آزادی کے لئے شرط اولین ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نہ رکن کی خاطر شرط سے قطع نظر کی جا سکتی ہے اور نہ شرط میں الگ کر کر رکن چھوڑا جا سکتا ہے۔ رہی لفظوں

میں اس حقیقت کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جمعیت العلماء کا تمام آزادی پسند مسلم جماعتوں کو اپنے سے وابستہ رکھنا بھی ضروری ہے اور نوائے آزادی میں غیر مسلم آزادی خواہ جماعتوں کا ہموار رہنا بھی از بس ضروری ہے۔

غیر مسلم سے اشتراک عمل...... غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل شرعاً ممنوع یا حرام نہیں ہے جبکہ حدود شرعیہ میں ہو، آج ملکی معاملات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہندو مسلم اشتراک عمل نہ ہو پھر ملکی آزادی جیسے عظیم مقصد میں ہندو مسلم اشتراک عمل ممنوع وحرام کیوں بن جاتا ہے۔ جب کہ ایک طرف تو ملک تمام جزوی امور میں عملاً اسی اشتراک عمل کی تائید میں ہے اور دوسری طرف حکومت نے بھی اس کا کھلا اعلان کر دیا ہے کہ وہ آزادی ہند کے بارے میں کسی مشترکہ اور متفقہ مطالبہ پر ہی غور کر سکتی ہے۔

تو کیا ان حالات میں شرعاً یا سیاسۃً یہ چیز ناجائز یا ممنوع ٹھہر سکتی ہے کہ تمام اقوام ہند باہمی اعتماد ورواداری کے ساتھ بیک آواز اس موجودہ شہنشاہی اور نظام حکومت سے کلی بیزاری اور نفرت کا اعلان کرتے ہوئے ملک کی آزادی کا مطالبہ کریں اور اس سلسلہ میں اندرون حدود اشتراک عمل کریں اگر غیر مسلم سے اشتراک عمل ممنوع ہے تو گورنمنٹ کے ماتحت ہر سیاسی ادارہ میں ممنوع رہنا چاہئے کیونکہ اصول ہر جگہ اصول ہے۔ ہاں حدود و قیود کی ہر جگہ ضرورت ہے کہ غیر محدود عمل ہمیشہ مضرتوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

پس اس بارے میں بھی باہمی معاہدہ سے حدود عمل کی اصولی دفعات ایسی ضرور مشخص کر لی جائیں کہ ان دو قوموں میں نزاعات واعتراضات کا سدباب ہو جائے جو آئے دن باہمی بے اعتمادی اور آپس کی سر پھٹول کا باعث ہوتا رہتا ہے اور خصوصیت سے جمعیت العلماء خدشات واعتراضات کا مورد بنی رہتی ہے۔ پھر یہ معاہدہ بھی دفاع اور جنگ کی حد تک ہونا چاہئے۔ تعمیری معاہدوں کے لئے آزادی کا زمانہ موزوں ہوتا ہے نہ کہ غلامی کا۔

ہمہ گیر مقصد کے حصول کا طریق کار...... بہرحال جمعیت العلماء کو اپنے ہمہ گیر مقصد اور بلند پایہ منصب کے لحاظ سے ملک کی ہر قومی جماعت سے درجہ بدرجہ تعلق قائم رکھنا ضروری ہے۔ مسلم جماعتوں سے یگانگت واتحاد کا اور آزادی پسند غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل کا۔ مگر ساتھ ہی خود اپنے پروگرام اور اپنے پلیٹ فارم کا استقلال محفوظ رکھنا بھی اس کا عقلی وشرعی فریضہ ہے ایک منٹ کے لئے نہ اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ جمعیت العلماء اپنی خصوصیات فنا کر کے اپنا استقلال کھودے اور کسی دوسری مسلم یا غیر مسلم یا نیم مسلم جماعت میں مدغم یا اس کے پسرو ہونے کا دھبہ اپنے دامن تقدس پر لگائے اور نہ کسی حالت میں اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے محدود جماعتی استقلال میں محو ہو کر ہر دوسری جماعت سے مستغنی ہو جائے اور اپنے یا دوسروں کے تعلق منقطع کر دینے پر آسانی سے صبر کر کے بیٹھ جائے کیونکہ پہلی صورت میں اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور دوسری صورت میں اس کی منصبی حیثیت ختم ہو جاتی ہے کہ وہ بجائے ایک ہمہ گیر راہنما اور قائد ہونے کے صرف ایک چھوٹی سی پارٹی بن کر رہ جاتی ہے۔ پس اسے اپنا مستقل اور غیر تابع وجود قائم رکھ کر دوسروں کی طرف ملاپ اور اشتراک کا ہاتھ بہرصورت

بڑھاتے رہنے ہی کی ضرورت ہے۔ بالخصوص سے مسلم اداروں سے تو اسے وداد و تعلق کی خاطر دوڑ دھوپ کرنے کے ساتھ اخلاقی لجاجت و سماجت سے بھی کام لینا پڑے اور شدید سے شدید تعدیوں پر بھی جو اس کی ذات پر کی جائیں مسامحت سے کام لینا پڑے تب بھی اسے ہرگز گریز نہ کرنا چاہئے کہ یہ خود اس کی اخلاقی عظمت اور عمومی راہنمائی کا ایک جزء لاینفک ہے کہ ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ کا صحیح نقشہ علماء کی جماعت بھی نہ کھینچے گی تو پھر اس کا سلیقہ اور کس میں تلاش کیا جائے گا؟ اگر انبیاء علیہم السلام اپنی عالمگیر اخلاقی شفقت سے کفار تک کو اپنا کر انہیں مسلم و قانت کر سکتے ہیں تو کیا نائبان انبیاء اسی شفقت و رحمت کے عمل سے اپنوں کو بھی اپنا نہیں بنا سکتے؟

باہمی ربط و تعاون کی بنیاد اتحاد مقصد اور تقسیم عمل پر ہونی چاہئے...... مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض اوقات جبکہ لوگوں کے قلوب پر غرض مندیوں یا غلط فہمیوں کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ اپنے ہی مربیوں اور مصلحوں کے خلاف عناد تک کا مظاہرہ کرنے سے دریغ نہیں کرتے تو علماء کو تعاون اور تعلق سے مایوسی تک کی نوبت بھی آجاتی ہے لیکن پھر بھی فرائض نصیحت و موعظت اور روابط شفقت و رحمت قطع کرنے کی کوئی وجہ پیدا نہیں ہوتی الا یہ کہ شفقت و موعظت کے تمام مراحل سے گزر کر قلوب دیانۃً اس یاس پر شاہد ہو جائیں اور یکسوئی کے سوا چارہ کار باقی نہ رہے تو سکوت میں مضائقہ نہیں لیکن انقطاع تعلق یا طنز آمیز نکتہ چینیاں پھر بھی شان علم اور وراثت نبوت کے منافی رہیں گی صَدِيقَيْنِ وَلَعَّانِيْنَ (کیا سچائی کی علمبرداری بھی اور طعن و تشنیع بھی؟ یہ دو چیزیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟) بہر حال جیسے جمعیت العلماء کا قیام اور اس کی منصبی حیثیت کے وقار کا وجاہت کے لئے ضروری ہے ایسے ہی دوسری جماعتوں سے حسب حیثیت و مرتبت اس کا تعلق اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ ادھر اپنے شرعی نظریوں کی تبلیغ اور امت کو رحمت و یسر کے ساتھ ان پر لانا بھی از بس ضروری ہے۔ اس سے میرا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ جمعیت العلماء کی قیادت کے یہ معنی ہیں کہ دوسری مسلم جماعتیں توڑ دی جائیں اور یہ ممکن بھی کب ہے جبکہ آزادی جیسے بنیادی مقصد کے لئے اور بھی بہت سے مبادی اور مقاصد طبعی طور پر ضروری ہیں جن سب کو نہ تنہا جمعیت العلماء انجام دے سکتی ہے اور نہ بہت سے وظائف کی انجام دہی اس کی منصبی حیثیت پر چسپاں ہی ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک ان مختلف مقاصد کے لئے اتحاد مقصد کے اور تقسیم عمل کے اصول پر دوسری جماعتیں بھی موجود نہ ہوں اور ان کا اور جمعیت کا باہمی ربط و تعاون نہ ہو اصل مقصد کی تکمیل دشواری ہی نہیں نا ممکن ہے۔

جمعیت العلماء کا شرف و امتیاز...... ہاں مگر یہ بھی میں ضرور کہوں گا اور شرعی راہنمائی کی روشنی میں کہوں گا کہ: یہ تمام دوسری مسلم جماعتیں جمعیت العلماء کے سامنے مستفتی ہوں گی نہ کہ مفتی۔ نہ بلحاظ ذوات علماء بلکہ اس لحاظ سے کہ امت کے ہر مرض کی دوا بالآخر کتاب و سنت ہے اور اس کی حامل حقیقۃً بھی علماء کی جماعت ہے جبکہ وہ اپنے علمی وقار، فکر صحیح اور اخلاق کی بلندیوں کو محفوظ رکھ کر خالص کتاب و سنت کی روشنی امت کے سامنے پیش کرتی رہے۔ ایسی صورت میں افراد امت ہوں یا جماعات امت انہیں سمع و طاعت کے سوا چارہ کار نہیں کہ ارشاد ربانی

ہے ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ ① ''اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں کہ ان کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا، وہ صریح گمراہی میں پڑا''۔

پس تمام مسلم جماعتوں کا فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے مسئلہ میں جمعیت العلماء کی شرعی راہنمائی بالضرور حاصل کریں جس میں ذرا بھی اصول یا فروع اسلام سے ٹکرا جانے کا کوئی احتمال ہو بلکہ ان کے لئے بہر حال یہی ضروری اور مصلحت ہے کہ وہ صرف جمعیت العلماء ہی کی طرف رجوع کریں تا کہ مسلم مجالس سے ربط باہمی قائم ہونے کے ساتھ ان کے کام بھی جمعیت کے علم میں آتے رہیں اور خود جمعیت کی بھی کوئی چھوٹی بڑی تجویز ان مجالس کی تجاویز سے متصادم نہ ہو سکے۔

پھر اگر جمعیت العلماء کی کسی تجویز سے کسی مسلم جماعت کو کوئی ادنیٰ سا بھی اختلاف پیدا ہو تو وہ جب تک کہ اس میں جمعیت سے آخری حد تک رجوع کر کے مسئلہ صاف نہ کر لے کتابت و خطابت سے کوئی ادنیٰ پہلو تہی نہ کرے یعنی ابتداء ہی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہ کر لے اور اتنی کسی انقطاع یا بے گانگی یا بے مروتی کا مظاہرہ نہ کرے اور ادھر جمعیت بھی فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے اپنے خلاف تنقید سننے اور معقول و منقول تنقید کو مان کر اس کی تلافی کے لئے تیار رہے کہ ''كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا''. ② ''کلمہ حکمت مومن کی گم کردہ پونجی ہے جہاں مل جائے وہ اس کا مستحق ہے''۔

افہام و تفہیم کا راستہ اپنانے کی ضرورت..... خلاصہ یہ کہ جس طرح حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے امام قوم بن کر جب کہ بنی اسرائیل کی تربیت و تعمیر کی اور ان کا وکیل شرعی بن کر فرعون سے ان کی آزادی کے بارے میں گفت و شنید اور مطالبہ و احتجاج کیا اور تمام بنی اسرائیل نے جن میں اسباط کی متعدد جماعتیں تھیں، سمع و طاعت سے کام لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مشترک و مختصر جمعیت پر اعتماد کیا جس کی بدولت بالآخر وہ آزاد ہوئے۔ اسی طرح آج کے دور غلامی میں بھی مسلمان افراد و جماعات نائبین نبی کی اجتماعی قیادت میں اور اگر وہ اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کریں تو اس کی امارت میں اس کی تعمیر و تربیت پر اعتماد کریں اور شخصی اغراض یا خود غرضیوں کی تفرقہ پردازیوں سے جزئیات میں پڑ کر اصل مقصد کو ہاتھ سے نہ کھوئیں تا کہ جماعت یا امیر جماعت ان کی آزادی کے لئے بانبساط خاطر پوری جدوجہد کریں اور آزادی کو ان کے قریب لے آئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جمعیت العلماء نے ان وظائف کو اپنے مقدور بھر ادا کیا ہے اور ادا کرتی رہے گی۔ مگر یہ کارخانہ بشری ہے اس لئے فروگذاشت یا اجتہادی خطا ممکن ہے۔ سو جن حضرات پر بھی ایسی کوئی خطا واضح ہو وہ

---

① [illegible] الاحزاب، الآية: ۳۶. ② الحديث اخرجه الامام الترمذي في سننه وضعفه، كتاب العلم باب [illegible] الفقه على العبادة ج ۹ ص: ۲۰۱.

اعتراض وطعاطن اور اخباری پروپیگنڈوں کا راستہ چھوڑ کر دل سے جمعیت کی طرف رجوع کریں اور جذبات کے بجائے دلائل واصول سے افہام وتفہیم کرلیں اور ابتداء سے فریقین میں نیت مناظرہ کے بجائے تحقیق مسئلہ کا عزم ہو تو بات نہیں بڑھ سکتی۔ ﴿إِن يُرِيدَآ إِصۡلَٰحٗا يُوَفِّقِ ٱللَّهُ بَيۡنَهُمَآۗ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرٗا﴾ ①

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آج ہندوستان کا سب سے گہرا اور بنیادی مرض غلامی ہے جس کی جڑوں کو ایک پردیسی حکومت رات دن مضبوط کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے جس نے شعائر اسلامیہ ہی کو نہیں شعائر انسانیت کو بھی مٹا دیا ہے۔ اس غلامی سے ہماری تعلیم، روایات، مذہب، اقتصادیات، تہذیب وتمدن، قومی وقار، آبرو اور اندرونی و بیرونی تعلقات سب برباد ہو چکے ہیں۔ قرآن نے اس غلامی کو بدترین عذاب قرار دیا تھا اور اس لئے ہمارا اولین فریضہ ہے کہ اس مہلک مرض سے بعجلت ممکنہ نجات حاصل کر کے آزادی کے مقام رفیع تک پہنچیں جیسا کہ اس کی فرضیت وضرورت ابتدائی نمبروں میں عرض کی گئی تھی۔

حصول آزادی کا مختصر پروگرام...... حصول آزادی کے پروگرام کا حاصل یہ ہے کہ:

1 ...... سب سے اول غلامی کے منشاء کو سمجھنا چاہئے کہ وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کی استبدادی پالیسی ہے۔

2 ...... حصول آزادی میں نبوت وقت سے مدد لینی چاہئے تا کہ پروگرام اختراعی نہ رہے بلکہ الہامی ہو جائے اور قیادت وحی الٰہی کی قائم ہو۔

3 ...... پہلے اپنوں سے اتحاد اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ پھر غیروں سے بقدر حاجت اشتراک عمل مگر حدود وقیود شریعت میں رہ کر اور اس کا بصورت معاہدہ ہندو مسلم اعلان کر کے۔

4 ...... موجودہ صورت حال میں جنگ آزادی عدم تشدد سے لڑی جا سکتی ہے جس کے اسلحہ اخلاقی ہیں۔ ذکر اللہ، دعا، رجوع الی اللہ، استمداد باہمی واتحاد اور احتجاجی ومطالباتی جدوجہد، نیز مسلمانوں کی تنظیم۔

5 ...... باہمی اشتراک عمل میں شرکاء عمل کا عاقل وباخدا ہونا ضروری ہے، عاقل اور چالاک ہونا مضر ہے۔

6 ...... اس اخلاقی جنگ میں بحیثیت حزب اللہ اور فرستادۂ خدا کام کرنا چاہئے نہ کہ حظ نفس سے۔

7 ...... متسلط قوم سے خطاب میں نرمی برتنی چاہئے نہ کہ تشدد اور اظہار غیظ۔

8 ...... خطاب کنندہ قائدوں کا متواضع اور بے تکلف ہونا ضروری ہے جن کی نظر اپنی کمزوریوں اور عیوب پر بھی ہو اور متکبر یا رعونت ہونا مضر ہے۔

9 ...... قائدین کی جماعت کو متغلب قوم کے درباروں میں پہنچ کر اپنی اسلامی پوزیشن اور اپنی تحریک کی دینی پوزیشن علی الاعلان واضح کر دینی چاہئے۔

10 ...... آزادی کی طلب مذہب کے لئے کرنی چاہئے نہ کہ ترفہ وتنعم دنیوی کے لئے۔

---

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۵.

11 ...... آزادی خواہ ذمہ داروں کا عاقل وفہیم ہونا، دین سے متاثر ہونا اور دین دار ہونا ضروری ہے ورنہ مذہبی آزادی حاصل نہیں ہوگی۔ جو مقصود بالذات ہے بلکہ صرف قومی آزادی ملے گی جو مقصود اصلی نہیں ہے۔

12 ...... اپنوں کی اصلاح وتعمیر ان کی اخلاقی تربیت اور جزئیاتِ عمل کی تہذیب مسلم جماعتوں کی تقویم از بس ضروری ہے کہ ناتربیت یافتہ فوج بلآخر تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

13 ...... متسلط قوم کو بھی تبلیغِ دین ضروری اور تاحصولِ آزادی مسلسل ضروری ہے کہ اس سے نصرتِ غیبی اور ذمہ داریٔ حق تعالیٰ ہو جاتی ہے اور مطالبات کی جڑ مضبوط ہو جاتی ہے۔

14 ...... مصائبِ دنیا کی شکایت زبان پر نہ آنی چاہئے بلکہ عنوانِ مطالبات موانعِ دین کی شکایت ہونی چاہئے کیونکہ اسلام میں آزادی کی ضرورت صرف دین کے لئے ہے دنیا تابع محض ہے۔

15 ...... ہر مطالبہ اور احتجاج کی حجت قرآنی معجزہ یعنی کتاب وسنت کے براہین سے پیش کی جائے۔

16 ...... شرعی امارت اور دینی قیادت کا قیام ضروری ہے تاکہ قوم میں مرکزیت آ جائے۔ ایک مرجع الامر متشخص ہو کر پوری قوم کو بجائے تشتت وپراگندگی کے تعمیلِ شرائع میں یکسوئی نصیب ہو جائے اور قلوب میں تشویش کی جگہ سکون و طمانیت پیدا ہو سکے۔

17 ...... قائد علماء مفکر وبصیر، دانایانِ مسائل ودلائل، عارفانِ حوادث ووقائع مستند وجید اور ساتھ ہی صلحاء واتقیاء ہونے چاہئیں نہ کہ محض خطیب اور زعیم۔

18 ...... علماء مفکرین کی حیثیت اجتماعی کا وجود ضروری ہے جس کا رسمی نام جمعیت العلماء ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس کے اہلِ حل وعقد مستند علماء ہوں۔ رسمی یا متکلف علماء نہ ہوں جن کے سامنے آنے سے غیر شرعی چیزیں باور ہونے لگیں اور تلبیسِ حق بالباطل کا بازار گرم ہو جائے۔

19 ...... اس وقت جمعیت العلماء کا بڑا کام حقوقِ مسلمین کی غیر مشروط حفاظت اور آزادیٔ ملک کی غیر مشروط حمایت کرنا ہے۔

20 ...... ہر آزادی خواہ کی حمایت وہم نوائی کی جائے مگر اپنا پروگرام مستقل رکھا جائے۔ معاہدہ کے ساتھ غیر مسلم اقوام سے اشتراکِ عمل بحالاتِ موجودہ ضروری ہے۔ اس اشتراک سے وہ بھی اسلام سے قریب لائی جا سکتی ہیں۔ اپنے استقلال تام کی صورت میں سب ہمارے ساتھ ہوں گے اور ہم صرف خدا کے ساتھ، یہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم سب کے ساتھ ہوں اور ہمارے ساتھ کوئی نہ ہو۔

21 ...... حصولِ آزادی کی جدوجہد کے ساتھ نماز باجماعت کا اہتمام اشد ضروری ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو تحصیلِ آزادی کے لئے بھیجتے ہوئے فرمایا ﴿وَلَا تَنِيَا فِىْ ذِكْرِىْ﴾ ① "میرے ذکر میں

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۴۲۔ ② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔

سستی مت کرنا‘‘۔ اور ذکر اللہ کا فردِ کامل نماز ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ. ② ’’میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو اور اقامت صلوٰۃ کا جزءِ اعظم جماعت ہے۔ فَاِنَّ تَسْوِیَۃَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ. ① ’’جماعت کی صفوں کو سیدھا رکھنا اقامت صلوٰۃ میں سے ہے‘‘۔ اور ظاہر ہے کہ تسویہ صفوف بلا جماعت کے ناممکن ہے۔ اس لئے حصول آزادی کی جدوجہد کے وقت تعلق مع اللہ اور اکمل فردِ نماز باجماعت ناگزیر ہے تاکہ نصرت غیبی شامل حال رہے۔

22 ..... تبلیغی مساعی کی منظم طریق پر ضرورت ہے۔ تبلیغ دینی سیاسی پلیٹ فارموں سے ہونی چاہیے اور حکومت و رعایا کے کانوں میں مساوی طور پر اسلام کی آواز پہنچنی چاہئے جس سے دیانات کے ساتھ اسلامی قوانین وسیاسیات کو بھی اصولی طور پر کرسی نشینوں کے کانوں تک پہنچایا جائے تاکہ ان کے مقصد سے دشمنوں میں بھی ہمدردی پیدا ہونے کا راستہ پڑ جائے اور حصول مقصد دور نہ رہے۔ بہر حال یہ بائیس نکات ہیں جو تلاوت کردہ آیات سے مستنبط ہوتے ہیں جن میں غلامی کی قباحت وشناعت ازالۂ غلامی کی فرضیت طریق احتجاج ومطالبات اور اس کی نوعیت، آزادی کی برکات، حصولِ آزادی کی سعی، سعی میں خلوص وللّٰہیت۔

حصول آزادی کا پروگرام، دشمنانانِ آزادی کا انجام اور غلام وضعیف قوم کی کامیابی وغیرہ کے مہمات ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ میں نے اپنی ضعیف بساط کے مطابق یہ مضامین آیات بالا سے استنباط کر کے عرض کئے ہیں جن میں اصولی طور پر مسائل حاضرہ کی بحث بھی موقع بموقع آ گئی ہے مگر سیاسی زبان کی بجائے دینی اور قرآنی زبان میں آئی ہے اور یہ زبان سیاسی اور غیر سیاسی افراد کے لئے یکساں مقبول اور جاذب توجہ ہے۔ اہل تفکر اور اذکیاء علماء اس سے بہت زیادہ حقائق ان آیات سے نکال سکتے ہیں کہ آخر کلام الٰہی ہے جس کی گہرائیوں کی کوئی حد ونہایت نہیں ہو سکتی۔

سیاست شرعیہ کی عظمت...... میں نے کوشش کی ہے کہ آزادی کے پروگرام کے اجزاء صرف کتاب وسنت سے پیش کئے جائیں۔ میرے خیال میں جو شرعی راہنمائی سے قائم شدہ ہے ضروری ہے کہ کوئی بھی پروگرام عصری سیاست کے ذخیرہ اور اس سے اخذ کر کے نہ لیا جائے یہ پرفریب سیاست رد کرنے کے قابل ہے۔ جس نے دنیا کا امن وسکون برباد کر دیا ہے نہ کہ معمول بنانے کے لائق ہے۔ البتہ سمجھ لینے کے قابل ضرور ہے اس کو سمجھ کر پھر صرف شرعی سیاست سے ہمارے پروگراموں کا تعلق ہونا چاہیے جس سے اس پرمکر عصری سیاست کی ظلمت دور ہو سکے اور قلوب پر سے اس کا استیلاء اٹھ جائے، کیونکہ آج اس کی مخالفت کرنے والے بھی بوجہ اس کی شوکت کے وقیع اسی کو سمجھتے ہیں اور اسی میں خود اپنی شوکت بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے مزے لے کر اس کا ذکر اور اس کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ صرف کتاب وسنت کے منصوص پروگراموں سے ہی یہ عظمت زائل ہو کر حقیقی عظمت خدائی پروگراموں کی قائم ہو سکتی ہے۔

تعمیری سلسلہ کا پروگرام میں کافی تفصیل کے ساتھ اپنے خطبہ صدارت جمعیت العلماء صوبہ سندھ میں پیش کر

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب اقامۃ الصف من تمام الصلوۃ ج: ۳ ص: ۱۵۰.

چکا ہوں۔ اگر اس کی تمام دفعات ان ۴۲ نمبروں کے ساتھ شامل کر لی جائیں تو دفاعی اور تعمیری پروگرام کی تمام اہم اور بنیادی دفعات سامنے آ جائیں گی جو نصوص کتاب وسنت سے ماخوذ ہوں گی۔

بزرگان محترم! میں نے بہت سا وقت آپ کا لیا جس کی میں معذرت کرتا ہوں اور اس تمغۂ صدارت پر جو آپ حضرات کی ذرہ نوازی نے مجھے عطاء فرمایا ہے مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فَجَزَاكُمُ اللّٰهُ عَنَّا خَيْرَ الْجَزَآءِ ......

ہندوستان آزاد، اسلام زندہ باد، جمیت العلماء آباد۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

تکمیلِ انسانیت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـا وَسَنَدَنَـا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. اَمَّابَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ○ ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (1) صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

تقریبِ تکمیل ...... بزرگانِ محترم! یہ تقریب ہمارے عزیز محمد ازہر صاحب کے ختم قرآن شریف کے لئے ہو رہی ہے۔ اسی مجلس میں انہوں نے قرآن کریم ختم کیا اور اس میں دعاء کی گئی۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہمارے یہ عزیز قرآن شریف شروع کرنے کی ابتداء کر رہے تھے اور اس کے حفظ کا قصد تھا۔ یقیناً وہ بھی خوشی کا دن تھا جس میں انہوں نے قرآن کریم حفظ کرنے کا آغاز کیا۔ اور ایک آج کا دن ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں حافظ بنایا اور ان شاء اللہ "حافظ جید" بھی ہوں گے اور ان کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قاری مجود بھی ہوں گے۔ تو ایک ابتداء تھی اور ایک انتہا اور یہ دونوں چیزیں خوشی کی ہوتی ہیں۔

ابتداء اور تکمیل پر خوشی ...... ابتداء کی خوشی توقع کی بناء پر ہوتی ہے کہ ماں باپ بچے کو مکتب میں بٹھاتے ہیں اور خوشی کرتے ہیں مگر یہ خوشی توقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ پڑھے گا، چند دن بعد حفظ کریگا اور اس اس میں کمال پیدا کرے گا۔ غرض ابتداء میں امید کی بناء پر خوشی ہوتی ہے اور انتہاء میں تکمیل کی بناء پر خوشی ہوتی ہے کہ جو توقعات باندھی گئی تھیں وہ اللہ نے پوری فرما دی۔ اس لئے انتہائی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ تو ہر ابتداء بھی خوشی کی چیز ہے، اور پھر انتہاء بھی خوشی کی چیز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ابتداء میں خوشی توقع پر ہوتی ہے اور انتہا میں تکمیل پر ہوتی ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ تکمیل بہ نسبت توقع کے زیادہ خوشی کی چیز ہے اور توقع اور امید تو مبہم ہوتی ہے، پوری ہو یا نہ ہو، لیکن تکمیل کے معنی یہ ہیں کہ وہ ساری توقعات پوری ہو گئیں۔ تو وہ امید محض ہوتی ہے، یہ واقعہ ہوتا ہے، تو واقعہ پر

(1) پارہ: ۶ سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳.

جو خوشی ہوگی وہ یقیناً اس سے بڑھ کر ہوگی جو کسی توقع پر ہوتی ہے۔

تکمیل پسند امت...... ویسے بھی مسلمان کچھ تکمیل پسند واقع ہوا ہے۔اس لئے کہ دین ہی اس کا کامل ہے۔ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ① دین کی ابتداء تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور تکمیل وانتہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ہوئی۔

عالم بشریت کی طفولیت اور اس کا ابتدائی علم...... ابتداء کے وقت بالکل ابتدائی چیزیں تھیں، جو بچوں کے لئے ہوتی ہیں، بچے کا سب سے بڑا علم یہ ہوتا ہے کہ اسے کچھ چیزوں کے نام سکھلا دیئے جائیں۔یہ روٹی ہے،یہ لوٹا ہے،یہ زمین ہے،یہ آسمان ہے۔تو اگر بچے کو نام یاد ہو جائیں تو یہ اس کا سب سے بڑا علم ہوتا ہے اور علم کا پہلا درجہ بھی ''علم الاسماء ہی کا ہے کہ اشیاء کے نام معلوم ہوں۔اگر کسی چیز کا نام ہی معلوم نہ ہو تو وہ مجہول مطلق ہوتی ہے اس کی طلب ہی نہیں ہوسکتی۔غرض علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔اس کے بعد پھر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس اسم کا مسمّیٰ کون ہے۔اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔جب مسمّیٰ کی صورت دیکھ لی تو طبعاً جی چاہتا ہے کہ اب۔یہ معلوم ہو کہ اس مسمّیٰ کی خصوصیات کیا ہیں۔تو آدمی ان خصوصیات کا علم حاصل کرتا ہے۔جب وہ بھی حاصل ہوگیا تو پھر آگے یہ درجہ ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔تو پہلے اسم ہے اس کے بعد معانی مدلولہ ہیں۔اس کے بعد اس کے خواص اور آثار ہیں۔اس کے بعد اس کے حقائق ہیں۔اس طرح درجہ بدرجہ علم ترقی کرتا ہے۔ تو آدم علیہ السلام کے زمانے میں عالم بشریت کی طفولیت تھی۔انسانیت کے لڑکپن کا زمانہ تھا اور بچوں کا سب سے بڑا علم ناموں کا یاد کرانا ہے۔اس لئے آدم علیہ السلام پر جو وحی اتاری گئی اس میں زیادہ تر اسماء ہی تھے۔﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ② آدم علیہ السلام کو نام یاد کرا دیئے گئے۔ناموں کے کچھ مسمیات بتا دیئے گئے مسمّیٰ کی پہچان کرا دیا گیا۔تو علم کی ابتداء اسماء سے ہوئی حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے اتارے۔جیسے اس امت مرحومہ پر قرآن کریم کے تیس سپارے اتارے گئے۔تو تیس صحیفے اترے۔ان میں زیادہ تر رہائشی امور کی تعلیم تھی۔کھیتی یوں کرنی چاہئے۔باغ یوں لگانا چاہئے،کپڑا یوں بننا چاہئے۔لکڑی کا کام یوں ہونا چاہئے۔جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ ''آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ایک ہزار صنعتیں سکھلائیں۔وہ ان کی اولاد میں پھیلیں۔ہر طبقے نے اپنی مناسبت سے ایک صنعت اختیار کرلی۔کسی نے لکڑی کا کام کسی نے لوہے کا کام کسی نے تعمیر کا کام،کسی نے کھیتی باڑی کا،بنی آدم میں مختلف صنعتیں پھیل گئیں۔مگر سب کی سب وحی کے ذریعہ سے آئی ہیں۔

ابتدائی عبادت...... بہرحال آدم علیہ السلام پر تیس صحیفوں میں جو وحی کی گئی،اس میں زیادہ تر رہائشی امور تھے، حلال وحرام کے احکام فقہیہ بہت اقل قلیل تھے،اس لئے کہ بچوں کا ابتدائی علم ناموں ہی کا سکھلانا ہے،حلال وحرام زیادہ نہیں بتلاتے۔وہ تو معصومیت اور فطرت پر ہوتے ہیں۔حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد فطرت پر تھی،

---

① پارہ:٦،سورة المائدة،الآية:٣۔ ② پارہ:١،سورة البقرة،الآية:٣١۔

نیک اور صالح تھی۔ جو نام یاد کرا دیے گئے انکو پڑھ لینا یہی سب سے بڑی عبادت تھی۔

جب کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت شیث علیہ السلام کو کچھ اسماء کی تلقین کی کہ یہ پڑھا کرو۔ تو اس دور کی سب سے بڑی عبادت یہی تھی کہ اسماء خداوندی کو رٹا جائے اور بار بار پڑھا جائے۔ غرض ابتداء علم یہی تھا کہ ناموں کا علم ہو جائے اور اسماء معلوم ہو جائیں۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① اس پر شاہد ہے۔

عالم بشریت کا دوسرا دور اور اس کا علم ...... اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا۔ تو طبعی طور پر جذبہ ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس اسم کا مسمّٰی کیا ہے۔ یہ نام کس چیز پر صادق آتا ہے۔ اس کا مسمّٰی کون ہے اس کی طلب ہوتی ہے۔ تو آدم علیہ السلام نے تو ناموں کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کرائی اور نوح علیہ السلام نے مسمیات کے ذریعہ سے معرفت خداوندی کی طرف پہنچایا۔ چناں چہ فرمایا گیا۔ ﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ٥ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ٥ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ٥ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ٥ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ٥ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا﴾ ② ”زمین کو اللہ تعالیٰ نے پھیلایا۔ تمہیں اس طرح سے پیدا کیا جس طرح نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی“۔

تو حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اسماء سکھلائے گئے تھے، یہاں مسمیات سامنے رکھے گئے کہ ان کے ذریعے معرفت خداوندی حاصل کرو۔ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا تصور بندھتا ہے۔ اگر مصنوع بہت عمدہ ہو تو تعریف کی جاتی ہے کہ صناع بڑا کامل ہے۔ جس نے ایسی بڑی صنعت دکھلائی۔ تو آسمان اور زمین وہ چیزیں ہیں کہ بجز اللہ کے کوئی نہیں بنا سکتا۔ اس واسطے ان کی طرف متوجہ کیا گیا کہ انکے ذریعے سے صانع کو پہچانو کہ وہ، کیسا حکیم و خبیر ہے اور کیسا قادر مطلق اور قدیر علی الاطلاق ہے کہ جس نے آسمان کا خیمہ تان دیا اور زمین کا فرش بچھا دیا۔

آپ چھوٹا سا بھی ایک شامیانہ کھڑا کرتے ہیں تو بانس کے بیسیوں ستون لگاتے ہیں تا کہ وہ تھمے۔ مگر آسمان کا یہ اتنا بڑا خیمہ جسکی مسافت پانچ سو برس کی ہے۔ نہ اس کے نیچے کوئی بانس ہے نہ ٹیک ہے اور ہوا کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ تو وہ کتنا بڑا قادر ہے جس نے یہ خیمہ تان دیا۔ ﴿بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ ③ نہ کوئی ستون ہے نہ کوئی لکڑی۔ بہر حال نوح علیہ السلام نے اسماء کے بعد مسمیات کی طرف متوجہ کیا اور مسمیات کے ذریعے سے حق تعالیٰ کو پہچنوا دیا۔ معرفت خداوندی کرائی۔ اب گویا عالم بشریت کو نام بھی معلوم ہیں اور مسمیات بھی معلوم ہو گئے۔

عالم بشریت کا تیسرا دور اور اس کا علم ...... پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ تو اس درجے کے بعد اب طبعی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان مسمیات کے خواص کیا ہیں؟ انکے آثار کیا ہیں؟ یہ کیوں بنائے گئے؟ ان کی

① پارہ: ۱ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۲۹ سورۃ نوح، الآیۃ: ۱۵ تا ۲۰.

③ پارہ: ۲۱ سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۰.

غرض وغایت کیا ہے؟

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نفسیات کی طرف متوجہ کیا۔ نفوسِ فلکیہ، نفوسِ ارضیہ۔ اور ان کے ذریعے سے معرفت خداوندی کرائی۔ اس لئے کہ اسم اور مسمی تو معلوم ہو چکے تھے۔ اب تو خواص و آثار سامنے تھے۔ تو خواص و آثار کی طرف متوجہ کر کے انہیں معرفت خداوندی کی طرف بڑھایا۔

دورِ موسوی اور اس کا علم...... طبعی طور پر جذبہ یہ ہوتا ہے کہ نام یہ ہے، مسمی یہ ہے، خواص یہ ہیں ان کے استعمال کا طریقہ کیا ہو؟ کس طریقے سے استعمال کریں۔ ان کے احکام کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آ گیا اور تورات نازل ہوئی اور اس شان سے کہ ﴿تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾. ہر چیز کے احکام کی تفصیل بتلائی گئی کہ اسے یوں استعمال کرو، یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ غرض احکام کی تفصیل آ گئی۔

احکام کی حقیقت کا دور...... اب یہ کہ نام بھی معلوم ہو گیا، خاصیتیں بھی معلوم ہو گئیں اور احکام کا بھی پتہ چل گیا تو طبعی طور پر ذہن اس کی طرف جاتا ہے کہ احکام کی علت کیا ہے جس پر یہ چلتی ہیں؟ کیونکہ حکم کا تعلق بہر حال کسی حقیقت اور علت سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب علت سامنے آتی ہے تو فقط ایک ہی چیز کا حکم معلوم نہیں ہوتا، جہاں جہاں وہ علت پائی جائے گی احکام معلوم ہوتے رہیں گے۔ تو ایک علت سے سینکڑوں ابواب کے احکام سامنے آ جاتے ہیں۔

دورِ نبوی (علیہ السلام) اجتہادِ انسانیت کا دور...... پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آ گیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفاصیل ارشاد فرمائیں کہ ہر حکم کے نیچے حکمت، ہر حکمت کے نیچے علت ہر علت کے نیچے ایک حقیقت، اور ہر حقیقت کے نیچے ایک صفت خداوندی جس سے اس علت اور حقیقت کا رابطہ ہے۔ تو علمی طور پر گویا بنی آدم اس قابل بن گئے کہ حق تعالیٰ تک پہنچ سکیں۔ صورت دکھلانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ مسمیات پہچانے جائیں۔ وہ تو پہچان چکے تھے۔ اس طرح نام بتلانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ وہ معلوم ہو چکے تھے۔ زیادہ احکام بتلانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو چکے تھے۔ علل احکام بتلانے کی ضرورت تھی تاکہ یہ امت مجتہد بنے اس امت کے اندر یہ قوت پیدا ہو کہ اس ایک علت سے ہزاروں چیزوں کے احکام نکالے اور یہ اس لئے کہ ختم نبوت کا دور ہے کوئی نبی آنے والا نہیں۔ کوئی نئی شریعت آنے والی نہیں۔ تو اس امت کے علماء کو یہ قوت دی گئی کہ قیامت تک کے حوادث کا فیصلہ اسی قرآن کریم سے کریں۔ انہی اصول وکلیات اور انہی علل سے اور انہیں حقائق سے فیصلہ کریں۔ چودہ سو برس گذر گئے ہیں اور امت فیصلے کرتی آ رہی ہے، ہر صدی میں نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں نت نئے حوادث سامنے آتے ہیں، لیکن کبھی امت میں عجز پیدا نہیں ہوتا، اسی قرآن مجید، اسی حدیث، اسی فقہ سے احکام نکلتے چلے آتے ہیں، انہی علل سے احکام کا استخراج کیا جاتا ہے۔ تو یہ مجتہدین کی امت ہے۔

امت محمدیہ میں آثارِ نبوت...... اور جیسا کہ بعض روایات میں فرمایا گیا: عُلَمَآءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَآءِ بَنِيْٓ اِسْرَآءِ

یَسْـلَ. ① گو اس روایت کی سند میں کچھ کلام کیا گیا ہے، مگر باوجود اس کے علماء اس سے استدلال واستشہاد کرتے ہیں کہ سنداً گو یہ روایت کچھ ضعیف ہو مگر اس مضمون کی دوسری روایتیں بھی ہیں۔ اگرچہ عنوان بدلا ہوا ہو۔ اس لئے مضمون کی حیثیت متواتر ہے، گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہو، ایک حدیث سند کے لحاظ سے اگر ضعیف بھی ہو مگر اس معادل دوسری چیزیں مل جائیں تو درجہ حسن پر پہنچ ہی جاتی ہے، بہر حال سند کچھ ضعیف بھی سہی مگر معنیٰ ضعیف نہیں ہے تو امت کے علماء نبی تو نہیں ہیں۔ مگر کام وہ کیا جو نبیوں کا ہوتا ہے۔ جہاں ایک بھی عالم بیٹھ گیا، ہزاروں کو ایمان اور معرفت سے رنگ دیا۔

ایک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں پیدا ہوئے، ان کے علمی آثار کوفہ سے خراسان اور ایران کی طرف پہنچے اور ایران سے افغانستان کی طرف اور افغانستان سے ہندوستان کی طرف۔ تو ہندوستان، افغانستان کی اکثریت حنفی ہے، حتی کہ شام کی اکثریت بھی حنفی ہے، آپ کی فقہ وہاں پہنچی اور اس فقہ نے ان ممالک کی اکثریت کو اپنے ذوق میں رنگ دیا اور لاکھوں کروڑوں حنفی بنے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک امام حق اور امام مجتہد ہیں، آپ کی پیدائش مصر میں ہوئی اور حجاز میں زیادہ تر قیام ہوا ہے، تو حجاز کی اکثریت شوافع ہے، مصر کی اکثریت شافعی ہے۔ پھر وفات بھی مصر میں ہی ہوئی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دار الہجرۃ ہیں۔ تو عرب کے جو مغربی قطعات ہیں، وہ اکثر وبیشتر مالکی ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نجد اور یمن میں قیام ہوا ہے، تو وہاں اکثریت حنبلیوں کی ہے۔ غرض ایک عالم ربانی بھی جہاں پہنچ گیا، لاکھوں کے اندر ایمان کا نور پیدا کر دیا۔ لاکھوں کو ایمان میں رنگ دیا تو: عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ. ایک نبی کی ذات بابرکات آتی ہے تو امتیں بن جاتی ہیں، لاکھوں، کروڑوں کو ایمان نصیب ہوتا ہے۔ اس دور میں چونکہ نبوت نہیں رہی تھی، تو علماء کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام بنا دیا گیا، یہ وہ کام کریں جو انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ وہ انہی کی طرز پر تبلیغ کریں۔ وہی تربیت ہو۔ وہی تعلیم ہو۔ وہی تزکیہ نفوس ہو۔ اس طرح سے ان علماء اور مشائخ ربانی نے کام کیا اور صحیح معنی میں اپنے پیغمبر علیہ السلام کا قائم مقام بن کر دکھلایا۔

شرائع اصلیہ اور وضعیہ...... علم کے ساتھ قرنِ اول میں ظاہر بات ہے کہ ساری جزئیات تو نہیں آئی تھیں۔ ہزاروں حوادث بعد میں پیدا ہوئے مگر علل وکلیات کی صورت میں احکام موجود ہیں اور وہ منصوص ہی کے حکم میں ہیں۔ تو یہ امت گویا مجتہدین کی امت ہے۔ جس کو علماء نے دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا کہ: ''ایک شرائع اصلیہ ہیں وہ وہ ہیں جو قرآن وحدیث میں حضور علیہ السلام کے قلب مبارک پر نازل ہوئیں۔ اور ایک شرائع وضعیہ ہیں کہ ان شرائع اصلیہ سے احکام نکال نکال کر فقہ مرتب کر دیا گیا۔ کتابیں مدون ہو گئیں، ہزاروں کتابیں لکھی گئیں وہ کتاب وسنت ہی سے نکلے ہوئے احکام ہیں۔ معاذ اللہ کوئی مجتہدین کا ذاتی اختراع تھوڑا ہی ہے''۔

① حافظ سیوطی فرماتے ہیں: لا اصل له دیکھئے: الدرر المنتثرة في الأحاديث المشتهرة، حرف العلماء ص: ۱۳.

انہوں نے اصول سے احکام کا استنباط کیا۔ تو وہ بھی درحقیقت کتاب وسنت ہی کے احکام ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مجتہد کا ذہن پہنچتا ہے۔ ہمارا اور آپ کا نہیں پہنچتا، ہم سوائے اس کے کہ ان کا اتباع کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ ان کی تقلید کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

تو اصل میں ان حضرات نے کتاب وسنت سے علوم اخذ کئے اور دین کو باغ وبہار بنایا، ابواب مرتب ہوئے، فصول مرتب ہوئیں اور ان فنون پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ فقہ مرتب ہوا تو ہزار ہا کتابیں فقہ میں آ گئیں، اصول فقہ مرتب ہوئے تو وہ ایک مستقل فن ہو گیا۔ اس طرح سے علم در علم اور شاخ در شاخ ہوتے ہوئے عالم کے اندر علم پھیلا تو جو شان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہے کہ وہ اللہ سے علم حاصل کر کے مخلوق کو دیتے ہیں۔ وہی شان مجتہدین کی ہے کہ وہ پیغمبر علیہ السلام سے علم حاصل کر کے امتوں کو بانٹ رہے ہیں۔

عالم بشریت کا شباب ...... میں نے اس پر عرض کیا کہ علم کا ابتدائی درجہ "علم الاسماء" تھا۔ یہ عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب مراہقت کا زمانہ آیا جو حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ تھا تو "مسمیات" کا دور آ گیا۔ اور پھر بیچ میں شباب آ گیا تو حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام مبعوث ہوئے۔ اس وقت عمر بھی زیادہ قد وقامت بھی زیادہ، قوم عاد پر جب عذاب آیا اور وہ ہوا سے پچھڑ پچھڑ کر گرے ہیں تو فرمایا گیا ﴿كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ﴾.①

اتنے لمبے لمبے قد جیسے کھجوروں کے تنے ہوتے ہیں۔ ہزار ہزار۔ ڈیڑھ ہزار برس کی عمر ہے۔ ہم اور آپ ایک ایک مکان بناتے ہیں۔ تو سو دو سو برس میں ہماری کئی نسلیں اس میں گذرتی ہیں اور وہاں تین سو برس۔ چار سو برس گذرے مکان گر گیا، پھر مکان بنایا، پھر چار سو برس کی عمر ہوئی پھر مکان بنایا، تو ایک ہی آدمی چار چار دفعہ مکان بناتا تھا۔ کیونکہ عمر ہی ڈیڑھ ہزار برس کی ہوتی تھی۔ تو مکانات بھی تنے تنے بنتے تھے۔ بہرحال عمریں بھی زیادہ تھیں۔ تو یوں کہنا چاہئے کہ: حضرت آدم علیہ السلام کا زمانہ تو عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ ہے اور عاد وثمود کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہے۔

جوانوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ پنجے لڑا رہے ہیں۔ اکھاڑے کر رہے ہیں، کشتیاں کر رہے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے کہ: مجھ سے طاقت میں کون زیادہ ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ: میں تجھ سے طاقت میں زیادہ ہوں۔ یہی ان قوموں کی حالت تھی: ﴿مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ "ہم سے زیادہ کون قوی ہے"؟۔ اور ان کے کام دیکھو تو جنات جیسے۔ فرمایا گیا: ﴿وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا﴾ ② "پہاڑوں کو تراش تراش کر بلڈنگیں بناتے تھے"۔ دنیا کی بلڈنگیں نیچے سے اوپر کو چلتی ہیں۔ وہ اوپر سے بناتے ہوئے نیچے لاتے، پہاڑوں کو کھود کھود کے اور تراش تراش کے بلڈنگیں تیار کیں، بہرحال یہ جوانی کا زمانہ ہے کام وہ کئے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الحاقۃ، الآیۃ: ۷۔ ② پارہ: ۸، سورۃ اعراف، الآیۃ: ۷۴۔

عالم بشریت کی طفولیت کے لئے اندازِ تعلیم ......اور ظاہر بات ہے بچوں کے سامنے، اگر وہ بدشوقی اختیار کریں، تو کچھ پیار کرتے ہیں، کچھ ترغیب دیتے ہیں کہ مٹھائی کھلائیں گے، پیسے دیں گے تو بچہ تعلیم میں لگ جاتا ہے، تو کھیل کود کے اسباب سامنے زیادہ رکھتے ہیں تاکہ بچہ متوجہ ہو جائے۔ تو آدم علیہ السلام کے جو صحیفے تھے تو اس میں صنائع و حرفت کی تعلیم تھی کہ دنیا کی چیزیں یوں بناؤ۔ تو دنیا کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ﴾ ①

یہ دنیا تو کھیل کود ہی ہے۔ تو کھلونے زیادہ سے زیادہ دیئے گئے تاکہ ان کا دل راغب ہو اور اس راستہ سے علم کا راستہ دکھلا دیا گیا۔ یہ گویا حکمت تربیت ہے کہ اس مزاج سے اللہ تک پہنچا دیا جائے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ تم پہلے جوان ہو، تب اللہ تک پہنچو گے بلکہ طفولیت ہی میں اللہ تک پہنچنے کا راستہ دکھلا دیا گیا۔ تو مربی کامل وہی ہے کہ انسان جس حالت میں ہے۔ اسی حالت کو وصول الی اللہ کا ذریعہ بنا دے۔

مولانا محسن کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالم اور شاعر بھی بہت بڑے گذرے ہیں اور نعت میں ان کے اشعار واقعی بڑے عالمانہ اور اونچے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ہر سال پتنگ بازی کا ایک موسم آتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور بڑے بڑے اُمراء کنکے اُڑا رہے ہیں اور کنکوں کے پیچ ہو رہے ہیں کہ دوسرے کے مانجے کو کاٹا تو انہوں نے کہا کہ وہ جیت گیا۔ تو ہار جیت ہوتی تھی۔ پیچ ہوتے تھے۔ ہوا میں پتنگ اُڑاتے تھے۔ تو مولانا محسن کہتے ہیں کہ ہمارا بچپن تھا تو ہمیں پتنگ اُڑانے کا شوق تھا مگر یہ پتنگ بازی علماء کے گھرانوں کی شان کے مناسب نہیں تھی۔ اس لئے والد ماجد نے روکا بھی مگر اس میں سے اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا راستہ نکال دیا۔ چنانچہ فرمایا: ''تم چاہتے ہو کہ تم جیت جاؤ اور تم دوسرے کے مانجے کو کاٹ دو؟ انہوں نے کہا جی! یہ چاہتے ہیں۔ فرمایا اس کی تدبیر میں تم کو بتلائے دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ رات کو اخیر شب میں اٹھ کر بیٹھو تو چار رکعات پڑھو اور اس کے بعد قُلْ ھُوَ اللّٰہُ پڑھ کر مانجا سوتتے رہو اور اللہ کا نام لیتے رہو۔ پھر جوڑ و گے تو تم ہی جیت جاؤ گے۔

مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ: اب ہم اخیر شب میں اٹھتے وضو کرتے، نماز پڑھتے، قل ہو اللہ پڑھ کر مانجا سوتتے۔ اب جو صبح پیچ ہوتا۔ اکثر کامیاب ہو جاتے۔ فرمانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ جوان ہونے کے بعد پتنگ بازی تو چھوٹ گئی۔ مگر تہجد باقی رہ گیا۔ اور معرفت باقی رہ گئی۔ غرض یہ ایک تدبیر تھی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ: جب تم بڑے ہو گے تو تم خدا کو پہچانو گے۔ نہیں بلکہ لڑکپن ہی کی نفسیات اور کیفیات سے تم اللہ کو پہچانو۔ تو اس راستے پر ڈال دیا۔

اسی طرح سے آدم علیہ السلام کے زمانے میں اسماء کے ذریعے اللہ تک پہنچایا گیا اور نوح علیہ السلام کے زمانے میں حسیات کے ذریعے پہنچایا۔ قوم عاد اور قوم ثمود جوان قومیں تھیں۔ ان کو ان کی قوت کے راستے سے پہنچایا۔

عالم بشریت کے شباب کے لئے اندازِ تعلیم ......یہ قاعدے کی بات ہے کہ بچہ اگر بدشوقی دکھلائے تو ایک

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۳۶.

آدھ تھپڑ مار دیا۔ کچھ ترغیب دیدی۔ لیکن اگر جوان آدمی سستی دکھلائے تو استاذ صبر نہیں کرسکتا بخت سزا دیتا ہے کہ جب جوانی میں کام نہیں کیا تو کیا بڑھاپے میں کام کرو گے؟ جوانی اور مانجا ڈھیلا۔؟

تو اس عمر میں پیار وغیرہ زیادہ نہیں کرتے۔ ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے کہ پھر تمہارے کام کرنے کی کونسی عمر آئے گی۔؟ تو قوم عاد اور ثمود نے جب سرکشی دکھلائی تو یہ نہیں کہ انہیں کھیل کھلونے دیئے گئے ہوں۔ بلکہ آندھی مسلط کی گئی اور ہوا سے تباہ کیا گیا۔ قوم ثمود کو چنگھاڑ سے تباہ کیا گیا کہ جوان ہو کر جب عمل نہیں کرو گے تو کیا عمل کرنے کے لئے بڑھاپے کا زمانہ آئے گا؟ اس واسطے جوانوں پر ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے۔ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ زیادہ نہیں ہوتی۔ انہیں ترغیبات زیادہ دیتے ہیں اس لئے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

عالم بشریت کا بڑھاپا قوت فکریہ کا ازدیاد...... درجہ بدرجہ یہاں تک کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آیا۔ تو عالم بشریت کے بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ گویا بنی آدم ضعیف ہو چکے ہیں۔ نہ وہ قد وقامت رہے نہ ہی وہ عمریں رہیں نہ وہ طاقتیں رہیں جو پچھلوں میں تھیں۔ مگر بوڑھے آدمی کا دماغ تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ عقل بڑی ہوتی ہے اگرچہ کام کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن جوانوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ اس لئے کہ وہ زمانے کے گرم اور سرد سے گزر چکے ہیں اور تجربات ان کے سامنے ہیں۔ تو جوانوں کا کام یہ ہے کہ وہ علم میں لگیں لیکن جب رکاوٹ پیش آئے تو بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ وہ کام کی بات بتائیں گے۔

بڑھاپے میں علم کی وُسعت...... وہ کہتے ہیں کہ کہیں بارات گئی اور بارات میں سو دو سو آدمی تھے۔ جس گھر میں گئی وہ بہت کھاتا پیتا گھرانہ تھا تو انہوں نے یہ شرط لگائی کہ بارات جو آئے تو اس میں کوئی بوڑھا ساتھ نہ ہو۔ سارے جوان ہوں۔

دولہے والوں کے ہاں مشورہ ہوا کہ بڑا بوڑھا ساتھ نہ ہو اور کوئی مشکل آن پڑی تو مشورہ کون دے گا؟ تو بوڑھے کو ڈھول میں بند کر کے لے گئے تاکہ ان کی بات کا بھی خلاف نہ ہو اور بوڑھا بھی پہنچ جائے۔

بارات جب پہنچی تو صاحب خانہ نے کہا کہ لڑکی تو دی جائے گی مگر۔ شرط یہ ہے کہ ہر آدمی کے سامنے ایک بکرا قتل کر کر کھا جائے گا اور وہ اس کو پورا کھانا پڑے گا۔ اگر نہ کھا سکیں تو ہم بیٹی نہیں بیاہیں گے۔

اب یہ بے چارہ پریشان ہوئے کہ اتنا معدہ کس کا ہے کہ پورا بکرا اپنے اندر اتار لے۔ تو انہوں نے کہا کہ بھئی! سوچ کر جواب دیں گے، تو ڈھول والے کے پاس پہنچے اور بڑے میاں کو ڈھول میں سے نکالا اور کہا کہ شرط لگائی ہے کہ ایک آدمی ایک بکرا کھائے۔ ہم میں تو اس کی طاقت ہے نہیں۔ اگر شرط رد کرتے ہیں تو پھر نکاح نہیں ہوگا۔ مانتے ہیں تو ہم میں طاقت نہیں۔

بڑے میاں نے کہا کہ تم مان لو اور ان سے کہو کہ ایک ایک کر کے قتل کر دیتے جائیں۔ اب جونہی ایک بکرا آتا تو وہ ساری بارات میں بوٹی بوٹی آتی اور بکرا ختم ہو جاتا۔ اس طرح کر کے بڑے میاں کے مشورہ سے ان

کی شرط بھی پوری ہوئی اور بارات دلہن لے کر واپس ہوئی۔

بوڑھی اُمت پر بارِ عمل کی کمی...... یہ اُمت بوڑھی ہوگئی ہے۔اس واسطے عملی طاقت تو اگرچہ گھٹ گئی مگر دماغی اور قلبی طاقت بڑھ گئی، تجربات وسیع ہو گئے دنیا کی امتوں کے احوال قرآن وحدیث کے ذریعے سے اس کے سامنے ہیں۔تو یہ امت عالم بھی ہے اور مجتہد بھی اور تجربہ کار بھی ہے۔بڑے بوڑھوں کا یہی کام ہوتا ہے کہ عملی بات تو ان پر ڈالی نہیں جاتی۔ان کے ذمہ معمولی کام لگایا جاتا ہے مگران کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے کہ بڑے میاں نے بڑا کام کیا۔

چناں چہ اگر شادی بیاہ ہو تو دیگ کے اوپر بڑے میاں کو بٹھا دیتے ہیں۔آپ نگرانی فرماتے ہیں۔جوان آدمی کھانا لے جارہے ہیں۔رکھ رہے ہیں، مگر بڑے میاں بیٹھے ہوئے ہیں اور شام کو کہتے ہیں کہ: "صاحب! بڑے میاں کی حکمت کا کیا ٹھکانہ ہے۔صبح سے شام تک نگرانی فرمائی۔حالانکہ بڑے میاں نے کیا کیا بیٹھے ہی تو رہے۔ کوئی حرکت تو نہیں کی"۔

مگر بڑی تحسین کرتے ہیں کہ بڑے میاں کی ہمت ایسی تو بڑے بوڑھوں کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے۔عمل کا بار کم کر دیا گیا۔وہ پچھلی امتوں میں سلاسل اور اغلال تھے، نہایت شاق شاق ریاضتیں اور نہایت محنت کے اعمال، وہ ختم کر کے بہت سہل اعمال دیئے گئے اور تحسین زیادہ کی گئی کہ ایک عمل کرو گے تو دس نیکیوں کا ثواب اور دس کے بعد سات سو تک۔اور: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ "اور اللہ جتنا چاہے اجر بڑھا دے"۔غرض اجر اور بڑھا دیا تحسین بڑھادی مگر عمل کا بار گھٹا دیا ہے، اس لئے کہ اُمت بوڑھی ہو چکی تھی۔تو عمل کا بار بہت کم اور اجر بہت ہی زیادہ۔

تکمیلِ دین...... بہر حال مطلب یہ کہ درجہ بدرجہ عالم بشریت نے ترقی کی تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ابتداء ہوئی اور یہ انتہا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئی۔اس وقت تو قعات تھیں کہ امتیں بڑھیں گی اور اس دور میں آ کر وہ توقعات عملی شکلوں میں آ گئیں کہ امت کامل ہوگئی۔﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ ① دین کامل کر دیا گیا۔بلحاظ عقائد کے بھی، بلحاظ اخلاق کے بھی، بلحاظ اعمال کے بھی اور بلحاظ احوال وسُنن کے بھی۔تو ہر حیثیت سے اس اُمت کی تکمیل کی گئی۔یوں دین کامل ہوا۔

انتہاء زیادہ خوشی کی چیز...... تو میں شروع میں عرض کر رہا تھا کہ: یہ امت تکمیل پسند ہے۔اس لئے کہ اس کے اندر تکمیل پسندی کا جذبہ ہے، اس لئے اس کو ابتداء سے زیادہ انتہا پر خوشی ہوتی ہے۔اس لئے کہ وہ وقت تکمیل کا ہوتا ہے۔گو ابتداء اور انتہا دونوں ہی خوشی کی چیزیں ہیں۔جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت مٹھائی بانٹتے ہیں۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب انتقال ہو تو انتہائی خوشی کریں کہ بھائی! آج تکمیل ہوگئی! گویا کتنا خوشی کا وقت ہے۔مگر آپ کہیں گے اس وقت تو کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔سارے بیٹھ کر روتے ہیں۔لیکن چونکہ تکمیل کو پہنچ گیا تو خوش ہونا چاہئے۔

---

① پارہ: ٦ سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٣۔

میں کہتا ہوں کہ موت پر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ انتقال پر کوئی خوش نہیں ہوتا بلکہ موت اگر اچھی ہوتی تو سب کہا کرتے ہیں کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت کوئی رونے کی ایسی چیز ہوتی تو یہ دعائیں کیوں کرتے کہ ایسی موت ہمیں بھی نصیب ہو جائے۔ اللہ کے راستے میں کوئی شہید ہوا۔ کہتے ہیں بڑے رتبے کی چیز ہے۔ اللہ ہمیں بھی ایسی موت نصیب کرے۔ معلوم ہوا موت غم کی چیز نہیں۔ موت تو خوشی کی چیز ہے۔ غم اپنے عزیز کی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے ہمارا عزیز جدا ہو گیا۔ اس کے فیض سے محروم ہو گئے۔ اس کے انتقال کا صدمہ نہیں ہوتا، انتقال سے تو وہ اللہ تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی صدمہ کی چیز ہے، ایک آدمی خدا سے جاملا، یہ کون سی رونے کی بات ہے، یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ عمر جس کام کے لئے رکھی گئی تھی آج وہ کام پورا ہو گیا کہ وہ اللہ تک پہنچ گیا۔

اس بات کو حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ. ① سب سے بڑا تحفہ مومن کے لئے موت ہے۔ اور کیوں ہے؟ اس لئے ہے کہ: إِنَّ الْمَوْتَ جِسْرٌ يَصِلُ الْحَبِيْبَ إِلَى الْحَبِيْبِ. ②

موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے محبوب حقیقی سے جاملتا ہے، تو محبوب سے کسی عاشق کا مل جانا، یہ غم کی چیز تھوڑا ہی ہوتا ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے۔ آپ روتے ہیں اس لئے کہ ایک عزیز جدا ہو گیا۔ تو جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ چونکہ ایک وقت میں دو چیزیں ہیں تو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ موت پہ رو رہے ہیں۔ موت پر کوئی نہیں روتا وہ تو تحفہ ہے۔

تمنائے انتہاء...... یہی وجہ ہے کہ موت حقیقت میں ولایت کی علامت ہے۔ جتنے اولیاء ہیں وہ موت کی تمنا رکھتے ہیں۔ فساق و فجار موت سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی امیدیں سامنے نہیں آ رہیں۔ اولیاء کرام اور ربانی لوگ وہ تمنا میں رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

کون سی مبارک گھڑی ہوگی جو اس اجڑے دیار کو ہم چھوڑیں گے اور اس شہر مطلوب میں ہم پہنچیں گے جس کا اللہ نے وعدہ دیا ہے۔

تو موت کی تمنا علامت ولایت ہے اس لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ إِلٰى مَنْ يَعْلَمُ أَنِّيْ رَسُوْلُكَ. ③ ''اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول و نبی ہونے کا قائل ہو''۔ جس حدیث میں موت کی تمنا سے ممانعت کی گئی ہے۔ وہ اس لئے کہ دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرے، اللہ کی ملاقات کے شوق میں جو تمنا مطلوب ہے، اس کا حکم دیا گیا ہے:

یوم تکمیل کا انتخاب...... اس امت کے مزاج میں چونکہ تکمیل پسندی ہے۔ تو سید الایام کے انتخاب میں امم کے

---

② تخریج گذر چکی ہے۔ ③ تخریج گذر چکی ہے۔ ① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۳ ص: ۴۷۸، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۳۰۹.

امتحان کے وقت اس امت نے اپنی عبادت کے لئے یوم تکمیل خلائق یعنی جمعہ کو پسند کیا۔ یہود نے ہفتہ کو اختیار کیا اور نصاریٰ نے اتوار کو، مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں جو منتخب دن تھا وہ یوم جمعہ تھا جو یوم تکمیل ہے اور وہ اس امت مسلمہ نے پسند کیا۔ حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق عصر اور مغرب کے درمیان ہوئی۔ اس سے پہلے نظام بنا دیا گیا تھا، گھر بار سجا دیا گیا تھا۔ ضرورت مہیا کر دی گئیں تھیں، کھانا، دانا پانی غذا وغیرہ سب چیزیں زمین میں پھیلا دی گئی تھیں۔ اخیر میں مہمان کو لایا گیا۔ اور اسی پر تخلیق کی تکمیل ہوگئی۔ غرض اس امت نے یوم تکمیل کو پسند کیا۔ اس لئے کہ تکمیل پسند تھی تو دن بھی وہ اختیار کیا جس میں کمال تھا۔

ایک درجہ میں تکمیل اور ایک درجہ میں آغاز...... بہرحال بات دور جاتی ہے، تو ابتدا بھی خوشی کی چیز اور انتہاء بھی خوشی کی چیز۔ تو بحمد اللہ ہمارے عزیز محمد ازہر نے قرآن کریم ختم کیا تو یہ یوم تکمیل ہے، جس وقت یہ شروع کر رہے تھے تو اساتذہ کرام نے ماں باپ نے امیدیں باندھی تھیں کہ انشاء اللہ حافظ ہوگا۔ توقع ہے کہ وہ حافظ ہو جائے۔ آج وہ توقع پوری ہوگئی۔ یہ انتہائی خوشی کا دن ہے۔

بہرحال آج یہ تقریب ہے اور تقریب خوشی کی ہے اور خوشی بھی تکمیل کی ہے آغاز اور ابتداء کی نہیں بلکہ حدِ کمال پر پہنچ جانے کی ہے۔ تو ان کے لئے دعا ہے کہ حق تعالیٰ انہیں حافظ جید بنائے اور قاری مجود بنائے۔ عالم باعمل بنائے، صاحب اخلاق وسعی و تقی و نقی بنائے اور وہ ساری امیدیں پوری ہوں جو ماں باپ اور اساتذہ کرام نے باندھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ ان چیزوں کو بھی اسی طرح سے مکمل فرمادے جس طرح سے قرآن شریف کے حفظ کو آج انہوں نے مکمل کر دیا۔

آج اس کے الفاظ ان کے سینے میں جمع ہوگئے، کل کو انشاء اللہ اس کے معانی جمع ہوں گے، معانی کے بعد اس کے حقائق جمع ہوں گے، حقائق کے بعد ان کی علل آئیں گی، علل کے بعد پھر اسرار و مصالح اور حکم بھی منکشف ہوں گی۔ تو اس طرح علم بڑھے گا۔ غرض ایک درجہ میں یہ آغاز ہے یعنی معانی سمجھنے کے لئے اور ایک درجے میں یہ تکمیل ہے یعنی الفاظ کے حفظ کی۔

علوم و شخصیات کے مراتب...... تو الفاظ سینے میں آگئے اور قرآن کریم دو ہی چیزوں کے مجموعے کا نام ہے نہ محض الفاظ کا نام قرآن ہے اور نہ محض معانی کا نام۔ بلکہ الفاظ مع المعانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ اس میں الفاظ یاد کئے جاتے ہیں اور معانی سمجھے جاتے ہیں، تو ایک میں قوت حافظہ کام کرتی ہے، ایک میں قوت عاقلہ کام کرتی ہے، تو قوت حافظہ کا کام یہ ہے کہ الفاظ بعینہ اپنے اندر محفوظ کر لے اور قوت عاقلہ کا کام یہ ہے کہ ان الفاظ کے اندر سے معانی نکالے اور معانی کے بھی اندر سے معانی نکالے۔ اس لئے کہ قرآن تو ایک سمندر ہے۔ معانی در معانی اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔

حرف حرفش را چند در معنی ـــ معنی در معنی در معنی

ابتداء میں ایک لفظ ہے جو قشر کی مانند ہے اور مغز اس کے معنی ہیں۔ پھر معنی بھی قشر کی طرح سے ہے، اس کے اندر اور معنی ہیں، پھر وہ بھی قشر کی طرح سے ہے، اس کے اندر اور معانی ہیں۔ غرض جیسے علوم کے مراتب ہیں ایسے ہی حق تعالٰی نے شخصیات کے بھی مراتب قائم کئے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ الفاظ کے فقط مدلول کو سمجھ لیتا ہے وہ بھی اونچے درجے کا آدمی ہے، ایک یہ کہ مدلول سے آگے بڑھ کر وہ حقائق تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سے اونچا عالم ہے، اور ایک وہ ہے کہ حقائق کے بعد علل واسرار کو بھی سمجھتا ہے وہ اور بھی اونچے درجے کا عالم ہے تو جیسے آیات قرآنیہ میں مراتب ہیں ایسے ہی شخصیات میں بھی مراتب ہیں، ایک لفظوں کا عالم، ایک معانی کا عالم، ایک علل واسرار کا عالم، پھر سینکڑوں قرآن کریم کے علوم ہیں جن کا آدمی عالم بنتا ہے۔

غرض یہ ایک خوشی کا دن ہے۔ کہ ہمارے ایک عزیز کے قرآن کریم کے حفظ کی تکمیل ہوگئی۔ اس کے بعد حفظ معنی کا درجہ شروع ہوگا۔ اب ہم دعا کریں گے کہ اللہ تعالٰی انہیں معانی کا عالم بھی بنائے۔ پھر یہ دعا کریں گے کہ اللہ تعالٰی ان کے اندر نفسِ مزکی بھی پیدا کرے تا کہ حقائق اور علوم ومعارف ان پر کھلیں۔

تبریک..... بہر حال اس خوشی کے موقع پر میں ان الفاظ کے ساتھ ان کی خدمت میں ان کے والدین اور ان کے اساتذہ کرام کی خدمت میں "مبارک باد" پیش کرتا ہوں۔

حسنِ طلب نہیں بیانِ واقعہ..... مگر بھی ہمارے ہاں تو یہ دستور ہے کہ جب مبارک باد ہوتی ہے تو منہ میٹھا ضرور کراتے ہیں۔ فقط چائے پر ٹرخا دینا یہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے منہ میٹھا ہونا چاہئے۔ بلکہ پہلے ہونا چاہئے تھا۔ میٹھے منہ سے جو دعا نکلتی ہے اس میں چپک زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ منہ میٹھا کرایا جائے تا کہ دعا جا کے اچھی طرح چپکے۔ اور یہ حسنِ طلب نہیں بلکہ بیانِ واقعہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے کہنے سے ایسا کریں۔ بلکہ یہ دستور ہے۔ اب اللہ تعالٰی جس کو توفیق دے وہ اس کا درجہ ہے۔ بہر حال ہمارا کام تو یہ ہے کہ جب حاضری ہوئی تو مبارک پیش کریں اور خوشی کا اظہار کریں۔ حق تعالٰی شانہ ان جیسے اور بھی حفاظ اس مدرسے سے پیدا کرے۔

حُسنِ نیت کے ثمرات..... ہمارے بھائی مولانا (محمد یوسف) بنوری مرحوم، جس خلوص سے انہوں نے یہ ادارہ قائم کیا اور جس ضبط ونظم اور منظم طریق پر اسے چلایا اور بہترین قواعد واصول بنائے یہ حقیقت میں ان کی نیت کے ثمرات ہیں جو سامنے آرہے ہیں۔ بلڈنگیں کھڑی ہوئی ہیں۔ نظم بنا ہوا ہے علماء وطلباء جمع ہیں، درس وتدریس بھی ہے۔ ایک مخلص پیدا ہو تو ہزاروں اس سے بن جاتے ہیں۔ جیسے دنیا میں نبی ایک ہی ذات آتی ہے۔ مگر لاکھوں لوگ ایمان سے رنگے جاتے ہیں۔ اسی طرح حق تعالٰی شانہ اس امت میں شخصیات پیدا فرماتے ہیں۔ ان شخصیتوں کے ذریعے سے آگے شخصیتیں بنتی ہیں۔ بہر حال یہ مولانا مرحوم کی نیت کے ثمرات ہیں۔

اَخلافِ صدق کا وعدہ..... جس طرح سے اللہ تعالٰی نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، اسی طرح سے شخصیات کے بھی پیدا کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ حدیث میں اس کا وعدہ موجود ہے۔ يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ

خَلَفٍ عُدُوْلُہٗ ① سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے اور وہ سلف کا علم حاصل کرتے رہیں گے۔ غرض شخصیات کے پیدا ہونے کا وعدہ دیا گیا۔ یہ نا ممکن ہے کہ نہ ہوں۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب! زمانہ خراب آ گیا۔ اب خلف صحیح پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ علی الاطلاق یہ غلط ہے۔ بے شک خلف ویسے نہیں جیسے سلف ہیں، تو نوعیت قائم رہے گی۔ کبھی مٹنے والی نہیں۔ علماء کے بعد علماء حفاظ کے بعد حفاظ پیدا ہوتے رہیں گے۔

چناں چہ حدیث میں فرمایا گیا: خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ② بہترین دور میرا دور ہے، جو صحابہؓ کا دور ہے۔ پھر تابعین ہیں۔ پھر تبع تابعین ہیں تو جو مقام صحابہؓ کا ہے وہ تابعین کا نہیں۔ جو تابعین کا ہے وہ تبع تابعین کا نہیں۔ یہ شخصیات میں درجات اور فرقِ مراتب کا قصہ ہے۔ لیکن نوعیت قیامت تک یکساں رہے گی۔ جس کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا: ”میری امت کی مثال بارش کی سی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پہلا قطرہ زیادہ نافع ثابت ہوا کہ بعد کا قطرہ۔ بارش ہے۔ اول و آخر قطرات پڑ رہے ہیں، زمین سیراب ہو رہی ہے۔ غرض امت میں خیر باقی رہے گی۔ فرقِ مراتب ہوتا رہے گا۔ اس سے خیر کا انقطاع نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت اور شخصیات کے ذریعے سے معیار قائم کرایا۔ ان کے ذریعے حق کی راہیں نظر آئیں گی۔

اور میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ: اگر اہلِ حق میں اختلاف ہو جائے۔ تو اختلاف اس کا عذر نہیں کہ حق کو چھوڑ دیا جائے۔ جد و جہد ختم کر دی جائے۔ اگر آپ خدانخواستہ بیمار ہو جائیں اور اطباء کی رائے میں اختلاف ہو جائے تو کبھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تو انتقال کرتے ہیں اور قبر میں جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اطباء میں اختلاف ہے۔ آپ منتخب کرتے ہیں۔ خواہ اس لحاظ سے کہ یہ طبیب فلاں طبیہ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے یا اس معیار سے کہ لوگ اس کے یہاں زیادہ شفایاب ہوتے ہیں یا اس لحاظ سے کہ ان کے خاندان میں جدی طور پر طب چلی آ رہی ہے اس کو طب سے زیادہ مناسبت ہے، کوئی نہ کوئی معیار لے کر آپ انتخاب کریں گے یہ فیصلہ کبھی نہیں کریں گے کہ اطباء میں اختلاف ہے لہٰذا انتقال فرما جانا چاہئے۔ لہٰذا قبر کو آباد کرنا چاہئے۔ غرض جسمانی صحت اور اطباء کے بارے میں ان کے اختلاف سے آپ گھبراتے نہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ تو علماء میں اگر اختلاف ہو تو آپ کیوں انتخاب نہیں کریں گے؟ وہاں کیوں یہ فیصلہ کریں گے کہ چونکہ علماء اختلاف کر رہے ہیں لہٰذا دین کو چھوڑ دینا چاہئے۔ وہاں بھی انتخاب کرنا چاہئے۔

معیارِ انتخاب...... اب انتخاب کا معیار الگ ہے۔ اصل چیز آپ کی طلب صادق ہے جس عالم کی دیانت پر آپ کو اعتماد و اطمینان ہو۔ دین اس کے سپرد کریں اور اس سے پوچھ پوچھ کر اس پر عمل کریں۔ آپ کو حکم کس نے بتایا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو آپ ثالث بنیں کہ جب ان کا اختلاف ختم ہو تو میرا دین سنبھلے گا۔ تو نہ اختلاف رفع ہو گا نہ

---

① السنن الکبریٰ للبیہقی، ج: ۱۰ ص: ۲۰۹.

② الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۱۱ ص: ۳۸۱.

آپ کا دین سنبھلے گا۔ ان لڑنے والوں میں اور اختلاف کرنے والوں میں جس فرد یا جس جماعت اور طبقہ پر آپ کا دل مطمئن ہو۔ اس کی طرف آپ رجوع کریں اور اس سے آپ آنکھ بند کریں کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔

عوام کے لئے حجت ...... میں تو ایک مختصر بات کرتا ہوں کہ عالم کے لئے تو کتاب وسنت حجت ہے ان میں وہ مسائل تلاش کریں۔ عوام کے لئے حجت خود وہ عالم ہے۔ عوام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ براہ راست قرآن وحدیث کو سمجھیں۔ انہیں تعلیم نہیں اسے کیا سمجھیں گے؟ عوام کا کام یہ ہے کہ عالم ربانی جو فتویٰ دیں اس پر عمل کریں۔ اور مان لیجئے کہ کسی نے غلط فتویٰ دیا۔ آپ کی ذمہ داری نہیں، آپ کے لئے نجات ہے، اس عالم کی گردن نپے گی کہ اس نے کیوں غلط فتویٰ دیا؟ ﴿مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَاِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتٰی وَقَالَ کَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ﴾ ① حدیث میں ہے کہ جس نے غلط فتویٰ دیا تو مفتی کو پکڑا جائے گا عمل کرنے والے کو نہیں پکڑا جائے گا، اس نے دیانت داری سے عمل کیا، تو آپ اپنی جدوجہد صرف کریں، ان اختلاف کرنے والوں میں کون سا طبقہ ہے، کون سا فرد ہے جو واقعی متدین ہے، اس کا ظاہر وباطن یکساں ہے۔ آپ دین کے بارے میں اس سے مدد لیں۔ علماء میں اختلاف ہے وہ ان پر چھوڑ دیں آپ کوئی حکم نہیں ہیں کہ بیٹھ کر فیصلہ دیں وہ اپنا فیصلہ خود کریں گے آپ میں اس کی سکت اور استطاعت نہیں ہے۔ ان میں فیصلہ کا حکم وہ بنے گا جو ان دونوں عالموں سے بڑھ کر عالم ہو۔ وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ صحیح کہتا ہے یہ غلط، آپ الف سے ب نہیں جانتے اور علماء کے اندر فیصلہ کرنے کے لئے چلے۔

تو آپ کیا فیصلہ دیں گے؟ آپ کا کام اطمینان کے بعد انتخاب ہے اس سے آپ کر اپنا دین چلائیں، فتویٰ اور مسئلہ پوچھنے کے ذریعے اپنا دین سنبھالیں۔ جب دین اور علم آ گیا اب آپ ذمہ دار ہیں جس راستے پر آپ چلیں گے۔ دیانت سے چلیں گے۔ اس لئے بڑی خرابی یہ ہے کہ اختلافات کو دیکھ کر لوگ اس فکر میں ہیں کہ دین کو چھوڑ دیا جائے کہ صاحب! ہم کہاں جائیں؟ سوال یہ ہے کہ جب بیمار ہوتے ہو تو اطباء میں اختلاف ہو جائے تو کہاں جایا کرتے ہو؟ کیا قبر میں جایا کرتے ہو؟ ان میں سے کسی کو حکم اور منتخب کرتے ہیں، یہاں کیوں نہیں انتخاب کر لیتے؟ دین کے بارے میں خود مفتی بننے کی کوشش کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔

اتحادِ علماء کی ضرورت ...... اس واسطے علماء کے حق میں تو یہی عرض کیا جائے گا کہ وہ آپس میں اتحاد کریں۔ کوئی بھی قدر مشترک لے لیں۔ مگر اتفاق کریں۔ اپنی ذاتی خصوصیات اپنے گھر میں رکھیں۔ خود عمل کریں اور جو آپ کے زیر اثر ہے، اس سے عمل کرائیں، لیکن جو قدر مشترک ہے۔ اس میں متفق ہو کر سامنے آؤ۔ دشمنانِ اسلام بہت ہیں، اعداء اللہ بہت ہیں جو رات دن دین پر حملہ آور ہیں اور استیصال کی فکر میں ہیں۔ آپ ان کے مقابلے میں کیوں نہیں آتے۔ تمام تر جدوجہد آپس کی لڑائی میں صرف ہو رہی ہے۔ غرض آپس میں کسی بھی قدر مشترک پر اتفاق کر کے سامنے آؤ۔ مثلاً اللہ واحد، رسول صلی اللہ علیہ وسلم واحد کتاب اللہ واحد۔ اب اگر کسی میں مفہوم کا

① السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا ج: ۱ ص: ۷۱.

اختلاف ہے تو ہوتا رہے۔ آپ اپنی دینی زندگی کی فکر کریں۔

طلبِ صادق ...... بہرحال علماء میں اتفاق کرانے یا علماء میں اتفاق ہو جانے کے انتظار میں آپ اپنی دینی زندگی کے بارے میں بے فکر نہ ہوں۔ طلبِ صادق سے آپ کو با اعتماد علماء مل جائیں گے۔ آج بھی ایسا نہیں کہ دنیا میں علماء ربانی آپ کو نہ ملیں۔ اگرچہ وہ تھوڑے ہیں مگر ضرور موجود ہیں۔ ان کا دامن پکڑ پکڑ کر پوچھ پوچھ کر اتباع کرتے چلے جائیں۔ آپ کی اپنی زندگی سنورتی چلی جائے گی۔ غرض علماء کے اختلاف کو دین سے بیزاری کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ احتیاط کا طریق اپنایا جائے۔ یہ چند باتیں میں نے آپ حضرات کی خدمت میں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل مرحمت فرمائے اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنا نصیب فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

(کتبہ، ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تاریخِ اسلام کی ایک زندہ جاوید شخصیت

آخر عمر میں آپ نے بطورِ خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم نافہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا و عقبیٰ دونوں کے اکتشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔ (از: حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ)

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اپنے یہاں علماء اور مصلحینِ امت کے تعارف کے لئے ایک سلسلہ تقریر شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی تقریر جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق براڈکاسٹ ہوئی نذرِ قارئین ہے۔

موضوعِ تقریر...... میری اس تقریر کا موضوع ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی ایک زندہ جاوید شخصیت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ بانی دار العلوم دیوبند ہے۔

حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت سن ۱۲۴۸ھ، بمطابق سن ۱۸۳۲ء میں اور وفات سن ۱۲۹۷ھ بمطابق ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ اس ۴۹ سال کی قلیل مدت میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی اور قومی خدمت کے سلسلے میں جو عظیم کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ صدیوں کی وسعت کے تھے، جنہیں ہندوستان ہی نہیں پوری اسلامی دنیا بھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انگریزی اقتدار کا تسلط اور مسلمانوں کی شکست ...... سن ۱۸۵۷ء میں آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں ہندوستان سے غیر ملکیوں کا قبضہ اٹھانے کے لئے جنگ لڑی لیکن جنگ میں شکست ہوئی اور ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا، اس سے تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے اور ان میں احساسِ کمتری کے ساتھ ایک عام مایوسی پھیل گئی۔ ادھر مشنریوں نے عیسائی اقتدار کے زیرِ سایہ صاف صاف یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کے لئے یہ ملک (ہندوستان) عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا عطیہ اور امانت ہے، اس لئے اس میں مسیحی مذہب ہی کی اشاعت اور ترویج ہمارا نصب العین ہے اور ساتھ ہی کھلے بندوں ہندوستان کے تمام مذاہب اور خصوصیت سے اسلام پر اعتراضات اور اتہامات کی بوچھاڑ بھی شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندے مایوسی میں مبتلا ہو کر اور بالخصوص مسلمان اس ابھرتی ہوئی مغربی تہذیب و تعلیم سے الحاد و دہریت کی زد میں بہنے لگے اور صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی نقل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں کہ

آئندہ نسلیں خواہ وہ کسی بھی قوم کی ہوں خود اپنے اخلاقی نظام اور تہذیب و کلچر سے بیگانہ محض ہو کر رہ جائیں گی۔

مذہبی انقلاب کی ضرورت...... حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے نورِ معرفت سے وقت کی رفتار اور اس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا اور باشارات غیب ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجائے آپس میں الجھنے کے ایک عالمی نقطۂ نظر پر ڈال دینے اور قوم میں ایک مذہبی انقلاب لانے کی ضرورت محسوس فرمائی تا کہ یہ احساس کمتری دور ہو۔ اس کے لئے آپ نے تعلیم و تربیت کا راستہ اختیار فرمایا جو بے ضرر اور رسمی سیاست سے دور تھا۔

چناں چہ سن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے اپنی ایمانی فراست سے چھینے ہوئے اقتدار کا نعم البدل تعلیمی راہ سے حریتِ فکر کے بقاء و ارتقاء کو قرار دیا اور اپنا یہ عظیم مقصد سن ۱۲۸۳ ہجر بمطابق سن ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم فرما کر با آسانی حاصل کر لیا۔ اس الہامی نقطۂ فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ حریتِ فکر اور استقلالِ وطن کے جذبات کو زندہ رکھنے کا ایک ہمہ گیر مکتبِ فکر اور عظیم تحریک ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے مقصد کی اہمیت کے تحت ملک گیر پیمانے پر مدارس قائم فرمانا شروع کئے اور بنفس نفیس خود جا کر مراد آباد، گلاوٹھی، امروہہ، مظفر نگر وغیرہ میں مدارس قائم فرمائے اور جابجا اپنے متوسلین کو زبانی اور خطوط کے ذریعے قیام مدارس کی ہدایت فرمائی۔ چناں چہ بہت سے مدارس ہندوستان میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں قائم ہو گئے۔

ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی...... اور پھر حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے حریتِ فکر کے امین فضلاء نے پورے ملک میں حتیٰ کہ انہی فضلاء نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک میں بھی اسی قاسمی طرزِ فکر پر تعلیم گاہیں قائم کیں اور میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ آج انگلستان میں یہ قاسمی فکر فروغ پا رہا ہے۔ عالمی پیمانہ پر ہندوستان میں مفت تعلیم کا سب سے پہلا عوامی مرکز مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے، جس کیلئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو صاحب دل خدام اور صداقت شعار رفقاء کار حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمہم اللہ وغیرہ کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔ یہی دارالعلوم دیوبند آج ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی مرکزی اور اقامتی یونیورسٹی بن کر ایک خاص مکتبِ فکر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت و عظمت کی حامل ہے۔

مدارسِ عربیہ کی معنوی بنیاد...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسے اصولوں پر قائم فرمایا جن کے تحت روز اول سے یہ درسگاہ ایک عوامی ادارہ کی پوزیشن میں نمایاں ہوئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ والا نے اس سلسلہ میں آٹھ اصول اپنے دست مبارک سے لکھے جو دارالعلوم کے تاریخی ریکارڈ میں آج بھی محفوظ ہیں اور آج تک ہر دور میں بانی دارالعلوم کے ان الہامی اور اساسی رہنما اصولوں کی پوری پوری حفاظت و رعایت کی جاتی رہی ہے۔ یہ اصول درحقیقت دارالعلوم دیوبند کی معنوی بنیاد ہیں، جن پر اس کی ظاہری اور باطنی تعمیر کھڑی ہوئی۔

اور نہ صرف دارالعلوم ہی بلکہ ان تمام مدارس عربیہ کی بھی اساس ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے رنگ پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متوسلین نے قائم فرمائے۔ چناں چہ ان اصول ہشت گانہ پر حضرت اقدس نے سرخی بھی یہی قائم فرمائی کہ: ''وہ اصول جن پر مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں''۔

یہی ہمہ گیر اصول قیام مدارس کی اس اجتماعی تحریک کی بنیاد ہے جس سے سن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو نئی زندگی اور نشاۃ ثانیہ ملی۔ ان اصول کے مطابق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو صرف عوامی چندہ پر قائم فرمایا تاکہ اس میں ابتداء ہی سے ہمہ گیری کا عنصر نمایاں رہے اور یہ دارالعلوم ہندوستان کے غریب عوام کا ادارہ ثابت ہو۔ ساتھ ہی اصول میں یہ ہدایت بھی ہے کہ اس مدرسہ کے لئے جائیدادوں اور کارخانہ تجارت سے کسی مستقل آمدنی کا کوئی بندوبست نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے پر امداد غیبی منقطع ہو جائے گی۔ رجوع الی اللہ کا سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کارکنوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ جس کو ان کے مخلص رفیق کار حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی نے اپنی طویل نظم کے بعض اشعار میں بایں الفاظ ظاہر فرمایا کہ:

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے	کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ	یوں سمجھ لینا کہ بے نور و ضیاء ہو جائے گا

ان اصولوں میں خصوصیت سے اسے اہمیت دی گئی ہے کہ تعلیم مکمل طریق پر آزاد رہے جو کہ اجتماعیت کی روح ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اصولاً معاملات دارالعلوم کو مشورہ کے اصول پر قائم فرما کر اس کو عہد استبداد میں جمہوریت کا نقیب بنا دیا گیا اور خاص طور پر ذمہ دار ادارہ (مہتمم) کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ وہ علاوہ مقررہ اہل شوریٰ کے ایسے واردین، صادرین سے بھی مشورہ کرے جو مدارس کے خیر خواہ اور ان سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ یہ اصول حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم کے ہمہ گیر اور اجتماعی فکر کے ناقابل انکار شواہد ہیں اور انہیں سے دارالعلوم دیوبند کی نوعیت، واہمیت بھی واشگاف ہو جاتی ہے۔

خلافتِ ترکی کی تائید..... انگریزوں کے قومی استبداد کو توڑنے کے لئے جس کا رخ خصوصیت سے مسلمانوں کی طرف تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ہمہ گیر سیاسی راہنمائی سے اس دور کی خلافت اسلامیہ یعنی خلافت ترکی کی تائید کی طرف مسلمانوں کو خاص طور پر جھکایا۔ سلطان ترکی کی مدح میں قصیدے لکھے اور بحیثیت خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین ہونے کے مسلمانوں کو ان کی طرف مائل کرتے رہے اور اس دور میں جنگ روس و روم ہوئی تو خود بہ نفس نفیس دورے کر کے ترکوں کے لئے ہزاروں روپیہ روانہ فرمایا اور خود اپنے گھر کا تقریباً جز اسامان بطور چندہ ترکی خلافت کی مدد کے لئے روانہ فرمایا تاکہ خلافت سے وابستہ رہ کر ملی اجتماعیت برقرار اور شیرازہ بندر ہے۔

اس جذبہ سے ملک کی دوسری قوموں کو بھی ہمدردی تھی اور اسی کا اثر تھا کہ جب مسلمانان ہند نے احیاء خلافت کی تحریک شروع کی تو بلا تفریق مذہب وملت ملک کی تمام مذہبی اکائیاں متفق ومتحد ہو کر اس میں برابر کی

شریک رہیں۔ اس اجتماعیت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ حج کی ترغیب دیتے تھے کہ بذاتِ خود حج ایک اجتماعی اور بین الاقوامی عبادت ہے تاکہ مشرق و مغرب کے مسلمان یکجا جمع ہو کر باہم وابستہ ہوں اور ان کی بین الاقوامی اجتماعیت کا رشتہ مضبوط ہو اور ساتھ ہی ترکی خلافت سے بھی انہیں وابستگی رہے۔

فکرِ قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے تین بنیادی عناصر...... یہ تفصیل فکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے ان تین بنیادی عناصر کو واشگاف کر دینے کے لئے کافی ہے کہ ملت کی بقاء و ارتقاء تعلیم کی ہمہ گیری، ذوقِ اجتماعیت کے عموم اور مرکزیت سے باعظمت وابستگی ہی میں مضمر ہے۔ آخر کار یہی روح ان کے تربیت یافتوں میں بھی راسخ ہوئی اور ان کے بعد ان کے شاگردِ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ قاسمی فکر کے امین بنے اور ان کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ اس کے علمی امین بنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ریشمی خطوط کی تحریک اٹھائی اور پانچ برس مالٹا میں انگریز کی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ ان کے بعد ان کے ہزار ہا شاگردوں میں بھی یہی رنگ جو ہر نفس ہوتا رہا۔

جن میں خصوصیت سے قابلِ ذکر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری وغیرہ تھے (رحمہم اللہ اجمعین) جنہوں نے بالآخر ہندوستان کو آزاد کرایا اور انجام کار ان بزرگوں کا وہ وحدتِ عالمِ اسلام کا خواب اب تعبیر کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی دورۂ یورپ کی تمنا...... آخر عمر میں آپ نے بطور خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ میں پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو۔ بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دینیا عقبیٰ دونوں کے انکشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔

مباحثۂ شاہجہاں پور کا واقعہ وہ تاریخی موڑ ہے کہ اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہندو مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی انگریزی سیاست کا رخ انگریزوں کی طرف موڑ دیا جس کا اعتراف اس دور کے ہندو زعماء نے یہ کہہ کر کیا کہ: "یہ مولوی ہے جس نے ہندوستان کی لاج رکھ لی"۔ یہ روشن حقائق اس عظیم حقیقت کو طشت از بام کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایک عالمی اور تاریخ ساز شخصیت تھی اور ان کے شیخ و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کا یہ قول کہ: "کئی صدیوں کے بعد اللہ نے مولانا محمد قاسم جیسی شخصیت پیدا فرمائی ہے" ان کی عظمت و اہمیت کے باب میں بلا خوف تردید حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے۔

افادات علم وحکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی جوابات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا لِّلّٰهِ الْعَظِيْمِ وَمُصَلِّيًا عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْد

اُحوالِ واقعی...... اس مجلس کا موضوع مذاکرہ تھا۔ کوئی تقریر اور وعظ نہیں ہے۔ جیسا کہ بستی میں بھی یہی صورت ہوتی ہے کہ عشاء کے بعد کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں، اس میں جس نے کوئی سوال یا شبہ پیش کیا تو جو اپنے علم میں ہوا وہ عرض کر دیا گیا۔ وہی موضوع اس مجلس کا بھی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ مختلف لوگ مختلف باتوں کے سوالات کریں، بعض حضرات نے کچھ سوالات مجھے لکھ کر دیئے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہا جائے۔ اور یہ سوالات اکثر غلط فہمیوں کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ان کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی جائیں۔

مزاراتِ اولیاء پر حاضری اور علماء دیو بند...... پہلا سوال یہ کیا گیا ہے کہ علماء دیو بند، اولیا اللہ اور بزرگان دین کی قبروں اور مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور قبروں پر فاتحہ و دعا کو منع کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کذب محض اور بالکل جھوٹ ہے اور افتراء باندھا جاتا ہے۔ علماء دیو بند کا مسلک یہ ہے کہ اولیاء اللہ اہل اللہ کی قبروں پر جانا انتہائی برکت کا ذریعہ ہے، فیض کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے اور علماء دیو بند کے ہاں خود بیعت وارشاد کا سلسلہ ہے، ہم لوگ ویسے تو چشتی کہلاتے ہیں، لیکن چاروں خاندانوں میں ہمارے بزرگ ریاضتیں بھی کرواتے ہیں اور اجازت بھی دیتے ہیں یعنی چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ ہمارے دیو بند کے مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندی تھے اور ہر سال حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر عرس کے موقع پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ دارالعلوم کے مفتی اعظم تھے۔

تو ایک سلسلہ میں ہمارے ہاں نقشبندیت کا ہے۔ دارالعلوم دیو بند کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگوں میں سے ہیں اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور ان کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ یہ لوگ نقشبندیہ ہیں اور عامہ دیو بند کے بزرگ جیسے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہ سب چشتی ہیں۔ ہمارا سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت صابر

کلیری رحمۃ اللہ علیہ، ان بزرگوں سے ہوتا ہوا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، یہ حضرات تقریباً سلسلہ کے جس قدر اولیاء اور بزرگ ہیں ان کے مزارات پر حاضر ہوتے تھے اور استفاضہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند اکثر و بیشتر سال میں کلیر شریف حاضر ہوتے اور اس انداز سے کہ میرے خیال میں آج بھی کوئی بزرگوں کا معتقد شاید اس انداز سے نہ جاتا ہو۔ رڑکی سے چھ میل کے فاصلے پر حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ کا مزار ہے اور نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے۔ تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نہر کے کنارے پٹڑی پر پہنچ کر جوتے اتار لیتے تھے۔ چھ میل ننگے پیر طے کرتے تھے اور وہاں پہنچ کر عشاء کی نماز کے بعد روضہ میں داخل ہوتے۔ پوری رات مزار پر گزارتے تھے۔ اس میں ریاضتیں، مجاہدہ اور استفاضہ وحصول فیض کرنا اور صبح کی نماز کے لئے وہاں سے نکلتے تھے۔۔۔ بہر حال یہ کہنا انتہائی غلط بیانی اور افتراء پردازی ہے کہ علماء دیوبند اولیاء اللہ کو نہیں مانتے اگر نہ مانتے تو ان کے سلسلے میں کیوں داخل ہوتے؟ بیعت وارشاد کا سلسلہ کیوں قائم کرتے؟ اگر مزارات کی حاضری پر جانے کو وہ ناجائز سمجھتے تو خود ننگے پیر اولیاء مزارات کے لئے کیوں پیدل جاتے؟

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، جس قدر بھی ہندوستان میں سلسلے کے اکابر ہیں سفر کر کے ان مزارات پر حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ محب اللہ صاحب الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار الٰہ آباد میں ہے۔ تو وہاں گئے۔ اس طرح کلیر شریف گئے اور اجمیر شریف اٹک گئے۔ اسی طرح خود میں نے بھی ان تمام مزارات کی حاضری بھی دی اور جب موقع ہوتا ہے حاضر ہوتا ہوں۔

چناں چہ ایک بار اجمیر شریف میں حاضر ہوا اور کسی کو اطلاع نہیں دی اور یہ خیال تھا کہ ایصالِ ثواب کر کے بس دو گھنٹوں کے بعد واپس ہو جاؤں گا جمعہ کا دن تھا جب میں وہاں پہنچا تو مزار پر حاضر ہوا۔ دو، اڑھائی گھنٹے وہاں قیام کیا اس کے بعد باہر نکلا تو تقریباً جمعہ کی اذان میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ تو میں نے ارادہ کیا کہ نماز جمعہ پڑھ کر اسٹیشن چلا جاؤں گا۔ گاڑی رات کو آٹھ بجے جاتی تھی۔ اس بناء پر ارادہ تھا، چونکہ یہاں کسی سے خاص کوئی تعارف بھی نہیں۔۔۔ لیکن جب میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے گیا تو بعض لوگوں نے مجھے کچھ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ میں سمجھا کہ شاید کسی نے پہچان لیا ہو۔ نماز جمعہ کے بعد ایک جماعت نے آ کر مجھے گھیر لیا اور اس میں دیوان صاحب آگے آگے تھے۔ جو وہاں کے سجادہ نشین ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ "اپنوں سے یہ اجنبیت کیوں؟۔ کہ نہ کوئی اطلاع ہے نہ خبر ہے اور چپکے چپکے آنا اور آ کر چلے جانا۔ آخر ہم لوگوں سے یہ اجنبیت کیوں برتی گئی؟"۔

میں نے عرض کیا کہ: میں نیاز مندانہ اور خادمانہ حاضر ہوا تھا اور خادم اعلان کر کے نہیں آیا کرتے، نیاز مند اطلاعیں دے کر نہیں آتے، حاضر ہونا ان کا فرض ہے۔ تو میں اطلاع دے کر کیسے آپ حضرات کو تکلیف دیتا۔ نیاز مندانہ حاضر ہوا ہوں ہزاروں یہاں خدام آتے ہیں۔ ایک خادم اور آ گیا۔ اس میں اطلاع کی ضرورت نہیں تھی،

بہر حال انہوں نے اصرار کر کے ٹھہرا دیا۔

مجھے رات کو واپس ہونا تھا۔ ریزرویشن بھی ہوا ہوا تھا۔ اس لئے سب کو منسوخ کروایا۔ میں نے کہا: مجھے دہلی لازمی پہنچنا ہے۔ وہاں جلسہ کا پروگرام ہے۔ تو انہوں نے فون اٹھا کر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ) سے بات کی کہ آپ چاہے جلسہ کریں نہ کریں مگر اسے نہیں آنے دیں گے۔ چناں چہ انہوں نے روک لیا۔

پھر خانقاہ میں وہیں تقریر کا اعلان کیا۔ چناں چہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل پر کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر بھی کی۔ اگر علماءِ دیوبند بزرگوں کے مزارات پر جانے سے روکتے، تو مجھے کیوں جانے کی توفیق ہوتی اور ہمارے بزرگوں کو کیوں توفیق ہوتی؟

مانعین زیارت قبور سے جنگ...... ہم لوگوں کی ان لوگوں سے جنگ تھی اور ہے جو واقعہ میں مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور محض تعصباً جنگ نہیں تھی بلکہ دلائل سے جنگ ہے اور حدیث کی رو سے جنگ ہے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اول مطلقاً فرمایا۔ **کنت نَهَيْتُكُمْ عن زيارة القبور. فزوروها فان فيها عبرة.** ① ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں زیارت قبور سے روکتا تھا لیکن اب میں اجازت دیتا ہوں۔ قبروں پر جایا کرو۔ کیونکہ وہاں جانے سے آخرت یاد آتی ہے اور آدمی کے سامنے خود اس کی موت آ جاتی ہے جس سے طاعت اور عبادت کی طرف جھکتا ہے''۔

غرض فرمایا کہ پہلے روکتا تھا اب اجازت دیتا ہوں۔ گویا ممانعت منسوخ ہوگئی اور اجازت ثابت ہوگئی۔ غرض اول تو اس حدیث کی رو سے حق ہے اور ہر مسلمان کو ضرورت ہے کہ قبور پر جائے اور آخرت کی یاد تازہ کرے۔

زیارت قبور کے لئے سفر...... دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ قبر کو مستقل مقصد سفر بنا کر جانا جائز ہے یا نہیں؟ ایک جماعت کہتی ہے کہ ناجائز ہے۔ ہمارے بزرگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ مستقلاً اگر زیارت قبور ہی کے لئے سفر کیا جائے تو جائز ہے۔ بحث اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ **لَاتُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ، مَسْجِدِ الْاَقْصٰى، وَ مَسْجِدِيْ هٰذَا.** ② ''سفر جائز نہیں ہے مگر تین مساجد کی طرف۔ ایک مسجد حرام یعنی بیت اللہ شریف، ایک مسجد اقصیٰ یعنی شام میں بیت المقدس اور ایک میری مسجد۔ یعنی مسجد نبوی''۔ **(عَلٰى صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفُ تَحِيَّةٍ وَّ سَلَامٍ)**

اس سے بعض لوگوں نے یہ مسئلہ پیدا کیا کہ قبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ علماءِ دیوبند یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قبروں کو مقصد بنا کر سفر نہ کرو۔ اس لئے کہ اس میں مسجد کی قید ہے کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے سفر جائز نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو ان مسجدوں کی طرف ہو سکتا ہے۔

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ماجاء في زيارة القبور ج: ۵ ص: ۳۵۔

② السنن للترمذي، كتاب الصلوٰة، باب ماجاء في اي المساجد افضل. ج: ۲، ص: ۳۸۔

ان تینوں کو کیوں جائز رکھا گیا؟ اس لئے کہ ان تین مساجد کی جو خصوصیت ہے وہ عالم میں کسی مسجد کی نہیں۔ بیت اللہ شریف کی تو یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز اس میں پڑھی جائے تو دس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ بقیہ اللہ کی سب مسجدیں برابر ہیں اور محترم ہیں۔ خصوصیت سے کسی مسجد کو مقصد بنا کر جانا، اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس میں کوئی خاص ثواب ہے۔ حالانکہ کوئی خاص ثواب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلایا تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم کوئی معاملہ کریں کہ گویا ہم زیادہ ثواب سمجھتے ہیں جہاں بھی جائیں گے نماز برابر ہوگی اور اجر ملے گا۔

تو جو لوگ قبروں کا سفر ممنوع قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں استثناء منقطع ہے۔ یعنی کسی مسجد کی طرف سفر جائز نہیں، مگر ان تین مسجدوں کی طرف۔ گویا مسجدوں کی طرف سفر کرنے سے روکا گیا ہے لیکن ان تین مسجدوں کی اجازت ہے۔ بقیہ کی نہیں اس واسطے کہ مسجد کا مفہوم عام لے لیں۔ چاہے اس میں قبر ہو چاہے کچھ ہو۔ تو کسی قبر کی طرف بھی جانا جائز نہیں۔ صرف ان تین مسجدوں کی طرف جانا جائز ہے۔

ہم کہتے ہیں استثناء میں اصل متصل ہے۔ سفر کر کے مساجد کی طرف جانے سے روکا گیا۔ صرف تین مسجدوں کی اجازت دی گئی ہے۔ اس روایت میں قبروں کا ذکر ہی نہیں۔ اس لئے قبروں کا مسئلہ بالکل جداگانہ ہے۔ اس حدیث سے قبروں کے سفر کی ممانعت یا قبروں کی طرف سفر کی اجازت کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ حدیث صرف مساجد کے بارے میں ہے۔

رہا قبروں کا مسئلہ تو اول تو حضور علیہ السلام نے خود فرمایا کہ پہلے تو میں تمہیں روکتا تھا۔ اب اجازت دیتا ہوں۔ اس اجازت میں یہ قید نہیں لگائی کہ اگر شہر میں ہوں تو کرلو اگر باہر ہوں تو مت جاؤ (یعنی کجا وہ کس کر شہر سے باہر مت جاؤ) تو عمومی طور علماء دیو بند اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ قبروں کو مقصد بنا کر اگر سفر کیا جائے تو جا سکتے ہیں۔ گویا یہ حضرات دوسروں سے اس بارے میں لڑتے ہیں کہ دوسرے کہتے ہیں کہ قبروں کی طرف سفر جائز نہیں اور علماء دیو بند کہتے ہیں کہ جائز ہے، برکات کا موجب ہے اور ان سے استفاضہ ہوتا ہے۔ ایک عام استفاضہ ہے، وہ ہر مسلمان کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہاں پہنچ کر آخرت کی یاد تازہ ہوگی۔ ایک خاص استفاضہ ہے جو اہل حال کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ صاحب قبر سے برکات کا اخذ کرنا اور لینا، تو جو لوگ صاحب مراقبہ ہیں یا صاحب کشف ہیں روحانیت سے اخذ کرنا جانتے ہیں۔ اس طریقہ سے واقف ہیں۔ وہ فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

غرض ان حالات میں یہ کہنا کہ علماء دیو بند قبروں پر جانے سے روکتے ہیں بالکل ایک سفید جھوٹ ہے کوئی اس کی اصلیت نہیں۔ شریعت جب ممانعت نہیں کرتی تو علماء دیو بند کیا چیز ہیں کہ ممانعت کریں۔ وہ تو شریعت کے تابع اور غلام ہیں۔ جو شریعت حکم دے گی کریں گے، جس سے روک دے گی، روکیں گے۔ بہرحال اجازت بھی

رہتے ہیں اوران کا عمل بھی ساتھ ساتھ ہے۔ یہ سب حضرات گئے ہیں جاتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں، محض عوام کو اشتعال دلانے کے لئے اس قسم کی افتراء پردازیاں کی جاتی ہیں۔ جیسا موقع ہوتا ہے ویسا ہی جھوٹ بول دیا جاتا ہے۔ تو کوئی اس کی اصلیت نہیں۔

تعظیم جائز اور عبادت ناجائز...... ہاں! ایک ہے قبروں پر جا کر بے ادبی سے پیش آنا، اس کو ہم بھی روکتے ہیں اور ساری دنیا روکے گی۔ قبریں اس لئے ہیں کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ ان سے ہم بندگی سیکھیں اور وہی کام کریں جو ان اصحاب قبور نے کیا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک پر اس لئے جاتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تھے، انہوں نے خدا کے ٹوٹے ہوئے بندوں کو اللہ سے جوڑا اور کہا کہ صرف اللہ کے آگے جھکو!

ہم اس لئے نہیں جاتے کہ خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک کو سجدہ کریں۔ ہم اس کو شرک جانتے ہیں۔ ہم اس لئے جاتے ہیں کہ برکات حاصل کریں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے جب اپنے لئے سجدہ جائز نہیں سمجھا تو اولیاء اللہ اس کو کس طرح سے جائز سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ بعض صحابہؓ حاضر ہوئے اور آتے ہی حضور علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا حرکت کی؟ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے قیصر اور کسریٰ کے درباروں کو دیکھا، یہ سلاطین اپنی مسندوں پر ہوتے ہیں اور لوگ آ کر ان کو سجدہ کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ سجدے کرائیں تو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کا زیادہ مستحق ہے کہ ہم اس کو سجدہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کبھی ایسا مت کرنا، اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ لیکن دنیا میں کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں بجز اللہ کے۔ عبادت صرف ایک ذات کی کی جائے گی اور توقیر و تعظیم سب اللہ والوں کی حسب درجہ و مرتبہ کی جائے گی۔ تو حضرات انبیاء علیہم السلام جیسی قدسی ذوات ان کے لئے بھی جب سجدہ جائز نہیں ہے تو اولیاء اللہ کے لئے کس طرح جائز ہوگا؟ اور عوام تو بھلا کس شمار و قطار میں ہیں۔ تو قبروں پر جا کر قبروں کو سجدے کرنا اس کو علماء دیو بند شرک جانتے ہیں۔۔ حاضر ہو کر برکات حاصل کرنا، ان اللہ کے بندوں کے نام لے کر اللہ سے دعائیں مانگنا، اس سب کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ عبدیت کے خلاف نہیں بلکہ یہ ''عین عبدیت ہے۔

اگر یہ اہل اللہ اور بزرگ دنیا میں موجود ہوتے اور ان کی بارگاہ میں ہم لوگ حاضر ہوتے جب بھی سجدہ نہ کرتے۔ اس لئے کہ اگر ہم سجدہ کرتے تو وہ حضرات خود ہمیں اپنی مجلس سے نکال دیتے کہ ''میں تمہیں اللہ کے لیے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں یا اپنے لئے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام صلحاء کے بارے میں قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ

الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں ''کسی بشر کے لئے جائز نہیں، جس بشر کو اللہ نے کتاب دی ہو، علم دیا ہو۔ فضل وکمال دیا ہو۔ کیا جائز نہیں ہے؟ یہ کہ لوگوں سے یوں کہے کہ میرے بندے بنو اور میرے سامنے جھکو''۔

بلکہ اللہ کا بندہ جس میں علم اور حکمت ہوگی، کہے گا کہ اللہ والے بنو، اس کے آگے جھکو، اس کو اپنا رب سمجھو، اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھو، صرف اس کے آگے جھکو، یعنی عبادت اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں، عبد بننا صرف اللہ کے سامنے جائز ہے اور کسی کے لئے نہیں۔

اسماء شرکیہ سے احتراز...... اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَحَبُّ الْاَسْمَآءِ اِلَى اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ. ② ''اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں''۔

کیونکہ اس میں خدا کے سامنے عبدیت اور بندگی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی بندے کے نام کے سامنے آدمی عبد لگا دے۔ مثلاً عبدالنبی کہہ دے یا کوئی چیز کہہ دے کہ کسی بندے کا نام لے کر عبد لگا دے وہ جائز نہیں رکھا۔ چاہے اس کے دل میں نہ ہو کہ میں اس کی عبادت کروں، مگر نام رکھنا بھی جائز نہیں۔ ممنوع قرار دیا۔ اس لئے کہ اس نام سے شرک کی بو آئے گی۔ توقیر اور تعظیم کا ذکر آئے گا تو انبیاء علیہم السلام کی بھی عظمت کی جائے گی، اولیاء اللہ کی بھی عظمت کی جائے گی، صلحاء مومنین کی بھی عظمت کی جائے گی۔

تعظیم اولیاء کرام...... مومن کا اکرام اور تعظیم شریعت نے فرض قرار دی ہے۔ فرمایا: اَلْمُسْلِمُ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ. ③ ''ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حرام قرار دیا ہے۔ یعنی اس کی جان اور اس کا خون بھی حرام اور اس کی آبرو بھی حرام''۔ نہ خون گرایا جائے نہ آبرو ریزی کی جائے نہ گالم گلوچ کی جائے۔ گویا ہر مسلمان کو باآبرو سمجھا گیا۔ تو مسلمانوں کا اعلیٰ ترین طبقہ اولیاء کرام ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان کی عزت اور حرمت فرض قرار دی گئی ہے۔ اولیاء سے بڑھ کر حضرات انبیاء علیہم السلام کا طبقہ ہے کہ وہ سارے عالم بشریت کا خلاصہ ہیں۔ ان کے حق میں ظاہر بات ہے کہ انتہائی تعظیم فرض قرار دی گئی ہے۔ اگر ذرا توہین ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

غرض ایک تعظیم وتوقیر ہے ایک عبادت ہے۔ اس میں یہ فرق ہے کہ عبادت خالص اللہ کے لئے ہے تعظیم اور توقیر بندوں کے لئے ہے۔ پھر جس درجے کے بندے ہوں گے، اسی درجے کی تعظیم کی جائے گی، لیکن جس تعظیم میں عبادت کی بو آنے لگے وہ تعظیم ممنوع ہو جائے گی۔

جزء عبادت بھی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں...... فقہاء حنفیہ لکھتے ہیں کہ سلام اتنا جھک کر کرنا کہ رکوع کی سی

---

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۷۹. ② السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء، ج: ۱۳، ص: ۱۱۳. ③ السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء مایستحب من الاسماء ج: ۱۰ ص: ۴۶.

صورت ہو جائے یہ نا جائز ہے۔ اسی لئے کہ اس میں عبادت کی بو آنے لگی اور اس میں عبدیت اور بندگی کا شبہ پیدا ہو گیا اور عبدیت اللہ کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں۔ تو سلام بھی اتنا جھک کر مت کرو کہ رکوع کی شکل ہو۔ کیونکہ رکوع عبادت کا جز ہے۔ رکوع کسی بندے کے آگے جائز نہیں۔

قیام و سجدہ کی ممانعت..... حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات جس درجہ عظیم و کریم ہے، اسی درجہ تعظیم کی بھی مستحق ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. ① ''جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ میرے آگے ہاتھ باندھ کے تعظیم سے کھڑے ہوں وہ جہنم میں جا کر اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لے''۔

تو اس کی ممانعت فرمائی کہ لوگ میری بارگاہ میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ فرمایا، میں بھی بندہ ہوں تم بھی بندے ہو، اللہ نے مجھ پر وحی کی یہ عظمت دی۔ اس کی تعظیم کرو، سامنے کھڑے ہو کر قیام کرنا، یہ اصطلاحی عبادت کا ایک جز ہے، اس واسطے شریعت اسلام نے مستقلاً قیام کو روکا۔ غرض انبیاء علیہم السلام دنیا میں موجود ہوں سجدہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر سجدہ کیا جائے وہ خود ناخوش ہو جائیں گے۔ رکوع نہیں کیا جائے گا۔ وہ رکوع کرنے والے کو خود اپنی بارگاہ سے نکالدیں گے۔ ہاتھ باندھ کے قیام نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے دھتکار دیں گے۔

اولیاء اللہ سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس لئے اولیاء اگر یہاں موجود ہوں تو ان کی بارگاہ میں ایسی حرکت جائز نہیں ہو سکتی تو وفات کے بعد کس طرح سے جائز ہو سکتی ہے؟

سجدۂ قبر کی ممانعت..... اسی واسطے حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِيْ وَثَنًا يُعْبَدُ. ② ''دیکھو میری قبر کو بت مت بنا لینا کہ اسے سجدہ کرو یا جا کر اس کی پوجا کرو''۔ اس معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ قیام دنیا میں بھی سجدہ سے روک دیا۔ جیسا کہ میں نے حدیث بیان کی اور وفات کے بعد بھی روکا کہ میری قبر کو سجدہ گاہ مت بنانا کہ اسے بت بنالو اور اسے سجدہ کرو۔

درود شریف کی عمومیت کی حکمت..... چنانچہ فرمایا صَلُّوْا عَلَيَّ حَيْثُ شِئْتُمْ. ③ ''درود شریف پڑھو، جہاں سے بھی پڑھو گے میرے پاس پہنچ جائے گا''۔ بہر حال ہم یہ دلائل شرعیہ سے سمجھے ہوئے ہیں کہ اولیاء اللہ کی تعظیم جزءِ ایمان ہے۔ ان کی محبت جزءِ ایمان ہے، لیکن عبادت حرام ہے چاہے وہ دنیا میں موجود ہوں یا وہ آخرت میں تشریف لے گئے ہوں، نہ ان کی عبادت کی جائے گی نہ ان کی قبروں کی عبادت کی جائے گی۔ ان کی ذات کی

---

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی کراهیة قیام الرجل للرجل ج: ۹ ص: ۲۱۷.

② موطا مالک، کتاب النداء للصلوٰة، باب جامع الصلوٰة ج: ۲ ص: ۲۱. (مرسل)

③ مسند ابی یعلی، مسند الحسن بن علی بن ابی طالب، ج: ۱۳ ص: ۲.

تعظیم زندگی میں بھی واجب اور وفات کے بعد بھی واجب۔ اس لئے قبروں پر بے ادبی کے ساتھ جانا یہ بھی بے ادبی ہے۔ ادب کے ساتھ حاضر ہونا چاہئے اور اسی طرح سمجھ کر کہ گویا وہ حضرات موجود ہیں۔

آداب زیارت قبور...... امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسند ابی حنیفہ میں روایت نقل کی ہے کہ آداب زیارت میں سے ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کرو اور میت کی طرف منہ کرو اس لئے کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تمہاری بات سنے گا۔ تو جب یہ تفصیل موجود ہے تو اولیاء وصلحاء کے مزارات پر بے ادبی اور گستاخی کسی طرح جائز نہیں اور اولیاء تو بڑی چیز ہیں، صلحاء مؤمنین کی قبروں کے ساتھ گستاخی جائز نہیں۔

چناں چہ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ قبر کو تکیہ لگا کر بیٹھنا یہ ممنوع ہے۔ قبر کو پھلانگ کر جانا یہ ممنوع ہے یا ادھر سے جائے یا ادھر سے جائے۔ قبر کے اوپر سے پھلانگ کر جانا یہ صاحب قبر کی بے حرمتی ہے۔ تو جس شریعت نے مؤمنین، صالحین، اور اولیاء اللہ کی اتنی توقیر کی ہو کہ ان کی زندگی میں بھی تہذیب سے پیش آؤ۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی قبروں سے توقیر وتعظیم کا معاملہ کرو۔ تو کون ہے جو ان کی قبروں کی بے ادبی جائز رکھے گا۔؟ کون مسلمان ہے جو کسی درجہ میں بھی اولیاء اللہ کی حیا ومیتاً گستاخی جائز قرار دے گا؟ علماء دیو بند نہ صرف جانا بلکہ مستقل مقصود سفر بنا کر جانا جائز قرار دیتے ہیں۔

وھابی اہل نجد کا عقیدہ...... البتہ نجد کے لوگ جو خود کو وہابی کہلواتے ہیں۔ وہ ممانعت کرتے ہیں اور بے ادبی سے پیش آتے ہیں۔ وہ روضہ اقدس کے پاس جانے کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کر کے جاؤ۔ مزار اقدس کی نیت کر کے نہ جاؤ۔

زیارت روضہ اطہر کی نیت سے سفر...... تو علماء دیو بند ان کا خلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جانا ضروری ہے جو شخص بھی حج کو جائے وہ قبر شریف کو مقصد بنا کر مدینہ منورہ حاضر ہو۔ مسجد کی حاضری تو جداگانہ عبادت و طاعت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی نیت سے سفر کرے۔ احادیث میں ایسے عنوانات موجود ہیں۔ مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ. ① ''جس نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت اس کے حق میں واجب ہوگئی''۔ بعض روایات میں ہے کہ مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ. ② ''جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہ آیا اس نے میرے اوپر ظلم کیا''۔

علماء دیو بند تو فقط زیارت قبر شریف ہی کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ زیارت قبر کے لئے سفر کر کے بھی جانا جائز قرار دیتے ہیں۔ تو جو جماعت اس درجہ آگے بڑھی ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ روکتی ہے سوائے

---

① سنن الدارقطنی، کتاب الحج، باب المواقیت ج: ۲ ص: ۲۷۸۔ ② علامہ سخاوی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ابن عدی، والدارقطنی فی "العلل" وابن حبان فی "الضعفاء" والخطیب فی "رواۃ مالک" بسند ضعیف جداً عن ابن عمرؓ دیکھئے: الدرر المنتثرۃ فی الاحادیث المشتھرۃ، حرف المیم ج: ۱ ص: ۱۹۔

جھوٹ، اتہام اور افتراء کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

علماء دیوبند کے خلاف بے جا اشتعال...... بس میں نے یہ عرض کیا کہ جماعت علماء دیوبند بے ادبیوں کو ناجائز کہتی ہے اور قبر پر جا کر سجدہ کرنا یہ صاحب قبر کی گستاخی ہے۔ اس لئے کہ جس صاحب قبر نے کبھی قبر کو سجدہ نہ کیا ہو اس کی قبر پر جاکے آپ سجدہ کریں، اس کا کتنا دل دکھے گا، جس نبی اور پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر یہ تعلیم دی ہو کہ غیر اللہ کے آگے کبھی سجدہ مت کرنا۔ اس نبی کی قبر پہ جاکے آپ سجدہ کریں تو اس نبی اکرم کے اوپر کیا گزرے گی؟ ان کو اس بندے سے کتنی نفرت پیدا ہوگی۔ جو شرک میں مبتلا ہوا۔ تو بدعات ومنکرات کو روکا جاتا ہے۔ لوگ اس کو اصل کا روکنا قرار دیدیتے ہیں اور یہ محض اشتعال دلانے کے لئے ایسا کرتے ہیں اس لئے کہ دوسرے لوگ، لوگوں کو ان منکرات و بدعات کے اندر مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ جب بدعات سے روکتے ہیں تو وہ ہمارے خلاف اشتعال دلانے کو کہتے ہیں کہ یہ تو قبروں پر ہی جانے سے روکتے ہیں۔ یہ تو اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت ہی کو ناجائز کہتے ہیں۔ جسے جائز کہتے ہیں وہ الگ ہے، جسے ناجائز کہتے ہیں وہ الگ ہے۔ گستاخی کرنا ناجائز ہے۔ زیارت کرنا عین طاعت ہے۔ زیارت قبور کرنا عین مقصدِ دین ہے۔

ایصالِ ثواب کی ممانعت کا الزام...... سوال: یہ بھی کہتے ہیں کہ قبروں پر فاتحہ اور درود کو منع کرتے ہیں۔ اگر فاتحہ پڑھنے سے منع کریں تو قبروں پہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر قبروں پر تو فاتحہ ہی پڑھنے کے لئے جاتے ہیں کہ وہاں ایصالِ ثواب کریں اور یہ فاتحہ کا عنوان بھی کچھ نیا عنوان ہے۔ ایصالِ ثواب کے لئے فاتحہ کا لفظ بعد میں لوگوں نے گھڑ لیا ہے۔ اصل لفظ ایصالِ ثواب ہے۔ بلکہ ایصالِ ثواب کے سلسلہ میں جن سورتوں کے تذکرے آتے ہیں ان میں فاتحہ کا ذکر تک بھی نہیں۔ اخلاص، زلزال اور کافرون کا ذکر آتا ہے۔ سورت فاتحہ کا ذکر نہیں۔ نامعلوم فاتحہ کا لفظ کہاں سے استعمال کیا گیا ہے۔ سیدھا جو لفظ شرعی ہے۔ وہ ''ایصالِ ثواب'' ہے کہ ثواب پہنچاؤ۔ اب اس میں جس کو جو سورت یاد ہو۔ اخلاص (قل ھو اللہ) کو اس لئے فرمایا گیا ہے کہ مختصر سورت ہے۔ ایک دفعہ پڑھنے پر ایک تہائی قرآن کا اجر ملتا ہے، اگر تین دفعہ پڑھ لے تو گویا پورے قرآن کا اجر حاصل ہو گیا، گویا پورے قرآن کا ثواب پہنچ جائے گا۔ اور سورت کافرون کا فرمایا گیا کہ یہ ربع قرآن یعنی چوتھائی ہے۔ تو قرآن کے چوتھائی کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اگر کسی نے چار دفعہ یہ سورت پڑھ لی تو گویا پورے قرآن کا ثواب ہو گیا اور وہ پہنچا دیا۔

سورت زلزال کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کا ثواب نصف قرآن کے برابر ہے۔ تو اگر کسی نے دو دفعہ سورت کو پڑھ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو پورے قرآن کا ثواب ہو گیا۔ تو ان سورتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ تھوڑے سے وقت میں ثواب زیادہ ہو جائے۔ اور جو اس سے زیادہ پڑھے مثلاً سورت یٰسین ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کے پڑھنے سے دس قرآن کا ثواب ملتا ہے۔ اگر کوئی باہمت آدمی یہ سورت پڑھ لے تو سبحان اللہ نور علیٰ نور ہے۔ دس قرآن کا ثواب پہنچائے۔ اور اس میں اچھی صورت یہ ہے کہ اگر وقت کم ہو تو قبر کی زیارت کو گھر

سے چلے تو اسی وقت سورت یٰسین پڑھنا شروع کر دے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جائے گی۔ وہاں جا کر ثواب پہنچا دے۔ تو یہ جو چند سورتوں کی تخصیص کی گئی۔ یہ اس لئے کہ وقت کم لگے اور ثواب زیادہ ہو۔ ورنہ جو بھی آیات پڑھ کے ثواب پہنچائے گا۔ ہر حرف پر دس نیکی کا وعدہ ہے۔ اگر الم کا لفظ پڑھ کر ثواب پہنچائے تو تیس نیکیوں کا ثواب ہو گیا۔ تو جتنا چاہے ثواب پہنچائے۔ تو یہ کہنا کہ فاتحہ سے روکتے ہیں۔ یہ بالکل کذب محض، افتراء اور دوسروں پر اتہام ہے۔ اور خدا جانے یہ چیزیں کہاں سے لی گئی ہیں۔ ان حضرات کا نہ یہ عمل ہے نہ یہ عقیدہ ہے۔ تو کسی شخص کے اوپر یا کسی جماعت کے اوپر اس کے عقیدے یا اس کے عمل کے خلاف اس پر تہمت باندھنا، افتراء پردازی سوائے اس کے کہ عوام کو بھڑ کانے کے لئے یہ حرکت کی جائے۔ اس کی کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی یا یہ کہ ان کا اس میں کوئی فائدہ ہوگا۔ وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ اگر یہ علماء دیو بند جانے لگیں تو ہمارا یہ فائدہ رک جائے گا۔ تو فائدے میں ہم حارج نہیں ہیں۔ تم فائدے اٹھاؤ مگر افتراء پردازی کی کیا ضرورت ہے؟ غرض یہ چیز بالکل غلط ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخی...... دوسرا سوال یہ کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نعوذ باللہ یہ کہتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد مٹی میں مل گئے ہیں۔ یہ بھی بالکل جھوٹ اور افتراء پردازی ہے۔ یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کے معتقدین کا ہے۔ جن کو ''وھابی'' کہا جاتا ہے۔ علماء دیو بند اس عقیدے سے بری ہیں۔

علماء دیو بند کہتے ہیں کہ حدیث صحیح میں فرمایا گیا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کے بدنوں کو زمین کے اوپر حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ مٹی ان کو نہیں کھا سکتی۔ تو یہ کہنا کہ مٹی میں مل کے مٹی ہو گئے، یہ بالکل جھوٹ ہے اور علماء دیو بند پر جھوٹ نہیں بلکہ حدیث پر جھوٹ لگاتا ہے۔ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ وہی عقیدہ علماء دیو بند کا ہے۔

اور علماء دیو بند صرف یہی نہیں کہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مٹی میں بالکل صحیح وسالم محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا بلکہ علماء دیو بند کا عقیدہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی اسی طرح سے جسم کے ساتھ زندہ ہیں جس طرح سے جسم کے ساتھ دنیا میں تھے اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ فقط یہ نہیں کہ بدن محفوظ ہے بلکہ بدن میں وہی حیات محفوظ ہے جو حیات دنیا کے اندر محفوظ تھی۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم جی اور زندہ ہیں۔

علامات حیات...... صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَنَبِيُّ اللّٰهِ يُرْزَقُ. ''اللہ کا نبی زندہ ہے اور اس کو رزق دیا جا رہا ہے''۔ تو کھانے پینے کے لئے رزق عطاء کیا جا رہا ہے۔ اب جیسا وہاں کا عالم ہے رزق بھی ویسا ہی ہوگا اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ پلاؤ زردہ اور گیہوں کی روٹی ہو۔ جیسے روح پاک اور جسم پاک لطیف ہے۔ تو لطیف ترین غذائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تجویز کی گئی ہیں وہ پہنچتی ہیں۔

اسی طرح سے حدیث پاک میں فرمایا گیا اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ. ① ''انبیاء علیہم السلام

① مسند ابی یعلی الموصلی، ثابت البنانی عن انس، ج:۷، ص:۴۴۳.

اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں'' تو حیات کے لئے دو چیزیں علامت ہوتی ہیں۔ ایک خورد ونوش وہ بھی حدیث سے ثابت ہے اور ایک حرکت وہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔

بلکہ اعلیٰ ترین حرکت حرکت عباداتی ثابت ہے۔ غرض حیات آج بھی ثابت ہے۔ البتہ یہ ہے کہ آثار و افعال کو روک دیا گیا ہے۔ کہ وہ جو دعوت وتبلیغ کے کئے جاتے تھے وہ روک دیا گیا۔ اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک روشن چراغ ہو یا روشن بتی یا قمقمہ ہو آپ اسے ہنڈیا میں بند کردیں تو اس کی روشنی میں کوئی فرق نہیں آیا مگر جو اس کی کرنیں ہیں وہ عالم سے منقطع ہو گئیں۔ وہ جو چاندنا پھیل رہا تھا وہ ایک ہنڈیا میں چلا گیا۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک میں تشریف لے گئے، حیات اور روشنی اور فیضان کی وہی نوعیت ہے جو اس عالم میں تھی۔ مگر اب عالم قبر میں محدود کردی گئی اور اس عالم سے منقطع کردی گئی۔ مگر اس کے باوجود ہم اس کے قائل ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں تشریف نہیں لاتے لیکن روحانی فیض جاری ہے۔ یہ جو ہمارا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان سنبھلا ہوا ہے یہ اسی فیض سے تو سنبھلا ہوا ہے۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ادھر توجہ نہ ہو تو ایمان باقی نہیں رہ سکتا۔ اصل مومن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں اور لوگ مومن ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کا پرتو پڑ گیا جو ہم مومن کہلانے لگے۔ ورنہ اصل مومن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ جو ایمانی فیض ہے وہ برابر جاری ہے۔ غرض یہ کہنا کہ انبیاء علیہم السلام مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے۔ (العیاذ باللہ)

یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے ہمارا عقیدہ نہیں۔ ہمیں زبردستی اور خواہ مخواہ وہابی اور نجدی بنا دیا۔ یہ فقط اشتعال انگیزی ہے اور یہ محض اس لئے کہ چونکہ ہم بدعات کا رد کرتے ہیں تو اس کے جواب میں نجدیوں اور وہابیوں سے نسب نامہ جوڑ دیا، حالانکہ کہاں نجدی وہابی اور کہاں دیوبندی؟۔

غرض یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے کہ مٹی میں مل گئے۔ ہم اس کا رد کرتے ہیں کہ یہ غلط عقیدہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ تھے۔

استدلالِ حیات ...... اور یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت نہیں بٹی۔ نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَآءِ لَانُوْرِثُ. ① ''انبیاء علیہم السلام وہ گروہ ہیں کہ ہم وراثت میں کسی کو وارث نہیں بناتے''۔ اس لئے کہ وراثت مردہ کی بٹا کرتی ہے۔ زندہ کی وراثت بٹنے کے کیا معنی؟ جب آپ اسی طرح سے زندہ ہیں تو جو اس وقت آپ کی ملک تھی آج بھی آپ کی ملک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے کسی کا نکاح جائز نہیں۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں تو کسی زندہ کی بیوی سے کس کی مجال ہے کہ نکاح کرے۔ بیوہ سے نکاح ہوتا

① الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب حدیث بنی نضیر، ج: ۱۲، ص: ۳۲۰۔

ہے نہ کہ زندہ خاوند کی بیوی سے۔

غرض جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو آپ کے مال میں وراثت نہیں بٹ سکتی۔ یہ دلائل ہیں جو آپ نے حیاتِ انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں پیش کئے ہیں جو ان دلائل کے قائل ہوں، ان کی طرف نسبت کر کے یہ کہنا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کہتے کہ قبر میں مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے۔ تو یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ عقیدہ کسی کا ہو اور جوڑ دیا کہیں۔ تو جو لوگ اتنی بے تحقیق بات کہیں کہ انہیں یہ پتہ نہیں کہ کس کا عقیدہ ہے اور کس کی طرف منسوب کر رہے ہیں کیا وہ اسی طرح سے اسٹیج پر مسلمانوں کی تربیت کریں گے؟

ہاں یوں کہو کہ فلاں کا عقیدہ ہے اور فلاں کا نہیں ہے۔ ایک لاٹھی سے ہانک دینا یہ تو کذبِ محض اور افتراء محض ہے اس لئے یہ سوال بھی بالکل بے محل ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بری ہیں۔

نذر و نیاز یا ایصالِ ثواب...... ایک یہ سوال کیا گیا ہے کہ اولیاء اللہ اور دوسرے حضرات جو اس دنیا سے جا چکے ہیں، انکے نام کی نذر و نیاز اور ایصالِ ثواب سے منع کرتے ہیں۔ یہ بھی وہی بات ہے۔ ایصالِ ثواب کو تو ہم خود کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہنا کہ یہ ایصالِ ثواب کو روکتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے۔ ہم لوگ چشتی ہیں اور چشتیہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جب صبح و شام بیٹھ کر اپنے معمولات کو پڑھو کوئی ذکر و شغل کرو یا نفی اثبات کرو۔ تو ہمارے اکابر اور بزرگوں کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کم سے کم تین مرتبہ "سورۃ اخلاص" پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ کے تمام بزرگوں کو ثواب پہنچاؤ اور پھر دعا مانگو کہ یا اللہ! ان کے طفیل سے ہمارے قلب میں بھی نورانیت پیدا فرما دے۔ تو جن کے صبح و شام روزانہ کا معمول یہ ہو کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ثواب پہنچاتے ہوں اور اولیاء سلسلہ کو بھی۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایصالِ ثواب سے منع کرتے ہیں یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔ ایک بے وجہ کی تہمت لگائی ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ ان سے نفرت دلانے کے لئے جہاں جیسا موقع ہوا ویسا ہی اٹھا کے جھوٹ بول دیا۔ بالکل بے اصل چیز ہے۔ غرض ایصالِ ثواب کے قائل ہی نہیں بلکہ ان کے معمولات میں داخل ہے۔ جیسے روزانہ تسبیح و تہلیل معمولات میں ہے۔ خود ہم لوگ بھی اس کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنے معمولات شروع کرنے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیرانِ سلسلہ کو ثواب پہنچائے اب آگے رہ گئی نذر و نیاز؟

تو اگر نذر و نیاز کے یہ معنی ہیں کہ بھائی! مال دے دو اور ثواب پہنچاؤ تو اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ تو جائز ہے۔ آپ نے چار فقیروں کو کھانا کھلا دیا اور یہ نیت کی کہ اس کا ثواب فلاں فلاں بزرگ کو پہنچے۔ حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ وہ پہنچے گا علماء دیوبند بھی اس کے قائل ہیں اور نہ صرف اس کے قائل ہیں بلکہ اس کا بھی ان کے ہاں معمول ہے۔ تقریباً سال میں ایک دو مرتبہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بکرا ذبح کر کے کھانا پکایا اور غریبوں میں ایصالِ ثواب کے لئے تقسیم کر دیا۔

جو صاحب حیثیت ہیں وہ بڑا جانور ذبح کر کے بہت سوں کی دعوت کر دیتے ہیں جو بے چارے کم حیثیت ہیں انہوں نے دو چار پیسے صدقہ کر دیئے۔ بہر حال اگر نذر و نیاز کے معنی یہ ہیں کہ مالی عبادت کا ثواب پہنچاؤ تو اس

میں کوئی حرج نہیں۔ ہم اس کو شرعاً جائز سمجھتے ہیں اور ہمارا معمول ہے۔

مشرکانہ نذر و نیاز...... ایک نذر و نیاز کے معنی بھینٹ چڑھانا ہے کہ کسی بکرے کو لے جا کر قبر پر باندھ دے یا کسی بزرگ اور فقیر کے نام پر چھوڑ دو اس کو ہم شرک جانتے ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کی نذر و نیاز صرف اللہ کے نام کی ہو سکتی ہے۔ صرف اللہ کے نام پر جانور چھوڑا جا سکتا ہے۔ جیسے آپ حج پر جائیں تو "ھدی" لے کر جانا یا ھدی کو چھوڑ دینا، یعنی اونٹنی خدا کے نام پر چھوڑ دینا یہ اللہ کے لئے جائز ہے۔ غیر اللہ کے لئے جائز نہیں۔ مشرکین مکہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مختلف قسم کے جانور اپنے بزرگوں اور بتوں کے نام پر چھوڑا کرتے تھے۔ ایک کو سائبہ، ایک کو وصیلہ اور ایک کو حام کہتے تھے۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

مثلاً جس اونٹنی نے دس دفعہ بچے جن دیئے ہوں۔ جب وہ جن چکی اب اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ جس نے پہلا حمل جنا اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے، اس کو کچھ نام دیدیتے تھے اور اسکے گلے میں ہار ڈال دیتے تھے اور عقیدہ یہ رکھتے تھے کہ یہ فلاں بت کے لئے اور یہ فلاں بت کے لئے قرآن کریم نے اس کا رد کیا۔ فرمایا ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ ① "اللہ نے نہ سائبہ رکھا نہ بحیرہ نہ وصیلہ، نہ حام رکھا کہ بتوں کو نذر و نیاز کرو۔ یہ اللہ پر افتراء ہے کہ بھینٹ چڑھاؤ بتوں کے نام پر اور یہ کہو کہ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا. اللہ نے ہمیں امر کیا ہے۔ فرماتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے۔ ہم نے اس کا امر نہیں کیا۔

غرض نذر و نیاز کے معنی اگر مالی عبادت کے ہیں کہ کھانا پکا کے غریبوں کو کھلاؤ اور اس کا ثواب پہنچاؤ۔ یہ جائز ہے، اگر کپڑا دینا ہو تو ثواب کی نیت کر دو۔ یہ بھی جائز ہے۔ تلاوت قرآن کریم کر کے ثواب پہنچاؤ، یہ بھی جائز ہے، غرض بدنی عبادت ہو یا مالی عبادت ہو، دونوں کا ثواب پہنچتا ہے۔ اگر مالی عبادت کو آپ نذر و نیاز کہتے ہیں، علماء دیوبند اس کے منکر نہیں اور اگر نذر کے معنی چڑھاوے کے ہیں کسی کے نام پر خواہ وہ کتنا ہی بڑا ولی ہو یا نبی ہو۔ اس کو قرآن کریم نے روکا ہے اور اس کو علمائے دیوبند بھی روکتے ہیں۔ تو مطلقاً یہ کہہ دینا کہ نذر و نیاز سے روکتے ہیں یہ غلط ہے۔ ایک خاص نذر ہے جس میں شرک ہے اس کو روکتے ہیں۔ مطلقاً مالی عبادت کا ثواب پہنچانا اس کو کسی نے نہیں روکا۔ یہ جائز ہے اور ان حضرات کا بھی یہ عمل جاری ہے۔

ذبیحہ کی نامزدگی...... اسی طرح کسی بزرگ کے نام پر ذبیحہ کرنا یہ بھی ناجائز ہے۔ فقط اللہ کے نام پر ذبح ہوگا۔ جب بھی آپ ذبح کریں گے تو یوں کہیں گے۔ بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ. یا جب بھی قربانی کرتے ہیں، اس میں بھی آپ اللہ کا نام لیتے ہیں۔ تو ذبیحہ تو صرف اللہ کے نام پر ہوگا لیکن جس کو ثواب پہنچانا چاہیں آپ نام لے سکتے ہیں کہ "اے اللہ! میں اس ذبیحہ کو کرتا ہوں تاکہ ثواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دے یا فلاں بزرگ کو پہنچا دے"۔

① پارہ: ۷، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۰۳۔

تو ایک ہے ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کرنا کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کر رہا ہوں۔ یہ جائز ہے اور ایک ہے کسی کے نام پر ذبح کرنا یہ عبادت ہے۔ تو ذبح تو اللہ کے نام پر ہوگا اور ثواب کے لئے کسی ایک یا دو یا بیس کو نامزد کر دیں اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اگر نذر کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو ثواب کے لئے نامزد کردے کہ مثلاً میں فلاں بزرگ کو ایصال ثواب کے لئے یہ کھانا پکا رہا ہوں۔ اس میں کچھ حرج نہیں۔ ایک کو نامزد کرو، دو کو نامزد کرو، بے شک تمام اولیاء امت کے نام لگاؤ۔ اور یہ کہ فلاں کے نام پر ذبح کرتا ہوں اور ثواب کا کوئی ذکر نہیں۔ جو نام پر ذبیحہ ہوگا وہ صرف اللہ کے نام پر چھوڑا جائے گا وہ کسی بزرگ کے نام پر نہیں چھوڑا جائے گا۔

بہر حال میں نے عرض کیا کہ اگر نذر و نیاز کے معنی ایصال ثواب کے ہیں یا نامزد کرنے کے ہیں کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے اس بکرے کو ذبح کر رہا ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے ہم بھی اس کے قائل ہیں اور اگر نذر و نیاز کے یہ معنی ہیں کہ ثواب کا کوئی ذکر نہیں اور فلاں بزرگ کے نام پر میں اس کو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ جائز نہیں بالکل ایسا ہی ہے جیسے مشرکین مکہ بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور قرآن کریم نے اس کا رد کیا ہے۔

ہدیہ ضیافت یا صدقہ ایصال ثواب...... اگر ایصال ثواب کے لئے کچھ پکائیں تو وہ غرباء کا حق ہوگا۔ اغنیاء کا حق نہیں ہے کہ وہ کھائیں اس لئے کہ یہ صدقہ ہے۔ یہ رسم ہے کہ آپ نے رشتہ داروں اور برادری کو جمع کیا اور ان کو کھلا دیا۔ یہ صدقہ کیا ہوا۔ یہ تو نام و نمود کی دعوت ہوگئی۔ صدقہ اس کو کہتے ہیں کہ آپ فقیروں کو کھلائیں تاکہ آپ کو ثواب ہو۔ اور اغنیاء کو اگر کھلائیں تو اس میں ثواب نہیں ہوگا۔

ہاں اس طرح ثواب ہو سکتا ہے کہ آپ ہدیہ کی نیت کریں کہ خوشی کے طور پر دعوت کر رہا ہوں۔ اس میں ایصال ثواب کا کوئی تذکرہ نہ ہو۔ غرض ایک یہ ہے کہ اپنے بھائی بندوں کو دعوت پہ بلانا۔ تو یہ ضیافت اور ان کے لئے ہدیہ ہے جو آپ ان کے لئے گویا پیش کر رہے ہیں۔ اس میں ایصال ثواب کی نیت نہیں ہوئی اور ایک ایصال ثواب کے لئے صدقہ کرنا ہے اس کو ہدیہ نہیں کہتے۔ تو صدقہ کے لئے غریب کا ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ اغنیاء اور مال داروں کو بلا کر کھلا دیں گے تو وہ کھانا بھی کھا جائیں گے اور ثواب بھی سارا کھا جائیں گے۔ وہ کسی اور کو نہیں پہنچے گا۔

ایصال ثواب کے لئے ایام کی تخصیص...... سوال نمبر: ایسے عزیز و اقارب اور متوفیان کے لئے اگر تیسرے یا دسویں اور چالیسویں کوئی کھانا وغیرہ پکا کر اس پر فاتحہ دیں اور برادری وغیرہ کو جمع کر کے کھلائیں۔ اس کو بھی علماء دیوبند منع کرتے ہیں؟

(جواب) تو اتنی بات معلوم ہوگئی کہ ایصال ثواب سے تو نہیں روکتے۔ اس لئے کہ شریعت نے اجازت دی ہے کسی کو روکنے کا کیا حق ہے۔ اب اس میں اپنی طرف سے قیدیں بڑھانا کہ تیسرے دن کرو، چوتھے دن کرو، اگر یہ اتفاقاً ہے تو بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اتفاق سے آپ کے دل میں آیا کہ میں میت کو ایصال ثواب کروں اور وہ تیسرا دن تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں یا دسواں اور چالیسواں دن اتفاق کے طور پر تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن اگر یہ سمجھ کر آپ کریں کہ چالیسویں دن تو پہنچے گا ورنہ نہیں۔ تو یہ غلط ہے کہ یہ عقیدے میں خلل اندازی ہے، عقیدے میں برابر قرار دیا گیا ہے کہ چالیسویں دن پہنچائے، جب پہنچے گا۔ اتنالیسویں دن پہنچائے، جب بھی پہنچے گا تو جس چیز کو شریعت عام قرار دے اس کو خاص بنا دینا یہ امت کا حق نہیں۔ یہ صرف رسول کا حق ہے۔ جس چیز کو اللہ کا رسول خاص قرار دے۔ اس کو عام کرنا یہ امت کا حق نہیں۔

مثلاً رمضان شریف کے لئے شریعت نے تیس روزے خاص کر دیئے امت کو حق نہیں کہ وہ شعبان کے بھی روزے رکھا کرے کہ ہم اس کو بھی رمضان سمجھتے ہیں۔ اپنی طرف سے تخصیص کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح شریعت نے نماز کے پانچ اوقات مقرر کئے ہیں۔ بندہ پابند اور مقید ہے کہ انہی اوقات میں نماز ادا کرے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ میں آج ظہر کو عشاء کے بعد ادا کروں گا یا عصر کے بعد پڑھ لوں گا اور یہ کہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس میں حرج یہ ہے کہ اللہ نے نمازوں کے اوقات خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾ ① اللہ نے نماز وقت کی قید کے ساتھ فرض کی ہے تو وقت کی قید اٹھانے والا کوئی دوسرا کون ہوسکتا ہے؟ کہ خدا تو قید لگائے اور وہ اٹھائے۔ یہ تو اللہ کا مقابلہ ہے تو جہاں شریعت نے قید لگا دی اسے اٹھانے کا حق نہیں اور جہاں قید نہیں لگائی اور بے قید رکھا۔ وہاں قید لگانے کا کسی کو حق نہیں۔ دونوں چیزیں برابر ہیں تو مقید کو مطلق کرنا اور مطلق کو مقید کرنا یہ صرف شارع علیہ السلام کا کام ہے۔ اللہ ورسول کا کام ہے کسی غیر کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

دوام والتزام کا فرق...... پھر اس میں دوسرا فرق یہ کہ ایک ہے وقت کا تقید کرنا اپنی سہولت کے لئے۔ مثلاً میرے پاس فلاں مہینہ کے فلاں دن آمدن زیادہ ہوتی ہے۔ اس دن میں اچھے حالات کے لحاظ سے کر سکتا ہوں۔ ورنہ مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر اتنا کریں اور دوسرے کو ملامت نہ کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ یہ سب دنوں کو برابر سمجھتا ہے اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ جیسے مثلاً آپ حضرات تاجر ہیں اور سیزن کا کوئی مہینہ آگیا۔ اس میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے اور بکری زیادہ ہوتی ہے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اس مہینے میں غرباء کو کھانا کھلایا کروں گا۔

تو یہ ایک عمل ہے اس عمل پر آپ نے اتفاقی احوال کے لحاظ سے دوام کر لیا آپ کے عقیدے میں یہ نہیں ہے کہ اس دن ثواب پہنچاؤں گا تو پہنچے گا۔ ورنہ نہیں پہنچے گا۔ اس واسطے کہ اگر کوئی شعبان میں کرتا ہے تو اس کو بھی صحیح قرار دے رہے ہیں اور ایک نے اتفاق سے شوال میں کیا۔ آپ نے کہا اس نے بھی ٹھیک کیا۔ اب آپ خود جس مہینے میں دوام کر رہے ہیں تو اس کے خلاف کو بھی جائز سمجھتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔

بہر حال یہ سمجھنا کہ اس مہینے میں ہوگا اور اس کے خلاف کو ناجائز سمجھنا یہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بنانا جائز نہیں جب تک اللہ کا رسول عقیدہ نہ بتلائے۔ غرض ایک ہے دوام اور ایک ہے التزام۔ دوام اور التزام میں فرق ہے تو

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۰۳۔

ایک یہ ہے کہ آدمی کسی مہینے کا پابند بن جائے اور عقیدے میں یہ سمجھے کہ یہ کام اسی مہینے ہوسکتا ہے، یہ مہینہ نکل گیا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ یہ جائز نہیں۔ کیونکہ یہ عقیدہ ہے اور ایک التزام کے بغیر دوام ہے کہ میری مصلحت کے لحاظ سے میں اس مہینے میں کھلاسکتا ہوں اور عمر بھر اس کا پابند ہوگیا۔ عقیدہ یہ ہے کہ جائز اس میں بھی ہے دوسرے میں بھی جائز ہے۔ یہ ایک ذاتی مصلحت ہوگی۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مشابہت سے احتراز...... بس اب اتنی بات دیکھی جائے گی کہ اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی موجود ہے جو اس خاص مہینے میں یا اس وقت کو لازم سمجھتی ہے اور آپ نہیں سمجھتے لیکن اگر آپ عمل کریں گے تو آپ پر تہمت یہ آئے گی کہ ان کا بھی وہی عقیدہ ہے۔ ایسے میں مشابہت کی وجہ سے ترک کردینا چاہئے۔ لیکن اگر سارے ہی ایسے ہوتے کہ فی نفسہٖ ہر مہینے میں جائز سمجھتے لیکن اپنی مصلحت کی وجہ سے کسی نے کوئی مہینہ اختیار کرلیا کسی نے کوئی۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ فی نفسہٖ عقیدہ بنائے بغیر عمل کا اپنے کو پابند کرلینا جائز ہے لیکن بعض مصالح کی وجہ سے ترک کرایا جائے گا، اگر کوئی قوم دنیا میں اسے لازم سمجھتی ہے اور آپ اسے لازم نہیں سمجھتے مگر عملاً وہی کررہے ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ ان کا بھی وہی (لازم سمجھنے کا) عقیدہ ہے تو لوگ اس سے حجت پکڑیں گے تو ایسے مواقع پر ممانعت کی جائے گی۔ مگر وہ ممانعت مطلقاً ہوگی حرام یا ناجائز ہونے کی وجہ سے اس فعل کی ممانعت نہیں ہوگی۔ بہر حال اس سے آپ سمجھ گئے کہ عزیز واقرباء یا متوفیان کے لئے تیسرے دسویں یا چالیسویں دن کھانا پکا کر فاتحہ دے کر برادری کو بلا کر دعوت کھلانے سے جو علماء دیوبند روکتے ہیں اس کا آپ تجزیہ کرلیں کہ کیوں روکتے ہیں۔ بات کو گول مول نہ رکھئے۔ اب تک میں نے تیسرے، دسویں اور چالیسویں دن کے روکنے کے بارے میں کلام کیا کہ ان کو عقیدہ بنا کر مخصوص کرنا تو ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اگر اپنی مصلحت کی وجہ سے خاص کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔

چہلم، برسی ہندوانہ رسم ہے...... مگر یہ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ کو فرض کیجئے تیسرے دن اور محرم کے مہینے کی سہولت ہے تو کیا ضروری ہے کہ جس کا عزیز مرے وہ محرم ہی کے مہینے میں مرے، اتفاق سے وہ شعبان کے مہینے میں انتقال کر گیا تو وہ کون سا دن ہوگا جس میں آپ کو سہولت ہوگی۔ تجارت کا تو ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ تو یہ تیسرا دسواں اور چالیسواں بلکہ چہلم یہ کوئی قید شریعت میں نہیں ہے۔ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ تابعین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت۔ یہ ایک بے اصل سی چیز ہے۔

بلکہ اگر ثابت ہے تو یہ ہندوؤں سے ثابت ہے۔ ان کے ہاں تیسرا بھی ہے، چوتھا بھی ہے، چالیسواں بھی ہے، برسی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسم وہیں سے لی گئی ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں میں رسوم کی پابندی کی وجہ...... اور اس کی بناء درحقیقت یہ ہوئی ہے اور بھی بہت سی رسمیں اسی طرح ہیں۔ غرض اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس کی بناء یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضرات صوفیاء کرام کے صدقے پھیلا ہے تو ان حضرات کے طفیل سے ہندوستان کے جو لوگ مشرک تھے، وہ دائرہ اسلام

میں داخل ہوئے۔ چناں چہ نانوے لاکھ آدمی تنہا حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں اور آپ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو ہوئے ہیں وہ تعداد اس کے علاوہ ہے۔ اسی طرح اور حضرات صوفیاء ہیں۔ تو کروڑوں کی تعداد میں ان حضرات کی دیانت، امانت، سچائی، خلوص اور بزرگی دیکھ دیکھ کر خود بخود جوق در جوق لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اسلام میں داخل ہوگئے۔ لیکن ان کی تعلیم کا بندوبست پورا نہیں ہوسکا۔ حکومتوں نے توجہ نہیں کی۔ عوام مسلمین نے دھیان نہ کیا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں تو داخل ہوگئے مگر مسائل کا علم نہیں ہوسکا۔

تو جو رسمیں انہوں نے اسلام کے نام سے کرنی شروع کردیں۔ مثلاً ان کے دیوالی کی چھڑی نکلتی تھی انہوں نے بھی بعض بزرگوں کے نام پر جھنڈا نکالنا شروع کردیا۔ ان کے ہاں ستی کے اوپر پرشات چڑھتا تھا انہوں نے جاکر قبروں پر مٹھائی چڑھادی۔ ان کے ہاں کسی دیوتا کے نام پر کوئی کام ہوتا تھا انہوں نے وہ کام کسی بزرگ کے نام پر کردیا۔

تو اسلام کا ایڈیشن بنادیا جب کہ حقیقت وہی تھی جو پہلے سے آرہی تھی۔ غرض اس کی بنا یہی ہوئی کہ اسلام میں داخل تو جوق در جوق ہوئے مگر ان کی تعلیم نہ ہوسکی۔ تو وہ عورتیں اور مرد جو رسمیں ان کے گھروں میں تھیں ان کے اپنے ذہن سے یا کسی کے کہنے سے انہی کا نقشہ بدل کے وہ سب اسلام بنادیئے۔ اب وہ ساری رسمیں اسی طرح سے چلی آرہی ہیں۔ اب جبکہ کوئی عالم اس کو ناجائز کہتا ہے تو خفا ہوتے ہیں کہ باپ دادا سے تو ہم یہ رسمیں کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ کون ہوتا ہے منع کرنے والا؟

پھر اس کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کافر ہے دائرہ اسلام سے خارج ہے حالانکہ وہ ان کی خیر خواہی میں یہ سب کچھ کر رہا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین اصلی وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے پیش فرمایا۔ اسلام کا مزاج یہ ہے۔ یہ رسوم وغیرہ یہ شرکیہ مزاج ہے۔ لوگ اس کو نہیں سنتے۔ بلکہ اس رسم پر زور دیتے ہیں۔

ہندو مسلم اختلاط کے اثرات..... تو زیادہ تر یہ رسمیں ابنائے وطن (ہندوؤں) سے آئی ہیں اور پورے ہندوستان میں اس کا مسلمانوں کے دین پر اثر پڑا ہے۔ بعض چیزیں انہوں نے بھی آپ کی قبول کیں اور رفتہ رفتہ ان میں توحید آئی کہ ایک ان میں مستقل ایسا فرقہ (آریوں کا) پیدا ہوگیا۔ جو شرک اور بت پرستی کو رد کرتا ہے اور مسلمانوں میں شرک اور بت پرستی اسلام سے پیدا ہوگئی ہے کہ آپ اپنے ذہن میں اسلام سمجھ کر رہے ہیں اور حقیقت میں وہ شرک ہوجاتا تو یہ چیزیں وہاں سے چلیں۔ ورنہ دور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں کہیں اس کا وجود نہیں کہ کہیں دسواں اور چالیسواں ہے۔ اسی طرح تابعین کے زمانہ میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ آئمہ مجتہدین میں کہیں اس کا ذکر نہیں اسی طرح فقہ میں نہیں۔ البتہ فقہ میں رد موجود ہے کہ یہ غلط اور یہ غلط۔

دین اور رواج کا امتیاز..... بس ایک رواج چلا آرہا ہے۔ تو رواج کا نام دین نہیں۔ دین تو رواجوں کو مٹانے کے لئے آتا ہے تاکہ خدائی رواج قائم ہو۔ خدائی قانون قائم ہو۔ اس واسطے جب بھی کوئی عمل کیا جائے تو دیکھا جائے کہ کتاب اللہ میں ہے یا نہیں؟ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے یا نہیں؟ سنت صحابہؓ میں اس کا وجود ہے یا نہیں؟

اگر معلوم ہو جائے تو آدمی سرآنکھوں پر کرے اور اگر نہ نکلے تو پھر اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ اور اگر نہیں ہے۔ مگر غیروں کے اندر ہے اور عمل کریں تو ان سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کو پوری طرح سے ترک کر دینا چاہئے۔ ورنہ وہ مسلم اقوام کا مزاج بدل دے گا۔ جو ان کا موحدانہ مزاج ہے اور اسلام نے توحید کا مزاج بنایا ہے۔

حاصل کلام...... غرض دو باتیں میں نے عرض کیں، ایک یہ ہے کہ کسی مسئلہ کو شریعت نے مطلق چھوڑ دیا ہو اور اپنی طرف سے قید لگانا یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کون ہیں کہ خواہ مخواہ اس کو مقید کریں؟

لیکن اگر آپ کوئی دن اپنی مصلحت سے مقید کر رہے ہیں کہ مجھے آج کے دن سہولت ہے اور آپ اس کی تبلیغ نہیں کرتے۔ اپنی سہولت دیکھتے ہیں تو کر لیں لیکن یہ بھی جائز سمجھتے ہوں کہ اگر اس کے کوئی خلاف کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ اس میں یہ ہوگا کہ اگر کسی قوم نے اس کو لازم سمجھ رکھا ہے تو احتیاطاً آپ کو رکنا پڑے گا کہ اس وقت یہ فعل آپ کے واسطے موضع تہمت ہو جائے گا۔ اس لئے آپ کو اس سے بچ جانا چاہئے۔

اور اس کے بچنے میں کوئی دشواری نہیں۔ اور بچنے سے آدمی جب رکے کہ اس دن تو ثواب پہنچتا ہے پھر نہیں پہنچے گا۔ جب ثواب اب بھی پہنچتا ہے اور چار دن بعد بھی پہنچتا ہے تو ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ اپنے اوپر ایک بلا لی جائے اور اپنے سر پر تہمت رکھی جائے۔

دوسری بات یہ کہ فاتحہ کے معنی اگر ایصالِ ثواب کے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ ہونا چاہئے۔ حدیث میں میت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے جیسے دریا میں ڈوبتا ہوا آدمی کہ تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے وہ آس کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ میرا کوئی عزیز مجھے ثواب پہنچاتا ہے یا نہیں؟ تو آپ کو اس کی آس پوری کرنی چاہئے۔ اس کو ثواب پہنچانا چاہئے۔

ایصالِ ثواب کا تعلق نیت سے ہے...... ایصالِ ثواب کا تعلق قلب سے ہے۔ آپ نیت کریں گے تو ثواب پہنچ جائے گا۔ اگر آپ اس ثواب پہنچانے میں چند قیدیں لگائیں کہ کھانا یوں رکھا جائے اور اس پر یوں پڑھا جائے۔ بعض سہاگنیں جمع ہوں جن کے اب تک بچہ نہ ہوا ہو اور وہ ایک ایک یا سات سات چاول کے دانے اٹھائیں۔ یہ محض رسوم ہیں۔ شریعت کے اندر ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ غرض ایصالِ ثواب کا تعلق قلب کی نیت سے ہے۔ آپ نے نیت کی، کھانا پکا کے بانٹ دیا۔ فقیر سے بھی یوں نہ کہا کہ میں کیوں کھلا رہا ہوں؟

بس قلب کی نیت یہ ہے کہ ثواب پہنچے، بس پہنچ جائے گا۔ یہ جو قید لگائی گئی ہے کہ جب تک مسجد کا ملانہ آئے گا ثواب نہیں پہنچے گا۔ یہ سب کھانے پینے کی باتیں ہیں۔ مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ ثواب پہنچانا ہے اور یہ صدقہ ہے۔ اسی واسطے مستحقین کو کھلائے۔ یہ جو ساری برادری کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو کھلا دیا یہ تو وہی رکی بات ہوگئی۔ ثواب سے اس کا کیا تعلق ہوگا وہ تو کھانے کے ساتھ ثواب کو بھی کھا کر چلے جائیں گے۔ میت غریب کے لئے کچھ بھی نہ رہے گا۔ میت کو جب پہنچے گا جب آپ مستحق کو صدقہ دیں۔

ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ......اس واسطے اگر دعوت کرنی ہے، شوق سے کیجئے اور آپ ہر روز دعوت کیا کیجئے۔ آپ کے عزیز ہیں، اقربا ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے۔ جتنی چاہیں آپ دعوتیں کریں۔ دس، بیس سوسو کو جمع کریں۔ مگر ثواب پہنچانے کی عبادت کو کیوں آپ گڑ بڑ کرتے ہیں کہ اس میں خلط ملط کریں۔ کچھ مستحق کچھ غیر مستحق کچھ امراء کچھ غرباء۔ معلوم ہوتا ہے دل کے اندر کچھ نمود کا جذبہ ہے۔ برادری کی اٹک ہے کہ نہیں کریں گے تو برادری میں ناک کٹ جائے گی، تو جس میں ناک کٹنے کا خوف ہو وہ عبادت ہوتی ہے؟

ناک کٹنے کا خوف ہو تو وہ مخلوق کی اطاعت ہوگئی۔ نہیں کریں گے تو برادری والے نام رکھیں گے۔ تو نماز، روزہ اور صدقہ نام رکھنے اور ناک کٹنے کے خوف سے تھوڑا ہی کیا جاتا ہے، تو آدمی عبادت بھی کرے اور اس کو کر کے کھو دے، تو اس کے کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ صحیح طریق سے کیجئے۔

تو یہ کہنا کہ یہ علماء دیو بند منع کرتے ہیں تو وہ ایصالِ ثواب سے منع نہیں کرتے ان رسموں سے منع کرتے ہیں۔ تو یہ اشتعال دلانا ہے اور یوں نہیں کہتے کہ: علماء دیو بند ایصالِ ثواب کو جائز بلکہ ضروری کہتے ہیں مگر جو رسوم باندھ رکھی ہیں، ان سے روکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں ان کے کھانے پینے کا نقصان ہے۔ تو یوں کہتے ہیں کہ یہ مطلق ثواب سے روکتے ہیں تاکہ عوام میں اشتعال پیدا ہو۔ ایصالِ ثواب جیسی مطلق چیز کو تم مقید کرتے ہو تو اس تقیید کو روکتے ہیں کہ تم کو اس کے مقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جس کو خدا تعالیٰ نے عام کر رکھا ہے اس کو عام رکھنا پڑے گا جس کو وہ خاص کر دے اس کو خاص رکھنا پڑے گا۔ ہم عیاذاً باللہ شارع نہیں ہیں کہ شریعت وضع کریں۔ شریعت وضع کرنے والا اللہ ہے اور اس کو پہنچانے والے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس کے بعد کسی کو شریعت کے وضع کرنے کا حق نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں یا آئمہ مجتہدین بھی اس شریعت میں سے مسائل نکال سکتے ہیں۔ لیکن مستقل شریعت وضع کر دیں یہ کسی کا حق نہیں۔

علم غیب کا تنازع......سوال: علماء دیو بند سرکارِ دو عالم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں، دیوانوں اور جانوروں کے مشابہہ کہتے ہیں؟ العیاذ باللہ، العیاذ باللہ اور معاذ اللہ شیطان کے علوم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے زیادہ بتاتے ہیں۔

جواب: یہ بھی بالکل افتراء اور بالکل کذب ہے۔ یہ دعویٰ اصل میں وہی لوگ کرتے ہیں جو علماء دیو بند کو الزام دے رہے ہیں۔ اور یہ قصہ یہاں سے چلا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سارا علم حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ علم غیب کلی اور جزئی جزئی کا وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کو ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: میرا اور میرے ساتھ ساری مخلوق کا علم ملا کر اللہ کے علم کے سامنے ایسا ہے کہ جیسے ایک بے پید سمندر پر ایک چڑیا آئے اور اس میں چونچ لگائے۔ اس کی چونچ کو جو تری لگ جاتی ہے تو اس تری کو سمندر سے کوئی نسبت نہیں۔ ساری مخلوقات کا علم مل کر اللہ کے علم سے وہ نسبت رکھتا ہے جو چڑیا کی چونچ کی تری کو سمندر

سے ہے۔ تو حضور علیہ السلام تو یہ فرمائیں اور ہم دعویٰ یہ کریں کہ جتنا اللہ تعالیٰ کو علم ہے وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ عقلاً بھی خلاف ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات بھی لامحدود اور صفات بھی لامحدود صفات کا مذہ میں سے علم بھی ہے۔ تو علم بھی اس کا لامحدود، اس کی کوئی حدونہایت نہیں۔ بندہ خود محدود، عمر محدود، ذات محدود، صفات محدود اور قوتیں محدود، تو لامحدود چیز، محدود چیز میں کس طرح سا سکتی ہے؟ تو شرعاً میں نے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک پیش کیا اور عقلاً بھی یہ محال ہے تو عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے۔

علماء دیوبند کا عقیدہ..... علماء دیوبند کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حق تعالیٰ نے علم دیا ہے ساری کائنات میں سے وہ علم کسی کو نہیں دیا۔ نہ اتنا زیادہ کسی کو ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم الخلائق ہیں۔ تمام ملائکہ کو بھی وہ علم نہیں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ تو کائنات میں سب سے زیادہ علم والی ذات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ یہ دعویٰ ہے کہ ایک تو اعلم الخلائق ہونا ہے کہ ساری مخلوق سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم ہیں اور ایک اللہ کے برابر ہونا۔ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

مخلوق، خالق کی کسی صفت میں اللہ کے برابر ہو جائے۔ یہ عقلاً بھی محال ہے اور نقلاً بھی اور ایک یہ کہ مخلوقات میں سے سے زیادہ افضل ہونا۔ تو وہ ذات ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ غرض مسئلہ یہاں سے چلا کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب کلی حاصل ہے۔

علماء بریلی کے دعویٰ کا تجزیہ..... اس کے بارے میں بعض بزرگان دیوبند نے لکھا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ ''علم کلی حاصل ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

اگر علم کلی کا یہ مطلب ہے کہ ساری کی ساری جزئیات اور کلیات حاصل ہیں۔ یہ عقلاً بھی اور نقلاً بھی غلط۔ خود حدیث کے بھی خلاف۔ قرآن کریم کے بھی خلاف۔ اور اگر یوں کہتے ہیں اور آپ کا مطلب یہ ہے کہ کل میں سے بعض علم حضور علیہ السلام کو حاصل ہے تو وہ بعض کچھ کو اور بعض کچھ اوروں کو بھی حاصل ہے۔ تھوڑا بہت علم اللہ نے ہر انسان کو دیا ہے۔ تھوڑا بہت علم ہر فرشتے کو دیا۔ تھوڑا بہت علم جنات کو بھی دیا۔ پھر اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کیا رہی؟

تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ اگر تمہارے دعوے کا یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط۔ یہ مطلب علمائے دیوبند کا تھوڑا ہی ہے یہ تو خود بریلوی حضرات کا مطلب ہے جن کو ہم رد کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے سر پر تھوپ دیا کہ تم یوں کہتے ہو کہ معاذ اللہ جانوروں کے برابر علم ہے۔

اور جنات کے برابر علم ہے ''عیاذاً باللہ، عیاذاً باللہ، نقل کفر، کفر نہ باشد۔ شیطان کے برابر علم ہے۔ تو یوں کہا گیا ہے کہ: اگر تم علم کے معنی یہ سمجھتے ہو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہر جانور کو بھی علم ہے۔ ہر فرشتے کو بھی علم ہے۔ جنات کو بھی یہ علم ہے۔ اس میں فضیلت کیا رہی؟

غرض تمہارے مطلب کی دو شاخیں بیان کر کے اسے رد کیا جا رہا ہے۔ نہ کہ اپنے مطلب کا کوئی دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ تھوپ دیا ہمارے سر کہ تم یہ دعویٰ کر رہے ہو۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ ہم سے یوں کہیں کہ صاحب! فلاں آدمی آیا ہے اور وہ یوں کہتا ہے کہ فلاں جگہ وبا پھیل گئی ہے خدانخواستہ کوئی باقی نہ رہا۔

تو ہم اس کو کہیں گے کہ بھائی! "سوچ لو کہ کوئی باقی نہیں رہنے کا کیا مطلب ہے" آیا یہ مطلب ہے کہ ایک بھی باقی نہیں۔ یہ تو بظاہر خلاف بات ہے کل کے اخبار میں آ چکا کہ بہت سارے زندہ ہیں اور اگر یوں کہو کہ بعض آدمی انتقال کر گئے تو کون سا شہر ایسا ہے جس میں روز بعض لوگ انتقال نہیں کرتے۔ تو یہ جو ہم نے الزام قائم کیا یہ آپ کے دعویٰ پر ہم نے قائم کیا۔ ہم نے تو کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ تو مطلب تو آپ کے دعویٰ کا بیان کیا جا رہا ہے اور آپ ہمارے سر تھوپ رہے ہیں کہ تمہارا یہ مطلب ہے۔ ہمیں اس مطلب سے کیا تعلق؟

علمائے دیوبند کا دعویٰ...... ہم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوقات سے زیادہ علم دیا گیا ہے نہ اتنا علم انبیاء علیہم السلام کو ہے نہ اولیاء کو ہے، نہ فرشتوں کو ہے۔ لیکن اللہ کے علم کے سامنے وہ جز ہے۔ کل علم تو فقط اللہ کو ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اس کا ایک جز اور ایک شمہ ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو جو علم دیا گیا ہے وہ بھی ایک جز ہے تو اس فرق کو سمجھ لیجئے کہ ایک ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساری کائنات سے بڑھ کر عالم ہونا اور ایک ہے حضور علیہ السلام کے علم کا اللہ کے علم کے برابر ہونا۔ یہ برابر تب ہوگا جب ذات برابر ہو، صفات برابر ہوں، حواس برابر ہوں۔ جب کہیں برابری نہیں ہے تو صفات میں کیسے برابری ہوگی۔؟ صفات میں سے علم بھی ہے تو علم میں برابری کیسے ہوگی؟

یہ ناممکن اور محال ہے۔ خود قرآن کریم بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہا ہے۔ حدیث بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہی ہے۔ تو یہ عجیب چیز ہے کہ ان کے دعوی کے مطلب کی ایک شق کو بیان کیا جائے۔ اور وہ اس کو ہمارے سر تھوپیں۔ بھائی! تمہارا یہ دعویٰ تھا اور اس کی وضاحتیں تھیں۔ تم دونوں کا انکار کر دو۔ بس ٹھیک ہے۔ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام "اعلم الخلائق ہیں" باقی تمام مخلوقات کا علم مل ملا کر ایسا بھی نہیں ہے جیسے سمندر کے سامنے چڑیا کی چونچ کی تری ہوتی ہے۔ لیکن یہی نسبت حضور علیہ السلام کے علم کو اللہ کے علم کے ساتھ ہے۔

نماز کے بعد مصافحہ...... سوال: نماز کے بعد مصافحہ کو منع کرتے ہیں؟ جواب: نماز کے بعد مصافحہ کو واجب کس نے کیا ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ کسی جائز چیز کو اگر آپ واجب سمجھیں گے تو منع نہیں کیا جائے گا تو اور کیا جائے گا۔ نماز کے بعد مصافحہ کرنا نماز کی سنتوں میں داخل نہیں، سنن وضو میں داخل نہیں، سنن دعا میں داخل نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں فرماتے تھے، صحابہ کرامؓ نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے کوئی لازمی چیز نہیں اتفاقاً کر لیا تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ کبھی عقیدت و محبت میں کر لیا تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو نہ کرے اس کو آپ ملامت کریں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے واجب جانتے ہیں۔ تو جو چیز واجب نہ ہو آپ اسے واجب جان کر کرنے لگیں تو رد کا

نہیں جائے گا تو اور کیا کیا جائے گا؟

تو یہ ساری باتیں وہی تو ہیں کہ جس چیز کو اللہ جائز قرار دیں اسے جائز رکھو۔ جسے واجب قرار دیں اسے واجب رکھو۔ جسے حرام قرار دیں اسے حرام رکھو۔ واجب کو جائز بنا دے اور جائز کو واجب بنا دے۔ اس کا آپ کو حق نہیں۔ مصافحہ کرنا جائز ہے۔ لیکن نہ کرنا بھی جائز ہے جائز کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب کرو جب بھی مضائقہ نہیں۔ نہ کرو تب بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی کرنے پر زور دینے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے واجب جانتا ہے۔ تو اس کو روکا جائے گا اگر نہ کرنے پر زور دینے لگے تو اسے بھی روکا جائے گا۔ کیونکہ اسے ترک پر زور دینے کا حق نہیں، اللہ نے برابر رکھا ہے۔ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں نہ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ روکنا فرض بنا کر کرنے سے ہے اور سنن نماز سمجھ کر کرنے سے روکتے ہیں۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم نے مصافحہ کو رواج سمجھ لیا ہے اور جہاں کسی نے رواج سے روکا وہ کافر۔ تکفیر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ضروریات دین کا جو انکار کرے وہ کافر ہے۔ تمہارے مصافحہ کو روک دیا وہ کافر، کھانا پکانے کو روک دیا وہ کافر۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کس مصلحت سے روکا ہے۔ کون سی حد بندی کے لئے روکا، اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تکفیر کرنا یہ آپ کے لئے بھی جائز نہیں۔

نماز کے بعد دعاءِ ثانیہ..... سوال: نماز کے بعد دعاءِ ثانیہ کو منع کرتے ہیں۔ جواب: دعاءِ ثانیہ کے لازم ہونے کو منع کرتے ہیں۔ جائز ہونے کو تو منع نہیں کرتے۔ دعاءِ ثانیہ اگر اتفاق سے کوئی کرے اور ثانی کیا چیز ہے۔ کوئی دس دفعہ کر لے، چار دفعہ کر لے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس کو اس طور پر لازم مقرر دے کہ جو نہ کرے تو اسے کہے کہ یہ غلط آدمی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے لازم سمجھتے ہیں۔ تو یہ لازم تو نہیں۔ غرض جواز ہے لزوم نہیں۔ جواز کو منع نہیں کیا جاتا لزوم کو منع کیا جاتا ہے۔ (وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ خوزہ، ۸/۵/۱۲ ا ھجری)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ شخصیت و کردار میری سعادت..... حضرت الاستاذ علامہ شبیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کی سوانح کے سلسلہ میں محترم عاشق عمر صاحب عباسی کا امر ہے کہ میں بھی سوانح نگاروں کی فہرست میں نام درج کرالوں، تعمیل امر سعادت ہے۔ لیکن حضرت علامہ کے مناقب کی فہرست اتنی طولانی ہے کہ ہم جیسے ناقص المعلومات کی چند سطریں اس کے چند عنوانات کا بھی حق ادا نہیں کر سکتیں۔ تاہم یہ کیا کم سعادت ہے کہ ان کے سوانح نگاروں کی فہرست میں میرا نام ہی آ جائے۔ گو چند نا تمام سطریں ہی لکھ کر ہو جن میں کوئی خاص ترتیب یا مضمون نگارانہ تشکیل نہیں۔ قلم برداشتہ ذکر محاسن کے طور پر جو بات بے ساختہ ذہن میں آئی اور بات سے بات کی طرف ذہن منتقل ہوا، اسے سپرد کاغذ کر دیا ہے۔ بس یہ سوانح یا سوانح کا عرفی نہیں۔ محض ایک تذکرہ ہے جس سے اپنی اور ناظرین کی تسلی اور تنشیط مقصود ہے۔ (واللہ الموفق)

ذوقِ علم کا رنگ..... حضرت علامہ میرے استاذ تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مولانا اپنی جامعیت علوم کے ساتھ خصوصیت سے علوم عقلیہ سے طبعی دلچسپی رکھتے تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ: اگر میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ، کی تصانیف نہ دیکھ لیتا تو نہ معلوم اعتزال کے کس گڑھے میں پڑا ہوا ہوتا۔ لیکن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم نے مجھے سنبھالا علوم عقلیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، حکمت قاسمیہ کے مطالعہ نے معقولات ایمانی کا راستہ دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا میں متکلمانہ رنگ کا غلبہ ہو گیا۔ اسی لئے اسلام کے اصول وکلیات سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور اس موضوع پر ان کا کلام نہایت بسیط اور محققانہ ہوتا تھا۔ ابتداء میں معقولات کی کتابیں، حمد اللہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے۔ مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے اور صرف کتاب وسنت اور فنون دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قرآن شریف کے تفسیری فوائد لطیف وشیریں زبان اور شگفتہ طرز ادا کے ساتھ ان کی قلمی کاوشوں کا شاہکار اور صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم آپ کی علمی محنتوں کا نچوڑ ہے۔ اس تفسیر وحدیث کی خدمت کے سلسلہ میں بہت سے اہم مسائل کو سہل عنوانات کے ساتھ حل فرما گئے ہیں۔ جس سے حضرت ممدوح کے علم کا اندازہ ہوتا ہے۔

تقریر وبیان کا رنگ..... تقریر وبیان آپ کا خاص حصہ تھا۔ قوت استدلال نہایت مضبوط اور مستحکم تھی، معمولی سی بات کو اس خوبصورتی اور قوت سے ادا کرتے تھے کہ وہ ایک اہم مگر حل شدہ مسئلہ نظر آنے لگتی تھی اور اس کے تمام پہلو متانت کے ساتھ صاف ہو جاتے تھے۔ تحریر کا ایک خاص رنگ تھا جس میں نہ زمانہ حال کی بے قید شوخی تھی نہ قدیم طرز کی کہنگی، حال کی فصاحت اور ماضی کی متانت سے ملا جلا رنگ تھا، جو آپ کی تحریر کا نمایاں پہلو تھا۔ بلاغت کلام، کلام پر برستی تھی جو ہر طبقہ کے جذبات کو اچھال کرتی تھی۔

طرزِ تدریس..... درس میں مضامین کو جامعیت اور استقصاء کے ساتھ ادا کرتے تھے، کلام میں بسط ہوتا تھا مگر غیر مہمل۔ ایک مسئلہ کو اس کے تمام شقوق وجوانب کے ساتھ کھولنے اور صاف کرنے کی روش تھی۔ اس لئے درس میں کمیت پر نہیں، کیفیت پر نظر رہتی تھی سبق خواہ تھوڑا ہو مگر تمام ہوا سی لئے درس وتدریس کے سلسلے میں وقت کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے، تنقیح مسئلہ اور اس میں تدبر وتفکر پر وقت زیادہ صرف ہوتا تھا مگر اسباق کا یہ تخلل اس لئے گراں نہ ہوتا تھا کہ ایک ہی دن کے درس میں کئی طور پر کئی دنوں کے درس کا مواد فراہم ہو جاتا اور کسر نکل جاتی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم کے دوران حضرت والد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے خود ہی فرمائش کی کہ اسے معقولات میں پڑھاؤں گا اور مجھے فرمادیا کہ: منطق تجھے میں پڑھاؤں گا چناں چہ خصوصیت صغریٰ کبریٰ شروع کرائی اور مرقات تک پہنچے، گو یہ کتابیں بیچ میں رہ گئیں۔ لیکن جس قدر پڑھایا اتنے ہی سے فن سے کافی مناسبت پیدا ہوگئی کیونکہ ان کی ابحاث کا نقطۂ نظر کتاب تمرین ہوتی تھی بلکہ فن ہوتا تھا اور طلبہ کی حسب استعداد فن سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔

احقر جب کہ متوسط کتابیں ہدایہ، جلالین وغیرہ پڑھتا تھا تو میں نے خود فرمائش کی کہ ترجمہ قرآن شریف پڑھا

دیکھئے۔ دوسرے طلبہ بھی بکثرت شائق اور منتظر ہیں۔ فرمایا کہ اول اول تو طلبہ شوق میں نام لکھا دیتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے آخر کار جماعت صفر کے درجہ میں رہ جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ: کم از کم مجھ پر تو اطمینان فرمایئے۔ نہ میں ناغہ کروں گا نہ بدشوقی دکھلاؤں گا، مگر آپ بھی پابندی فرماویں، وعدہ فرمالیا اور بڑی شفقت سے قرآن شریف کا درس شروع کرا دیا۔ ابتداء میں سو، سوا سو طلبہ کا جمگھٹا جمع ہو گیا، مگر آخر کار وہی ہوا کہ طلبہ گھٹنے شروع ہوئے اور آخر میں میں تنہا رہ گیا، قدرتی طور پر مولانا کی تدریسی امنگ بھی کم ہو گئی اور ناغے بکثرت ہونے لگے۔ مگر میں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ اس گھنٹہ میں مولانا جہاں بھی ہوتے وہیں پہنچ جاتا، خواہ مکان پر یا دفتر میں یا کتب خانہ مدرسہ میں اور وہ گھنٹہ میں ان کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے گزار دیتا تھا، کبھی پڑھا دیتے کبھی عذر فرما دیتے مگر میں یہ وقت ان کے پاس پورا ہی کر دیتا۔ آخر کار ایک دن فرمایا کہ بھائی میں ہار گیا اور تو جیت گیا، تو نے اپنی بات پوری کر دکھائی۔

کمالِ اخلاق...... اخلاقی طور پر ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں یکسانی تھی۔ وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا ان کے خلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن خوش اور اگر ناخوش ہیں تو اعلانیہ اس کا اظہار ان کے چہرہ بشرہ سے ہو جاتا تھا اور کہہ بھی دیتے تھے دار العلوم کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دار العلوم (جو ان کے بڑے بھائی بھی تھے) کچھ رنجش ہو جاتی تو اکثر روٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے انہیں منانے اور راضی کرنے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا کیونکہ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ خفا ہو کر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کر کے لے آیا۔ ایک دفعہ ناخوش ہو کر گھر بیٹھے رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کر دیا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مجھے فرمایا کہ: تو ہی جا کر لا سکتا ہے۔ میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہو گئے اور دار العلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آ جاتی تھی تو اسی لحہ گرانی رفع ہو کر حقیقۃً بشاشت چہرہ پر نمودار ہو جاتی اور ایسے خوش اور منشرح ہو جاتے کہ گویا کوئی گرانی ہی نہیں۔ ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور بے تکلف نہیں بلکہ بلا تصنع و بناوٹ اس کی قلبی رفتار ہی یہ ہو۔

حق تعالیٰ نے علم و فضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی بار ہا دیکھا کہ ان کے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجہ سے کوئی بات کہی تو اف بھی نہ کرتے تھے، اگر بات ان کے نزدیک قابل تسلیم بھی نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت فرماتے۔

حق پسندی...... قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے خواہ وہ اپنی ہی کوئی کمزوری ہو۔ ایک بار ناخوش ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ میں حسب معمول منانے کے لئے گیا تو غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ: بھائی نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے، جو

اس طرح سے مجھ سے قطع نظر کر لی تو سن لو کہ اس قطع نظر کہنے پر میرے دل میں دو قسم کے جذبے پیدا ہوئے ایک جذبہ للّٰہیت سے اور ایک نفسانیت سے۔ نفسانیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے تو میں انہیں اپنی زندگی باور کراؤں؟ اور اس کا یہ اور یہ طریقہ ہوتا جو انہیں میری زندگی سمجھوا دیتا۔ دوسرا جذبہ للّٰہیت سے پیدا ہوا اور وہ یہ کہ میں دیو بند سے کہیں باہر جا کر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف سے کچھ بھی ہوتا رہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اٹھانی پڑے گی۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے؟ فرمایا للّٰہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا کہ الحمد للہ مگر میں نے کہا کہ حضرت آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر بھی تو دھیان فرمایئے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کر دیا جانا مناسب ہوگا جب کہ کاموں کا دارومدار آپ ہی جیسے حضرات کے اوپر ہے اسی طرح کل کو جماعت کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے اس میں پیش آ جاتی ہیں یہی فیصلے کر لیں کہ ہم کو کام چھوڑ دینا چاہئے تو فرمایئے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا؟ اور اسے کون سنبھالے گا؟ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟

بس اتنا سن کر ایک دم چہرے پر بشاشت آ گئی اور فرمایا: ہاں یہ تو نے صحیح کہا، بس! میں نے اب یہ دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا اور کل سے دارالعلوم پہنچ کر کام کروں گا، چنانچہ علی الصبح حسب وعدہ تشریف لائے اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی۔ یہ درحقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانی، قلب کی صفائی اور حقیقت پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔

اندازِ تحریر..... بہرحال علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے ان کی بڑائی دلوں میں بٹھا دی تھی، قلبی طور پر استغناء اور نازکی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا۔ کام کے سلسلہ میں جب تک کہ دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی، متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ کتب بینی اور مطالعہ کا شغف بہت زیادہ تھا خود بھی کبھی کبھی فرماتے تھے کہ کیا کام کروں میں تو کتابوں کا کیڑا بن کر رہ گیا ہوں۔ پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ تفسیری فوائد اور شرح مسلم جیسے دو اہم اور عظیم الشان کام یادگار زمانہ چھوڑے ہیں۔ اسکے علاوہ بھی اعلیٰ ترین تصانیف، العقل والنقل، الاسلام، الشہاب الثاقب، صدائے ایمان، اعجاز القرآن، اور دوسرے مفید ترین رسائل و مسائل پر قلم زنی فرمائی اور حق یہ ہے کہ بیانِ مسائل کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت علامہ الاستاذ الکشمیری نور اللہ مرقدہ انہیں اس لحاظ سے لسان الغیب فرمایا کرتے تھے۔

ذکاوت و ذہانت طبعی تھی، فہم تیز اور طبیعت سادہ تھی۔ علم کی بنیاد فہم ہی ہے جب اسے کتاب و سنت میں

استعمال کیا گیا تو علم کا دوچند ہو جانا قدرتی امر تھا۔ تحریر کی شگفتگی مسلم تھی، ایک ہی مضمون کئی آدمی لکھتے اور اسی کو وہ قلم بند فرماتے تو سب پر ان کی تحریر کی شگفتگی نمایاں رہتی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے مالٹا سے واپسی کے بعد ترکِ موالات کا استفتاء کیا گیا۔ حضرت نے اپنے تین ارشد تلامذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہم کے سپرد کیا کہ فتویٰ یہ حضرات مرتب کریں اور غایت احتیاط و تدین سے فرمایا کہ انگریزوں کے بارے میں مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ مجھ پر ان کے بغض و عداوت کا غلبہ ہے ہو سکتا ہے کہ فتویٰ میں جذبات کا رنگ آ جائے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ﴿وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی﴾ ① ''تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے کام نہ لو، انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے''۔

اس لئے اس استفتاء کا جواب آپ تینوں حضرات لکھیں۔ چنانچہ تینوں حضرات نے قلم بند فرمایا اور حضرت نے تینوں کے جوابات ملاحظہ فرما کر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے جواب کے بارے میں فرمایا کہ جواب تو ماشاء اللہ سب ہی بہتر اور جامع ہیں، لیکن بھائی میں اگر لکھتا تو وہ اس کے قریب ہوتا جو شبیر نے لکھا ہے۔ بہر حال ان کی تحریر کی جامعیت شگفتگی اور بلاغت کو خود ان کے اکابر بھی مانتے تھے اور اس کی کافی داد دیتے تھے۔

نظم و شعر...... مولانا نظم اور شعر و شاعری سے بھی عاری نہ تھے، گو اس کا ذوق نہ تھا، چند مواقع ایسے بھی پیش آئے کہ جذبات دلی کی ترجمانی آپ نے نظم میں فرمائی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر ''نالۂ دل'' کے نام پر ایک نظم لکھی جو بہت پسند کی گئی اور ایک بار میرے متعلق ایک نظم قلم بند فرمائی جس کا واقعہ یہ ہوا کہ میرا رشتہ رام پور میں مولوی محمود صاحب مرحوم رام پوری کے یہاں ہو چکا تھا، نکاح ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ یہ میری اہلیہ جے پور اپنے تایا کے پاس گئی ہوئی تھی اور شدید علیل ہوئی، حالت نازک دیکھ کر غلطی، یا غلط فہمی سے وہاں سے انتقال کا تار دے دیا جس سے یہاں دیوبند میں صف ماتم بچھ گئی، تیسرے دن تار پہنچا کہ وہ انتقال کا تار غلط تھا۔

اس پر بساط شادی بچھ گئی اور تہنیتی جلسے گھروں میں اور مدرسہ میں ہونے شروع ہو گئے۔ تقریباً پندرہ بیس دن تک جلسہ ہائے شیرینی و تہنیت کا سلسلہ قائم رہا۔ ان مجالس میں مختلف حضرات کی طرف سے مبارک بادی کی نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے بھی ایک جلسہ میں نہایت بلیغ نظم لکھی اور سنائی، جس کا واقعاتی شعر یہ تھا:

غلط ایک تار برقی پہنچی تھی جے پور سے، جس نے ۔۔۔ جلایا خرمن مقصود کو برق تپاں ہو کر

اسی طرح کبھی کبھی کسی خاص محرک کے ماتحت نظم بھی کہہ لیتے تھے، مگر یہ چیز ذوق کے درجہ میں نہ تھی صرف ضرورت کے درجہ میں تھی اور طبیعت اس سے عاری اور عاجز نہ تھی۔ بہر حال حضرت علامہ کی ہستی تقریر، تحریر، نظم و نثر

① پارہ: ۶ سورۃ المائدۃ، رکوع: ۳۔

اور علم و فضل کی ایک مجسم تصویر تھی، جس کے اٹھ جانے کے بعد یہ مخصوص کمالات بھی گویا اٹھ گئے۔ یوں حق تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے اور وہ شخصیتیں پیدا فرماتا رہے گا جو اس کے دین اور اس کے نبی کے علم کو سنبھالتے اور تازہ کرتے رہیں گے لیکن جن کے سامنے علم و فضل کی ہستیاں اٹھتی ہیں ان کی نگاہوں میں تو اندھیرا ہو جاتا ہے اور وہ جس قسم کے فضل و کمال سے مانوس اور مالوف ہوتے ہیں اس کے اٹھنے سے یہ پسماندہ بالیقین یتیم رہ جاتے ہیں۔

سیاسی خدمات...... آخر میں سیاسی راہوں پر ان سے جو مہم کام انجام پائے یہ بھی فی الحقیقت ان کی زندگی کا ایک شاہکار تھا۔ یہ بات تو الگ ہے کہ ان کی رائے سے بہت سے اکابر کو اختلاف تھا۔ اختلاف رائے اپنی جگہ پر ہے اور اس میں ہر شخص اپنی حجت سے مجبور ہے لیکن عزم و عمل کی جو طاقتیں مولانا ممدوح سے پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد ظاہر ہوئیں دوسرے انہیں خلاف توقع سمجھتے تھے مگر حق تعالیٰ نے یہ حصہ ان کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے پاکستان بننے کے بعد دین اور علماء دین کو کافی سنبھالا۔ قدرت نے تنہا انہیں وہاں کی مرکزی شخصیت بنا دیا اور ان سے وہ کام لیا جو مرکزی شخصیتوں سے لیا جاتا رہا ہے، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو وہاں کے کاموں کی نوعیت اور ہوتی۔ یہاں کے لوگ ان کی رائے سے تو اختلاف رکھتے مگر ان کے جذبات اور صدق و خلوص کی قدر بھی کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر اختلاف رائے کے حیلہ سے حضرت ممدوح وہاں نہ پہنچتے تو دین کا جو کام ہوا بظاہر اسباب وہ نہ ہو سکتا۔

خراجِ تحسین......غرض مجموعی حیثیت سے حضرت علامہ کی شخصیت ایک ممتاز ترین شخصیت تھی جس کے علم و فضل کا سکہ ملک بھر نے مانا ہوا تھا۔ اور بیرونی ممالک میں بھی اس کا شہرہ پہنچا ہوا تھا جس کے سامنے اہل علم و فضل سر جھکانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔

ان کے تفسیری فوائد کا حکومت افغانستان کی طرف سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا جانا اور ان فوائد کا انتخاب عمل میں آنا درحقیقت ان کے فضل و کمال کے سامنے جھک جانا تھا، فتح الملہم کو علامہ زاہد کوثری مشہور فاضل مصر کا خراج تحسین ادا کرنا ہی ان کے فضل و کمال کا اعتراف تھا۔ بہر حال جہاں جہاں بھی ان کے فضل و کمال کا کوئی اثر پہنچا وہیں اعتراف و تسلیم کا شیوہ بھی اختیار کیا گیا۔ اس طرح حضرت مولانا کی شخصیت صرف ہندوستان ہی کے لئے مایۂ ناز نہ تھی بلکہ دنیائے اسلام کے لئے سرمایۂ ناز تھی۔

تعمیل حکم......اگر اس طرح سے قلم چلاتا ہوا چلا جاؤں جس طرح سے وہ بے ساختہ چل رہا ہے اور اس مجلس میں چند سطور سپرد قلم ہو گئیں تو ممکن ہے کہ قلم چلتا ہی رہے اور بات پر بات یاد آتی چلی جائے مگر سوئے اتفاق سے وقت ختم ہو گیا۔ میں بہار کے سفر کے لئے پا بہ رکاب ہوں، ریل کا وقت آ گیا اس لئے قلم کو روک دینا پڑا، اگر قلم چلتا ہی رہتا جب بھی مناقب کی طولانی فہرست پوری نہ ہو سکتی اور اسے رک جانا پڑتا۔ اس لئے اگر رک بھی گیا تو مضائقہ نہیں، تکمیل فہرست نہ جب ہوتی نہ اب، اس لئے یہ سطور بے ساختگی کے ساتھ حافظہ سے باہر آ گئیں اور محترم

عاشق صاحب کے حکم کی تعمیل ہوگئی اور میں بھی اس حیلہ سے مولاناؒ کے سوانح نگاروں کی فہرست میں شامل ہوگیا، جو میرے فخر کے لئے کافی ہے۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ ترجمہ: "اے رب ہمارے، مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے"۔ (آمین)